مجتبیٰ حسین کے سفرنامے

مرتّب

حسن چشتی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مجتبیٰ حسین

۱۵ر جولائی ۱۹۳۶ء کو ضلع گلبرگہ (کرناٹک) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے بی اے کیا۔ پھر روزنامہ "سیاست" حیدرآباد دکن سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں اسی اخبار میں مزاحیہ کالم نگاری شروع کی۔ ۱۹۷۲ء میں حیدرآباد سے دہلی منتقل ہوئے اور نیشنل کاؤنسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ سے وابستہ ہوئے جہاں سے ۱۹۹۱ء میں بحیثیت ایڈیٹر وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ جاپان، برطانیہ، فرانس، امریکہ، کینیڈا، روس، ازبکستان، پاکستان، سعودی عرب، سلطنت عمان اور متحدہ عرب امارات کی سیاحت کر چکے ہیں۔

تصانیف:

تکلف برطرف ۱۹۶۸ء — قطع کلام ۱۹۶۹ء — قصہ مختصر ۱۹۷۲ء — بہرحال ۱۹۷۴ء
آدمی نامہ ۱۹۸۱ء — بالآخر ۱۹۸۲ء — جاپان چلو جاپان چلو ۱۹۸۳ء — الغرض ۱۹۸۷ء
سو ہے وہ بھی آدمی ۱۹۸۷ء — چہرہ در چہرہ ۱۹۹۳ء — سفر لخت لخت ۱۹۹۵ء
آخرکار ۱۹۹۷ء — ہوئے ہم دوست جس کے ۱۹۹۹ء — میرا کالم ۱۹۹۹ء
مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں (دو جلدوں میں) ۲۰۰۱ء — ۲۰۰۲ء
مجتبیٰ حسین کے سفرنامے ۲۰۰۳ء

اعزازات

☆ اڑیہ ادیبوں کی تنظیم سرس ساہتیہ سمیتی، کٹک کی جانب سے "ہاسیہ رتن" کا خطاب۔ ۱۹۸۰ء

☆ غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی کا پہلا غالب ایوارڈ برائے "اردو طنز و مزاح"۔ ۱۹۸۴ء

☆ ایوارڈ برائے "تخلیقی نثر" اردو اکادمی، دہلی۔ ۱۹۹۰ء

☆ کُل ہند مخدوم محی الدین ادبی ایوارڈ۔
آندھرا پردیش اردو اکادمی۔ ۱۹۹۳ء

☆ کُل ہند کنور مہندر سنگھ بیدی ایوارڈ برائے "اردو طنز و مزاح" ہریانہ اردو اکادمی۔ ۱۹۹۹ء

☆ کُل ہند ایوارڈ برائے "مجموعی خدمات"۔
کرناٹک اردو اکیڈیمی۔ ۲۰۰۲ء

☆ علاوہ ازیں ساری تصانیف کو ملک کی مختلف اکادمیوں کے انعامات مل چکے ہیں۔

ہندی میں پانچ مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ ہندوستان کی کئی علاقائی زبانوں میں تراجم۔ اُن کا سفرنامہ جاپان، جاپانی زبان میں بھی شائع ہوا۔ ان دنوں دہلی میں مقیم ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے سفرنامے

مجتبیٰ حسین کے سفر نامے

مرتّب

حسن چشتی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

© جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

MUJTABA HUSSAIN KE SAFAR NAMEY

AUTHOR

MUJTABA HUSSAIN

EDITED BY

HASAN CHISHTI

YEAR OF Ist EDITION - 2003

ISBN 81-87667-61-3

PRICE $ 20=00

Distributor in U.S.A.

INDIA BOOK HOUSE & JOURNALS

2551 W.DEVON AVE, CHICAGO, ILLINOIS 60659, U.S.A.

Ph.: (773) 7646567 Fax: (773) 7647195

نام کتاب	مجتبیٰ حسین کے سفرنامے
مصنف	مجتبیٰ حسین
مرتب	حسن چشتی
سنِ اشاعت اوّل	۲۰۰۳ء
قیمت	۲۰ ڈالر
مطبع	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ۶ (انڈیا)

Published by

Educational Publishing House

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (India)

Ph.: 3216162, 3214465 Fax: 91-011-3211540

E-mail:ephdelhi@yahoo.com

انتساب

حیدرآباد اور اس کی تہذیب کے نام
جسے میں حیدرآباد میں ڈھونڈتا ہوں
اور
مجتبیٰ حسین اس کی تلاش میں دیس بدیس کی خاک چھانتے ہیں

○

مدت سے شہر دل کا، ویران ہو رہا ہے
جائے نظر جہاں تک سُنسان ہو رہا ہے

(میرؔ)

حسن جعفری

ترتیب

☆☆

مقدمہ

مجتبیٰ حسین ہمارے زمانے کے اُردو نثر نگاروں میں ایک جانا پہچانا، مقبول و معتبر نام ہے۔ وہ انشائیہ نگار بھی ہے، خاکہ نویس بھی، طنز و مزاح کے میدان کا یکہ تاز شہسوار بھی ہے، ایک دیدہ ور کالم نگار بھی۔ وہ ایک جہاندیدہ اور سرد و گرمِ زمانہ چشیدہ فنکار ہے جس نے اپنے عہد کے کرب کو طنز و مزاح کے نظر فریب پردوں میں چھپا رکھا ہے۔ بقول مرزا غالب:

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کُھلا

مجتبیٰ حسین کا اُسلوبِ نگارش اُس کا اپنا ہے۔ وہ آسان اور دل میں اُتر جانے والی ایسی زبان لکھتا ہے جس سے خود زبان کی وسعت، ہمہ گیری اور قوت کا اندازہ ہوتا ہے، جس میں کہیں تکلف اور تصنع، آورد یا آرایش اور زیبایش کا شائبہ نہیں ہوتا۔ اُس کا مشاہدہ وسیع بھی ہے، گہرا بھی، وہ ایک صوفی کی طرح اپنی تحریروں میں بے ہمہ بھی ہے باہمہ بھی۔ وہ ہمیں اور آپ کو اپنے شخصی تجربات میں بھی ایسی سہولت سے شریک کر لیتا ہے کہ اُس کے جذبات و احساسات ہمیں اپنے ہی محسوس ہوتے ہیں۔ اِسی کو بلاغت کی اصطلاح میں سہل ممتنع کہا گیا ہے کہ دیکھنے میں بہت سہل اور سبک معلوم ہو، لکھنے بیٹھیں تو بھاری پتھر چوم کر چھوڑ دیں۔ غالب نے اِسی کیفیت کو یوں کہا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

نہ اُس کے لفظوں کا خزانہ کم ہوتا ہے، نہ اُن کی تاثیر و تاثر میں کمی آتی ہے، نہ خیالات کی بیجا تکرار ہوتی ہے، نہ ترسیل میں کوئی کمی رہتی ہے، وہ معمولی سے موضوع کو غیر معمولی اور غیر معمولی کو نہایت معمولی بنانے کا فن بھی جانتا ہے۔ دوسروں کے لئے یہ فن ایسا ہی ہے جیسے اگلے وقتوں کے لوگ کیمیا بنانے میں اپنی عمریں اور سرمایہ دونوں داؤں پر لگا دیتے تھے پھر بھی 'ایک آنچ کی کسر' ہمیشہ رہ جاتی تھی۔

مجتبیٰ کے اُسلوب کی یہ چند نمایاں خصوصیات ہیں جو شہادت دیتی ہیں کہ وہ ہمارے زمانے کا منفرد اور ممتاز انشائیہ نگار ہے۔

ایک خاکہ نگار کی حیثیت سے بھی مجتبیٰ اپنے ہم عصروں میں امتیاز رکھتا ہے۔ اُس نے اپنے کئی درجن معاصر شخصیات کے خاکے لکھے ہیں۔ ان میں کچھ وہ ہیں جو مجتبیٰ کے بزرگ ہیں، کچھ ہم عمر اور ہم سفر ہیں، لیکن وہ ہر ایک کے مقام اور مرتبے کو ملحوظ رکھتا ہے، کسی کی نہ پگڑی اُچھالتا ہے نہ دلآزاری کرتا ہے، جو کچھ کہنا ہوتا ہے نہایت چابکدستی اور ہنرمندی سے کہہ جاتا ہے۔ بقول داغ دہلوی:

زاہد کسی کی چشم جو کہہ جائے بزم میں تیرے فرشتے خاں کو بھی اُس کی خبر نہ ہو

خاکہ نویسی تلوار کی دھار پر قدم رکھنے کے برابر ہے مگر وہ اِس نازک مرحلے سے بھی شیشہ باز کی طرح گذر جاتا ہے۔

یہی معاملہ طنز و مزاح کا بھی ہے۔ طنز کے لئے گہرا مشاہدہ، ہمدردانہ نظر اور ایسی سبکدستی درکار ہے جو کوئی نازک آپریشن کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہے، اور مزاح پھکڑ پن کا نام نہیں ہے، اس کے لئے اوّلین شرط زندہ دل ہونا ہے اور سچی زندہ دلی وہ ہوتی ہے جو اپنی تہذیب و ثقافت میں رچنے بسنے سے حاصل ہوتی ہے۔ سنجیدہ شوخی اور شوخ سنجیدگی کے آمیزے میں ہی وہ کیفیت ہوتی ہے جسے ''ظرافت'' کہتے ہیں۔ اِسی کی ادبی قدر و قیمت ہے، اِسی سے پڑھنے والوں کو انبساط حاصل ہوتا ہے، زبان کی گرفت اور بیان کی تہ داری کا اندازہ ہوتا ہے۔

مجتبیٰ حسین ایک کالم نگار بھی ہے، وہ اُردو زبان کے ایک بڑے اور ہر دل عزیز روزنامہ ''سیاست'' میں پچھلے چالیس برسوں سے مسلسل لکھ رہا ہے، نہ اُس کا قلم تھکتا ہے نہ موضوعات کا قحط ہوتا ہے، نہ اُسلوب و ادا میں اُکتا دینے والی یکسانی آتی ہے۔

کالم نگاری اصل میں صحافت کا شعبہ ہے۔ اس میں مولانا ظفر علی خاں، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر اور چراغ حسن حسرت کے کالم اپنے زمانے میں پسندیدہ رہے ہیں۔ مگر بطور ایک صنف کے اُن کی ادبی حیثیت اُس وقت تک تسلیم نہیں کی گئی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ صنفِ سخن ایسی پھلی پھولی ہے کہ اس نے ادب کے میدان میں بھی اپنی جگہ بنالی ہے۔ پاکستان کے کئی معتبر قلمکار جو اچھے نثر نگار، شاعر یا سماجی علوم کے ماہر رہے ہیں اُنھوں نے اس میدان میں اپنے

کمالِ فن کے ایسے مظاہرے کیے ہیں کہ اب کالم نویسی بھی ادب کی ایک صنف بن گئی ہے۔ ابن انشا، احمد ندیم قاسمی، ابراہیم جلیس، مجید لاہوری اور شوکت تھانوی نے آزادی کے بعد اس صنف کو امتیاز بخشا۔ ان کے علاوہ آج کے دور میں مشفق خواجہ، جمیل الدین عالی، انتظار حسین عطاء الحق قاسمی، اور دوسرے کئی اہلِ قلم برسوں سے کالم لکھ رہے ہیں۔ ہندوستان میں اُردو کی اخباری صحافت اتنی ترقی یافتہ نہیں پھر بھی یہاں فکر تونسوی کے بعد دوسرا نام مجتبیٰ حسین ہی کا لیا جاسکتا ہے جس نے کالم نویسی کے میدان میں بھی اپنی شناخت کو قائم رکھا ہے۔

ہر زمانے کا انسان سفر کرنے کا مشتاق بھی رہا ہے۔ جب سے تصنیف و تالیف کا آغاز ہوا ہے دوسری اصنافِ نثر کے ساتھ سفر نامے بھی لکھے جاتے رہے ہیں جن میں بعض تو غیر معمولی تاریخی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ عربی میں ابن جبیر، المقدسی، ابوریحان البیرُونی، ابنِ بطوطہ اور ابنِ معصوم جیسے کتنے ہی سیاحوں کے سفر نامے ہماری معاشرتی تاریخ کے قیمتی مصادر ہیں۔ فارسی میں سیّد جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں تو ''جہاں گشت'' ہی کہلاتے ہیں۔ سید جہانگیر اشرف سمنانیؒ (لطائف اشرفی) عبدالرزاق سمرقندی، جمالی دہلوی (مصنّف سیر العارفین)۔ محمد شاہ کے عہد میں بن گڑھ پر چڑھائی کی گئی تو اس سفر میں آنند رام مخلص بھی شریک تھے، اُن کا سفر نامہ رام پور رضا لائبریری سے شائع ہو چکا ہے۔ رفیع الدین خان فاروقی مرادآبادی، (سفر نامہ حجاز) نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ (ترغیب السالک الیٰ احسن المسالک) اور ابو طالب لندنی جیسے کتنے ہی اور بھی نام ملتے ہیں۔ یہ کوئی مکمل فہرست نہیں صرف چند نام بطور نمونہ لیے گئے ہیں۔

مرزا غالب نے اگر چہ انیسویں صدی کے شروع میں (۱۸۲۹ـ۱۸۳۰ء) دہلی سے کلکتے تک طویل سفر کیا تھا، مگر اُن کی روداد سفر مرتب نہیں، اُن کے اُردو اور فارسی خطوط میں بکھری ہوئی ہے۔ اُردو کا پہلا سفر نامہ حیدرآباد ہی کے ایک سیّاح یوسف خان کمبل پوش کا بتایا جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں مسیح الدین خان کاکوری کا ''سفر نامہ سفیر اودھ'' اور سر سید احمد خان کا ''مسافرانِ لندن'' اور ''سفر نامہ پنجاب'' ملتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے ''سفر نامہ روم و مصر و شام'' لکھا تو خواجہ حسن نظامی نے بھی مصر و فلسطین و حجاز کے سفر کے حالات قلمبند کیے۔ عبد الماجد دریابادی نے ''پاکستان میں ڈھائی ہفتے'' لکھے تو احتشام حسین نے اپنے سفر امریکہ کی روداد ''ساحل اور سمندر'' کے نام سے ترتیب دی۔

اِس زمانے میں چند لکھنے والے تو ایسے ہیں جنھوں نے کثیر تعداد میں سفرنامے لکھے ہیں جیسے ہمدرد کراچی کے حکیم محمد سعید شہیدؒ۔ یا صرف سفرنامے ہی لکھے ہیں جیسے قمر علی عباسی۔ ابنِ انشا، جمیل الدین عالی، عطاء الحق قاسمی، مستنصر حسین تارڑ اور امجد اسلام امجد نے بھی شگفتہ انداز میں بہت کامیاب سفرنامے لکھے ہیں۔ قدیم زمانے میں جب آمدورفت، مواصلات اور سواریوں کی اتنی سہولت نہیں تھی سفر کرنا واقعی ہفت خواں طے کرنا ہوتا تھا۔ بڑے حوصلے اور ہمت والے ہی سیاحت کے لئے نکلتے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو علم وفن کی طلب میں دُور دَراز کے سفر کرتے تھے۔ اکثر صوفیہ بھی روحانی شخصیتوں سے کسبِ فیض کرنے کے لئے بیاباں نوردی کیا کرتے تھے یا پھر تیسرا طبقہ وہ تھا جو تجارت کا سامان لے کر ملکوں ملکوں گشت کیا کرتا تھا۔ ان میں سفرنامے زیادہ تر اُن سیاحوں نے ہی لکھے ہیں جنھوں نے طلبِ علم میں اپنے گھر سے باہر قدم نکالا تھا۔

فارسی کی کہاوت ہے ''جہاندیدہ بسیار گوید دروغ۔'' اُس قدیم زمانے میں جو ایک دو سال کی سیاحت کے بعد اپنے وطن کو واپس آجاتا تھا وہ باقی ساری زندگی اُس سفر کے تجربے ہی بیان کرتا رہتا تھا۔ اُس میں مبالغہ تو خیر ہوتا ہی تھا، زیبِ داستاں کے لئے جھوٹ سے بھی خوب خدمت لی جاتی تھی۔ قدیم سفرناموں میں آپ کو ''عجائب المخلوقات'' کا تذکرہ بھی بہت ملے گا۔ مثلاً جب میں فلاں ملک میں تھا تو وہاں ایک مخلوق ایسی دیکھی جس کا سر انسان کا اور باقی دھڑ مچھلی یا گھوڑے جیسا ہوتا ہے۔ ایسے سیاحوں میں بعض بہت ثقہ لوگوں کے نام بھی آتے ہیں۔ حاتم طائی کی داستان تو ہفت خواں طے کرنے ہی کی سرگذشت ہے۔ چہار درویش کے قصّے میں بھی چاروں درویش الگ الگ ملکوں کے رہنے والے ہیں۔

اُردو میں زیادہ تر قدیم سفرنامے حج وزیارت سے متعلق ملتے ہیں، ان میں مناسکِ حج کی باتیں تو سب میں مشترک ہی ہوتی ہیں، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حالات کا جائزہ لینا سیاحت کرنے والے کے ذوق اور رجحانات پر منحصر ہوتا ہے۔ حج کے بعض سفرناموں میں اُس عہد کے حجاز کی بہت واضح اور دلچسپ تصویریں ملتی ہیں۔

مجتبیٰ حسین کی جنوں جولانیوں کا دوسرا میدان اُن کے سفرنامے بھی ہیں۔ وہ ملک میں اور بیرونِ ملک بھی طویل سیاحت کر چکا ہے، اُس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ اُس کے سفرنامے گو مختصر ہیں مگر اپنی دلکشی، تجسس آفرینی اور قدر وقیمت میں بہت سے طویل سفرناموں پر

بھاری ہیں۔ غالب نے کہا تھا:

اگر بہ دل نہ خَلد ہر چہ از نظر گزرد　　زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گزرد

دل میں تو مناظر جب چُبھتے ہیں کہ آپ کسی پسماندہ ودرماندہ ملک کی سیر کریں اور وہاں کی بدحالی دیکھ کر رنجیدہ ہوں۔ مجتبیٰ نے پہلا سفر (۲۹؍ستمبر ۱۹۸۰ء سے یکم نومبر ۱۹۸۰ء تک) اُس ملک کا کیا جس نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم کی تباہی کو جھیلا تھا اور ڈھائی لاکھ سے زیادہ انسان پلک جھپکتے میں موت کی نیند سو گئے تھے۔ آج وہی جاپان دنیا کا سب سے بڑا صنعتی ملک ہے اور الیکٹرونکس کی دنیا میں ''لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْم'' کا ڈنکا بجا رہا ہے۔ وہاں کے مناظر اُس کے دل میں چُبھے مگر جاپان کی بدحالی پر نہیں بلکہ اپنے ملک کی خستہ حالی پر۔ یہ مختصر سا سفرنامہ، جاپان کی ایک دلکش تصویر پیش کرتا ہے۔ یہ اُردو میں بھی مقبول ہوا اس کا ہندی میں ترجمہ بھی ہوا اور خود جاپانی زبان کے لباس میں بھی اس کو پیش کیا گیا۔ یقین ہے کہ اس آئینے میں جاپانیوں نے اپنے ملک اور معاشرت کی ایک سچّی عکاسی دیکھ کر ہی اس کو پسند کیا ہوگا۔

مجتبیٰ کے دوسرے مختصر سفرناموں کا 'مجموعۂ کلام' سفرِ لخت لخت کی شکل میں شائع ہوا تھا (جون ۱۹۹۵ء)۔ اس میں پیرس، لندن، کناڈا اور امریکہ کے سفر (۲۷؍فروری ۱۹۸۴ء سے ۳۰؍اپریل ۱۹۸۴ء) سابق سوویت یونین کے سفر (۲۷؍ستمبر ۱۹۸۶ء تا ۸؍اکتوبر ۱۹۸۶ء) سعودی عرب کے سفر (دسمبر ۱۹۸۹ء) کی روداد لکھی گئی ہے۔ 'سفرِ لخت لخت' کی اشاعت کے بعد مجتبیٰ حسین نے مسقط (دسمبر ۱۹۹۵ء) دوبئی (ستمبر ۱۹۹۶) سعودی عرب بغرض حج (۱۹۹۶) اور امریکہ (۲۴؍اپریل تا ۵؍جولائی ۲۰۰۰) کے سفر کئے جن کی سرگذشت انھوں نے روزنامہ ''سیاست'' میں اپنے کالم میں لکھی۔ یہ قسطیں کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئی تھیں۔ اب اُنھیں بھی اس مجموعہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ آج کے زمانے میں دُنیا کا کوئی گوشہ ناپیمودہ بھی نہیں رہا ہے اور سفر کے لئے بھی صرف وقت اور پیسے کی ضرورت ہے۔ سفرناموں میں کوئی نیا انکشاف مشکل ہی سے ہوسکتا ہے۔ لیکن مجتبیٰ کی سیاحتوں کی کچھ خصوصیات ہیں۔ ایک تو وہ اپنے سفر کا بیان ایسے دلچسپ انداز میں کرتا ہے کہ وہ کوئی نیا تجربہ معلوم ہونے لگتا ہے، دوسرے وہ جہاں بھی جاتا ہے وہاں اُردو زبان کو تلاش کرتا ہے یا حیدرآبادی تہذیب اُسے تلاش کر لیتی ہے۔ وہ نئی شخصیات سے ہمارا تعارف کراتا ہے، خود اُن سے بہت جلد مانوس ہو جاتا ہے تو وہ شخصیات ہمیں بھی مانوس معلوم

ہونے لگتی ہیں۔ مجتبیٰ کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُس کی نظر صرف دوستوں کی خوبیوں اور دلکش پہلوؤں پر ٹھہرتی ہے اس لیے وہ جن شخصیات سے ہمارا تعارف کراتا ہے وہ ہمیں بھی اپنی دوست محسوس ہوتی ہیں۔

وہ جہاں بھی جاتا ہے وہاں کے تاریخی آثار یا اداروں کا تعارف بھی اس طرح پیش کردیتا ہے کہ وہ صرف اعداد وشمار کی کھتونی نہیں ہوتے بلکہ ضروری اور بنیادی باتیں قاری کے سامنے آجاتی ہیں۔ جن مقامات کی اُس نے سیر کی ہے اُن کے بارے میں بہت سی اہم معلومات ضمناً مل جاتی ہین۔ وہ خوشدلی کا دامن کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اس لیے اُس کا ہر بیان ایک اکائی بن جاتا ہے کہ اُسے شروع کرنے کے بعد آپ ادھورا نہیں چھوڑ سکتے۔

میں نے ''مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں'' انتخاب کر کے دو جلدوں میں شائع کیں تو اُن کا استقبال توقع سے کہیں زیادہ گرمجوشی سے کیا گیا۔ پہلی جلد کا ایک ایڈیشن چھ ماہ کے اندر ہی ختم ہوگیا اور اُسے دوبارہ چھاپا گیا۔ اب احباب کی فرمائش ہوئی کی تیسری جلد بھی مرتب کی جائے جو مجتبیٰ حسین کے اب تک لکھے گئے سارے سفرناموں پر مشتمل ہو۔ اسے مجتبیٰ حسین کے سفرناموں کی کُلّیات کہا جاسکتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ مجتبیٰ حسین نے اس کی اجازت دی اور اب یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

'مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریروں' کا استقبال امریکہ، کناڈا اور یورپ میں بسے ہوئے اُن کے مدّاحوں میں خاص طور پر بہت تپاک سے کیا گیا۔ ہمیں سب سے پہلے خود مجتبیٰ حسین کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ اُنھوں نے ہمیں ان تحریروں کو شائع کرنے کی اجازت دی اور جہاں ضروری سمجھا ان پر نظرِ ثانی بھی کی۔ اس کتاب کے طابع وناشر بھی اتفاق سے محمد مجتبیٰ خان ہیں جو پبلشنگ کے میدان میں اپنا امتیازی مقام بنا چکے ہیں۔ انھوں نے ممکنہ حد تک صحت اور نفاست کے ساتھ اس جلد کو بھی شائع کیا ہے۔ اُن کا شکریہ ادا کرنا بھی واجب ہے۔

(حسن چشتی)

۲ر نومبر ۲۰۰۲ء

7033- N Kedzie # 112
CHICAGO IL 60645
U.S.A.

☆☆

جاپان چلو، جاپان چلو

جولائی ۱۹۸۰ء کے مہینہ کی بات ہے۔ ایک دن ہم حسبِ معمول دیر سے دفتر پہنچے تو پتہ چلا کہ خلافِ معمول ہمارے افسر بالا نے ہمیں یاد کیا ہے۔ ہم ہانپتے کانپتے ان کی خدمت میں پہنچے تو فرمایا "ہم تمہیں جاپان بھیجنا چاہتے ہیں۔ کیا تم جانے کے لئے تیار ہو۔"

ہم نے کہا "سر! ہم جانتے ہیں کہ پرانے زمانے میں جب کسی شخص سے کوئی جرم سرزد ہو جاتا تھا تو اسے سزا کے طور پر ملک بدر کر دیا جاتا تھا۔ مانا کہ ہم دفتر دیر سے آتے ہیں لیکن یہ اتنا بڑا جرم تو نہیں کہ آپ ہمیں جاپان بھیج دیں۔ پھر جاپان سے ہم بیسیوں چیزیں درآمد کرتے ہیں۔ کیا اس ملک سے جاپان کو برآمد کرنے کے لئے ہم ہی ایک مناسب چیز رہ گئے ہیں۔"

بولے "تم ہر بات میں سے مزاح کا پہلو نکال لیتے ہو۔ ہم تمہیں سچ مچ جاپان بھیجنا چاہتے ہیں۔ جاپان کے بارے میں کچھ جانتے بھی ہو؟"۔

ہم نے کہا "سر! ہائی اسکول تک جغرافیہ پڑھی تھی۔ اس وقت تک تو جاپان براعظم ایشیاء میں ہی تھا۔ اب بھی شاید ایشیاء میں ہی ہوگا۔ ہم ٹھیک سے کہہ نہیں سکتے کیونکہ سنا ہے کہ جاپان نے بہت ترقی کر لی ہے اور ترقی یافتہ ملکوں کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب کدھر کو نکل جائیں۔ یوں بھی براعظم ایشیاء ہم جیسے ملنگوں کی سرزمین ہے جہاں پیٹ کی اہمیت کم اور روح کی زیادہ ہے۔ ہمیں تو غریبی میں نام پیدا کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ ایسے براعظم میں جاپان کا کیا کام؟۔ اگر ہم سے جاپان کے بارے میں مزید کچھ پوچھیں تو اتنا کہہ سکتے ہیں کہ جب ہم بہت چھوٹے تھے اور دوسری جنگ عظیم اپنے عروج پر تھی تو یوں لگتا تھا جیسے جاپان ہمارے گھر کے

پچھواڑے میں واقع ہے۔ ہمیں ہر دم یہ بتایا جاتا تھا کہ جاپانی اب آنے ہی والے ہیں۔ جنگ ختم ہوگئی اور جاپان پھر اپنی جغرافیائی حدود میں واپس چلا گیا۔ جاپان کے بارے میں ہماری جھولی میں بس اتنی ہی معلومات ہیں"۔

بولے "جاپان کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟"۔

ہم نے دماغ پر قدرے زور دے کر کہا "ہاں! خوب یاد آیا۔ جاپان کی گڑیاں بہت مشہور ہیں"۔

بولے "بس اتنا کافی ہے۔ جاپان کے بارے میں تم تو بہت کچھ جانتے ہو۔ ہم جاپان کے دورے کے لئے تمہارا نام مرکزی وزارت تعلیم کو بھیج رہے ہیں"۔

ہم نے کہا "سر! آخر ماجرا کیا ہے۔ صاف بتایئے کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟"۔

بولے "ٹوکیو میں یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کی طرف سے پبلشنگ کا ایک تربیتی کورس اکتوبر میں منعقد ہو رہا ہے۔ اس کے لئے ہندوستان سے ایک عہدہ دار کو روانہ کرنا ہے اور مرکزی وزارتِ تعلیم نے مختلف محکموں سے عہدہ داروں کے نام مانگے ہیں۔ ہم اپنے ادارے سے تمہارا نام بھیج رہے ہیں۔ کیا عجب کہ مرکزی وزارتِ تعلیم اس کورس کے لئے تمہارا انتخاب کرلے۔ کبھی کبھی انتخاب میں غلطی بھی تو ہو جاتی ہے"۔

ہم نے اس ذرہ نوازی کا شکریہ ادا کیا اور اُٹھ کر جانے لگے تو ہمارے افسر بالا نے پوچھا "اس سے پہلے بھی ہندوستان سے باہر گئے ہو؟"

ہم نے کہا "سر! جی تو ہمارا بھی بہت چاہتا ہے کہ نئی نئی زمینیں دیکھیں، نئے نئے آسمانوں میں جھانک آئیں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پئیں، نئے لوگوں سے نئی نئی باتیں کریں، نئے چہروں کو نئے ڈھنگ سے دیکھیں، مگر ہمارا جذبۂ حب الوطنی ہمیں باہر جانے نہیں دیتا۔ ہمیں ہر دم یہ فکر رہتی ہے کہ اگر ہم باہر چلے گئے تو پھر ملک کا کیا ہوگا۔ ہمارے بغیر آخر ملک کس طرح ترقی کر سکتا ہے۔ پھر ہم نے کچھ ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو دس دن کے لئے ہی سہی باہر کے کسی ملک میں جا کر آتے ہیں تو زندگی بھر اس ملک کے قصے اور وہ بھی من گھڑت قصے سنا کر اپنا اور اہل وطن کا وقت برباد کرتے ہیں۔ انہیں اپنے ملک کا سورج اچھا نہیں لگتا۔ چاند کی طرف دیکھتے ہیں تو منہ موڑ کے کہتے ہیں "برطانیہ میں جو چاند ہم نے دیکھا تھا وہ چاند بھلا اس ملک میں کہاں نظر آئے گا۔ بھلا یہ بھی کوئی چاند ہے۔" غرض

انہیں اپنے ملک کی کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔ خدانخواستہ جاپان کے دورے کے لئے ہمارا انتخاب ہوگیا تو اس ملک میں بقیہ زندگی کس طرح گزاریں گے۔ ہمارے افسر بالا نے کہا'' ہم تمہارے جذبۂ حب الوطنی کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ تبھی تو تمہارا نام اس دورے کے لئے تجویز کررہے ہیں۔ رہی یہ بات کہ تم باہر چلے گئے تو اس ملک کا کیا ہوگا۔ اس سلسلے میں ہمارا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں تمہارا باہر جانا نہایت ضروری ہے تاکہ ہمیشہ کے لئے تمہاری خوش فہمی دور ہوسکے۔''

اس بات چیت کے بعد ایک مہینہ بڑی خاموشی کے ساتھ گذر گیا۔ ایک دن دفتر میں بیٹھے کام کررہے تھے کہ ایک دوست نے آکر چپکے سے کہا'' اگر تم جاپان سے میرے لئے ایک بڑھیا ٹرانزسٹر لاسکو تو تمہیں ایک خوشخبری سنانی ہے''۔

ہم نے کہا'' ضرور سُناؤ''۔

بولے'' پہلے ٹرانزسٹر لانے کا وعدہ کرو پھر سناتا ہوں''۔ ہم نے وعدہ کرلیا تو موصوف نے پہلے تو وہ کاغذ ہاتھ میں تھما دیا جس میں ٹرانزسٹر کی تفصیلات لکھی ہوئی تھیں۔ پھر فرمایا'' یار! ابھی ابھی مرکزی وزارتِ تعلیم سے اطلاع آئی ہے کہ جاپان کے دورے کے لئے تمہارا انتخاب ہو گیا ہے۔ اب تو تمہیں میرے لئے ٹرانزسٹر لانا ہی ہوگا۔ یونیسکو کے مہمان ہو کوئی مذاق نہیں ہے۔ ۳۵ دنوں تک روزانہ دس ہزار ین (جاپانی سکہ) تمہیں ملا کریں گے۔ میرا ٹرانزسٹر تو صرف تین چار ہزار ین میں آجائے گا۔'' یہ پہلی فرمائش تھی۔ اس کے بعد جوں جوں ہمارے دورہ جاپان کی اطلاع ہمارے دشمنوں میں پھیلی لوگ فرمائشوں کی فہرست پہلے دیتے تھے اور مبارکباد بعد میں دیتے تھے۔ کچھ ستم ظریف ایسے بھی تھے جو فرمائشوں کی فہرست دینے کے بعد مبارکباد دینا بھول جاتے تھے اور ہمیں مجبوراً انہیں یاد دلانا پڑتا تھا کہ وہ ایک خوشگوار فریضہ انجام دینا بھول گئے ہیں۔ ہمیں بیس دن بعد جاپان میں قدم رنجہ فرمانا تھا اور اس مقصد کے لئے دوستوں سے سامان سفر مانگنا تھا۔ چونکہ ہم سرکاری حیثیت میں باہر جارہے تھے اس لئے سفر کے دوسرے مرحلے تو فوراً طے ہوگئے لیکن فرمائشوں کا سلسلہ دن بہ دن دراز ہوتا گیا۔ جاپان روانہ ہونے سے ایک دن پہلے ہم نے بڑی محنت سے دوستوں کی فرمائشوں کی فہرست مرتب کی تو پتہ چلا کہ حسبِ ذیل سامان جاپان سے ہمیں ہر حالت میں لانا ہے۔

ٹرانزسٹر دستی ۱۵ عدد، ٹرانزسٹر مع ٹیپ ریکارڈر ۱۰ عدد، شفان کی ساڑیاں ۴۵ عدد،

کیلکیولیٹر ۲۵ عدد، سیکو گھڑیاں خواتین کی ۱۰ عدد، مردوں کی ۱۵ عدد، ٹیلی ویژن کے چھوٹے سیٹ ۴ عدد، ٹی سیٹ ۴ عدد، ٹیپ ریکارڈر کے کیسٹ ۱۰۰ عدد۔ جاپان کی گڑیاں ۲ عدد (ایک گڑیا ہمارے دوست اور کرم فرما جناب پی گنگا ریڈی وزیر سیول سپلائز آندھرا پردیش کے لئے اور دوسری گڑیا ہمارے دوست قاضی سلیم کی بیٹی سلمیٰ کے لئے) جاپان کی گڑیوں کی فرمائش اب بھی ہمارے لئے ایک معمہ بنی ہوئی ہے۔ ہمارے کرم فرما جناب پی گنگا ریڈی ہمارے جاپان روانہ ہونے سے پہلے دہلی آئے تو کہنے لگے "مجتبیٰ بھائی! آپ جاپان جا رہے ہیں۔ میری ایک چھوٹی سی فرمائش ہے۔ کیا آپ پوری کرسکیں گے؟"

ہم نے کہا "آپ کے لئے تو ہم پورے جاپان کو اُٹھا کر لا سکتے ہیں۔ یوں بھی ہم ایروں غیروں کے لئے پندرہ بیس ٹرانز سٹرز، تیس گھڑیاں، چالیس پچاس ساڑیاں اور نہ جانے کیا کیا جاپان سے لا رہے ہیں۔ آپ تو ہمارے عزیز ترین دوست اور کرم فرما ہیں۔ آپ فرمائش کر کے تو دیکھئے"۔ یہ سن کر ہمیں ایک کونے میں لے گئے اور آہستہ سے کان میں کہا "میرے لئے ایک اچھی سی جاپانی گڑیا لے آیئے"

ہم نے کہا "یہ کون سی مشکل بات ہے۔ اتفاق دیکھئے کہ آج ہی قاضی سلیم کی بیٹی نے بھی ہم سے ایک جاپانی گڑیا کی فرمائش کی ہے۔ جب ہم اس کے لئے ایک گڑیا خریدیں گے تو آپ کے لئے بھی ایک اور خرید لیں گے۔ بھلا یہ بات بھی کونے میں الگ لے جا کر کہنے کی ہے۔"

گنگا ریڈی صاحب بولے "مجتبیٰ بھائی! آپ کیسے مزاح نگار ہیں۔ میری جاپانی گڑیا اور قاضی سلیم کی بیٹی کی گڑیا میں کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتے۔ خیر آپ کی مرضی۔"

اب جب کہ ہم جاپان پہنچ گئے ہیں۔ ان کی بات اب بھی ہمارے لئے معمہ بنی ہوئی ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو ہم نے ٹھان لیا ہے کہ ان کے لئے اور قاضی سلیم کی بیٹی کے لئے دو عدد جاپانی گڑیاں ضرور لیتے آئیں گے کیونکہ یہاں آنے کے بعد ہم نے فرمائشوں کی فہرست کا جاپان کی مہنگائی کے پسِ منظر میں ٹھنڈے دل و دماغ سے جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ ہم اس فہرست میں سے صرف دو گڑیاں ہی خرید سکتے ہیں۔

ہندوستان سے روانہ ہونے سے ایک دن پہلے جب ہم اپنے گھر میں فرمائشوں کی فہرست مرتب کر رہے تھے تو ہماری اہلیہ محترمہ نے اس فہرست کو دیکھ کر سوچا کہ لگے ہاتھوں

فرمائشوں کی اپنی فہرست بھی ہمیں تھما دیں۔ہم نے اس فہرست کا ہوائی جہاز میں بغور مطالعہ کیا۔ خاصی دلچسپ فہرست ہے اور اس کے مطالعہ سے ہمارا سفر خاصا آرام سے کٹا۔اس لئے کہ اس فہرست میں نہ کہیں ٹرانزسٹر ہے نہ ساڑی۔نہ ٹیلی ویژن ہے نہ جاپانی چھتری ہے۔بس ہم سے اتنی معصوم سی خواہش کی گئی ہے کہ ہم جاپان سے ۵۰ کیلوگرام گیہوں، ۴۰ کیلوگرام چاول، مونگ پھلی کا تیل چھ کیلو گرام، نہانے کا صابن چھ ٹکیاں، کپڑے دھونے کا صابن آٹھ ٹکیاں لیتے آئیں۔الغرض یہ فہرست ہوتے ہواتے ۱۰۰ گرام لونگ الائچی اور ۱۰۰ گرام شاہ زیرے پر ختم ہوگئی ہے۔البتہ جاپان پہنچنے کے بعد ہماری اہلیہ محترمہ نے فون پر اطلاع دی ہے کہ غلطی سے مہینے بھر کے سامان کی فہرست ہمارے ساتھ چلی گئی ہے اور جو چیزیں جاپان سے آنی ہیں ان کی فہرست بذریعہ ڈاک روانہ کی جارہی ہے۔اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی۔اور ہاں! ہمیں اپنے ایک ادیب دوست کی معصوم سی فرمائش بھی یاد آ گئی۔انہیں جب پتہ چلا کہ ہم جاپان جارہے ہیں تو ہم سے کہا ''تم جاپان جارہے ہو تو ایک چھوٹی سی فرمائش ہے''۔

ہم نے کہا ''ارشاد ہو''۔

بولے ''جاپان جانے سے پہلے یہ وعدہ کرتے جاؤ کہ تم جاپان کے بارے میں کوئی سفر نامہ نہیں لکھوگے''

ہم نے ان کی فرمائش کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا مگر جب ہم اپنے اتنے سارے دوستوں اور بہی خواہوں کی فرمائشوں کی تکمیل نہیں کر رہے ہیں تو ان کی فرمائش کے بارے میں کیوں سنجیدہ ہو جائیں۔لگے ہاتھوں ایک مصرعہ یاد آ گیا۔غالباً پنڈت ہری چند اختر کا ہے۔یہاں جاپان میں کوئی اردو کتاب بھی تو نہیں ملتی کہ جس کو شاعر کا صحیح نام معلوم کرنے کے لئے حوالے کے طور پر استعمال کرسکیں۔مصرعہ کچھ یوں ہے۔

کہا جاپان کا ڈر ہے کہا جاپان تو ہو گا

اردو میں جاپان کے بارے میں غالباً یہ پہلا اور واحد مصرعہ ہے اور انشاء اللہ ہمارا سفر نامہ بھی اردو میں اپنی نوعیت کا جاپان کا پہلا سفر نامہ ہوگا۔

(''جاپان چلو، جاپان چلو''۔۱۹۸۰)

☆☆

خوش رہو اہلِ وطن

دہلی سے ٹوکیو روانہ ہونے سے پہلے ہم نے اپنے ایک ایک دوست کو دس دس مرتبہ فون کر کے اچھی طرح بتا دیا تھا کہ ہم ۲۸ ستمبر کی رات میں دو بجے پان امریکن کی اڑان نمبر ۲ سے پرواز کر رہے ہیں۔ پالم کا ہوائی اڈہ شہر سے بہت دور ہے اور وقت بھی نا مناسب ہے۔ اسی لئے ہمیں چھوڑنے کے لئے ہوائی اڈے پر آنے کی زحمت نہ کرنا۔ بعض دوستوں سے تو پندرہ مرتبہ فون کر کے وعدہ لیا تھا کہ وہ ہمیں وداع کرنے کے لئے نہیں آئینگے۔ اس لگاتار یاد دہانی کے بعد ہمیں یقین تھا کہ ہوائی اڈے پر دوستوں اور بہی خواہوں کا ایک جم غفیر ہوگا جو رومالوں کے پیچھے اپنی آنکھیں چھپائے بادیدہ نم ہمیں ہندوستان سے رخصت کریں گے اور ہم انہیں دلاسہ دیں گے کہ ۳۵ دن کی عارضی جدائی میں یوں اپنا کلیجہ چھلنی نہیں کرتے۔ مگر ہوائی اڈے پر پہنچے تو دیکھا کہ صرف تین دوست ہمیں وداع کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ہندی کے ناول نگار پربھاکر دویدی تھے، انگریزی کے ایڈیٹر رگھونندن سہائے سکسینہ تھے اور تیسرے ہمارے حیدرآبادی دوست بشارت اللہ حسینی تھے۔ اتفاق سے یہ تینوں دوست ایسے تھے جنھیں ہم ہوائی اڈے پر آنے سے منع کرنا بھول گئے تھے۔ اگر خدانخواستہ یہ غلطی کر بیٹھتے تو ان دوستوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے، پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ہمارے دوست ہمارے مشوروں پر اب صدق دل سے عمل کرنے لگے ہیں۔ ہم نے اپنے سفر جاپان کے لئے بطورِ خاص پان امریکن کے طیارے کا انتخاب کیا تھا کہ دنیا کی بڑی ہوائی سروس ہے، سفر کا مزہ آجائے گا۔ پھر یہی وہ مشہور ہوائی سروس ہے جو دنیا کے

گرد پورا ایک چکر لگاتی ہے ۔پان امریکن کی اڑان نمبر ا سانفرانسسکو سے نکل کر ٹوکیو، ہانگ کانگ، بنکاک، دہلی، فرینکفرٹ اور لندن سے ہوتی ہوئی نیویارک پہنچ جاتی ہے یعنی مشرق سے مغرب میں جاتی ہے۔اور اڑان نمبر ۲ نیویارک سے نکل کر الٹا چکر لگاتی ہوئی سانفرانسسکو پہنچ جاتی ہے۔یعنی مغرب سے مشرق کی طرف جاتی ہے،ہم اس رات اڑان نمبر ۲ کے مسافر تھے۔ہم پہنچے تو دوستوں نے بتایا کہ ہوائی جہاز آچکا ہے اور بس آپ ہی کا انتظار ہے۔آپ پیش قدمی کریں تو ہوائی جہاز پرواز کرے۔ہم نے دوستوں سے اجازت لی۔اپنے وطن عزیز اور اردو زبان دونوں کو خدا حافظ کہا اور ہوائی جہاز میں آن بیٹھے۔پان امریکن کے ہوائی جہاز 747 کا شمار دنیا کے بڑے ہوائی جہازوں میں ہوتا ہے۔اپنے ملک میں تو ہم وقتاً فوقتاً ایورو، بوئینگ، ایربس اور اسی قماش کے دیگر طیاروں کو بھگت چکے تھے لیکن 747 میں بیٹھنے کا پہلا تجربہ تھا۔لہذا پہلے ایرہوسٹس پر نظر ڈالنے کی بجائے ہوائی جہاز پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔مسافروں پر بھی اچٹتی سی نظر ڈالنے کا ارادہ تھا مگر مسافر اتنے کم تھے کہ ان پر نظر ڈالنے میں بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ایک عجیب وغریب بات ہم نے یہ محسوس کی ہے کہ ہر ہوائی سفر میں ہمیں ہمیشہ ہوائی جہاز کی کھڑکی کے برابر والی نشست ملتی ہے۔اس بار بھی وہی ملی۔ہوائی جہاز نے جب اڑان بھری تو دو بج رہے تھے۔ہم نے سوئی ہوئی دہلی کو نیچے جھانک کر دیکھا۔بہت بھلی لگی۔پھر ہم نے ہوائی جہاز کے اندر نظر ڈالی تو دیکھا کہ ہمارے برابر ایک انگریز بیٹھا انجینئرنگ کے موضوع پر کوئی کتاب پڑھ رہا ہے اور اطراف کی ساری نشستیں خالی ہیں۔ہم نے سوچا کہ چلو موصوف سے ان کے دیس کی باتیں کریں۔ان کی اور ان کے بال بچوں کی خیریت پوچھیں تاکہ سفر آسانی سے کٹ جائے۔بھلا ہوائی سفر میں کوئی انجینئرنگ کی کتاب پڑھتا ہے۔

ہم نے پوچھا ''آپ کہاں سے آرہے ہیں؟'' موصوف نے کتاب پر سے اپنی نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا ''لندن''

پوچھا ''کہاں کا قصد ہے؟'' ۔بدستور کتاب پڑھتے ہوئے بولے'' بنکاک''

اُن کی اس روکھائی کو دیکھ کر ہمیں بھی تاؤ آ گیا۔فوراً اپنے بیگ میں سے جاپان کے بارے میں ایک کتاب نکالی اور پڑھنا شروع کر دیا۔مقصد اس مطالعہ کا صرف موصوف کو یہ بتانا تھا کہ اگر آپ کتاب پڑھ سکتے ہیں تو ہمیں بھی کتاب پڑھنا آتی ہے۔مگر ابھی چند ہی لمحے گزرے

تھے کہ ایر ہوسٹس ہماری اور ہمارے بال بچوں کی خیریت پوچھنے آ گئی۔ اس نے آتے ہی ہم سے کہا ''اگر آپ سوجانا چاہیں تو بندی آپ کے لئے چار نشستوں کے ڈانڈے ہٹا کر انہیں پلنگ میں تبدیل کرسکتی ہے۔ اس وقت ہوائی جہاز میں مسافر بھی کم ہیں اور رات بھی بہت ہو چکی ہے اور اب آپ کو سوجانا چاہیے''۔

ہم نے کہا'' بی بی! آپ کی ذرہ نوازی کا شکریہ۔ ہم اگر کبھی رات میں دو بجے تک جاگ لیں تو پھر ہمیں ساری رات نیند نہیں آتی۔ لہٰذا ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو''۔ تاہم وہ برابر اصرار کرتی رہی کہ ہم سو جائیں اور ہم بدستور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے۔ اس کے بعد اس نے اپنی توجہ کتاب پڑھنے والے انگریز کی طرف مبذول کی اور انہیں بھی نینداور آرام کے فوائد سے آگاہ کرنے لگی۔ مگر ہم اس انگریز کی ثابت قدمی کی داد دیتے ہیں کہ اس نے کتاب پر سے نظر نہیں ہٹائی اور نہایت کرخت انگریزی میں کہا'' جاؤ ہم نہیں سوتے''۔ وہ وہاں سے بھاگی اور اپنے کیبن میں بیٹھ کر کتابیں پڑھنے والے ہم دونوں مسافروں کو حیرت سے دیکھنے لگی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت ہوائی جہاز میں ہم دو مسافروں اور ایک ایر ہوسٹس کے سوائے کوئی جاگ نہیں رہا تھا۔ ہم دونوں مسافر سو جاتے تو کیا عجب کہ ایر ہوسٹس بھی سو جاتی۔ ایک گھنٹہ تک ہم پڑھائی کے معاملہ میں انگریز کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے۔ اتنے میں پائلٹ نے اعلان کیا کہ ہم کلکتہ پر سے گزر رہے ہیں اور اب خلیج بنگال میں داخل ہوا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد بنکاک تک کا سفر سمندر کے اوپر سے طے ہوگا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ہم نے کتاب پر سے نظر ہٹالی۔ ایر ہوسٹس کو دیکھا۔ بیچاری مظلوم ایر ہوسٹس اپنے کیبن میں چپ چاپ بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ ہم نے سوچا کہ پان امریکن ایرلائنس نے اتنی بھاری تنخواہ دے کر بیچاری کو ایر ہوسٹس مقرر کیا ہے تو کیوں نہ اس کی خدمات سے استفادہ کیا جائے۔ اس غریب کو پتہ تو چلے کہ کسی کو اس کی حاجت ہے۔ ہم نے گھنٹی دبائی تو وہ دوڑی چلی آئی۔

ہم نے کہا'' بی بی تمہارا اس طرح بیکار بیٹھے رہنا خدا کی قسم اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ جاؤ دوڑ کے ہمارے لئے کافی ہی لادو''۔ وہ جانے لگی تو انگریز مسافر نے بھی اپنی زبان کھولی اور بولا'' ہمارے لئے بھی کافی لے آؤ''۔ ہم جانتے ہیں کہ اس نے محض ہمیں یہ جتانے کے لئے کافی کا آرڈر دیا تھا کہ میاں بچو تم کافی پی سکتے ہو تو ہم بھی کافی پی سکتے ہیں۔ غرض ہم دونوں میں کتابیں

پڑھنے اور کافی پینے کا مقابلہ جاری ہی تھا کہ یکبارگی ہماری نظر کھڑکی کے باہر جو پڑی تو دیکھا کہ آسمان پر سورج کی سواری کے نکلنے کا اعلان ہو رہا ہے۔ گھڑی دیکھی تو چار بج رہے تھے۔ ہم نے کہا یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے۔ آج سورج کو دھرتی کے نیچے سے نکل آنے میں اتنی عجلت، اتنی بے قراری کیوں ہے۔ ہمارے ملک کے مرغ تو ابھی سو رہے ہیں اور یہاں کے مرغوں نے ابھی سے بانگ دینا شروع کر دیا ہے۔ ذرا غور کیا تو احساس ہوا کہ سارا قصور مرغوں کا نہیں جغرافیہ کا ہے۔ ہم اپنی سواری میں سورج کی طرف بڑھ رہے تھے اور سورج اپنی سواری میں ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ چند ہی منٹوں میں سورج فٹ بال کی طرح سمندر میں سے اُچھل آیا۔ قدرت کی کتاب ہمارے سامنے کھل گئی تو ہم نے اپنی کتاب بند کر دی اور لگے کھڑکی سے باہر جھانکنے۔ مگر انگریز بدستور اپنی کتاب میں ڈوبا رہا۔ جی میں آیا کہ اس سے کہیں کہ میاں ایک نظر ادھر بھی ڈالو کیسا حسین منظر ہے۔ تمہارا ایک شاعر گزرا ہے ورڈسورتھ، وہ اگر آج ہمارا ہم سفر ہوتا تو ہمیں کھڑکی سے ہٹا کر ہماری جگہ خود بیٹھ جاتا۔ انجینئرنگ کی کتاب ہرگز نہ پڑھتا۔ تم ورڈسورتھ کو بھول گئے مگر ہم نہیں بھولے۔ ابھی ہوائی جہاز کے بنکاک پہنچنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ سمندر چاندی کی چادر کی طرح نیچے بچھا ہوا تھا اور کہیں کہیں کوئی جزیرہ اس چادر میں پیوند کی مانند نظر آ جاتا تھا۔ تھائی لینڈ کی خوبصورت سرزمین کو ہم ۴۵ ہزار فیٹ کی بلندی سے دیکھتے رہے۔ ناریل کے درختوں اور جگہ جگہ بہتی ہوئی ندیوں اور نہروں کے جال نے آنکھوں میں وہ سرور اور دل میں وہ گداز پیدا کیا کہ جی چاہا آج کی صبح کی شام کبھی نہ ہو۔ یہ صبح یوں ہی ساری کائنات پر آخری سانس تک پھیلی رہے۔ ہم میں ایک بُری عادت یہ ہے کہ شاعروں کو ناپسند کرنے کے باوجود کبھی کبھی ہم خود بے ارادہ طور پر شاعر بننے لگ جاتے ہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو خبردار کیا کہ میاں یہ کیا ہو رہا ہے۔ ذرا سنبھالو اپنے آپ کو۔ بنکاک کا ہوائی اڈہ سامنے آ چکا تھا۔ ہوائی اڈے پر اترنے سے پہلے ہوائی جہاز نے بنکاک کا ایک چکر لگایا اور ہم نے سچ مچ بنکاک پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ ہم اُڑنے والے پنچھی ہی تو تھے۔ کسی نے سچ کہا ہے بنکاک مشرق کا وینس ہے۔ جگہ جگہ نہروں کا جال، چاول کے ہرے بھرے کھیت، ناریل کے درختوں کے جھنڈ، سبزہ ہی سبزہ، قسمت کی لکیروں کی طرح پھیلی ہوئی سڑکیں۔ بنکاک پر ہوائی جہاز ایک گھنٹہ کے لئے رُکا۔ ہمارے برابر والا انگریز مسافر کتاب پڑھتے پڑھتے اپنا بیگ اٹھا کر چلا گیا۔ تھائی لینڈ کی پستہ قد محنت کش لڑکیوں کا ایک غول ہوائی جہاز میں آیا

اور اس نے ہوائی جہاز کی صفائی شروع کر دی۔ پھر نئے مسافر آئے۔ ہمارے برابر والی نشست پر اک نو جوان جاپانی آ کر بیٹھ گیا۔ مگر ہم نے ٹھان لیا تھا کہ اب کسی مسافر سے بات نہیں کریں گے۔ لیکن جاپانی نوجوان نے آتے ہی ہم سے کہا ''گڈ مارننگ''۔ ہم نے جواباً کہا ''اوہائیو گزائی مس'' (جاپانی میں صبح کا سلام)۔

اس نے حیرت سے کہا ''آپ جاپانی جانتے ہیں''؟

ہم نے کہا ''ہئی، ہئی'' (جاپانی جی ہاں)۔

اس نے کہا ''تب تو سفر کا مزہ آ جائے گا''۔

ہم نے کہا ''دوموآری گاتو گزائی مس'' (جاپانی میں آپ کا بہت شکریہ)

اس نے کہا ''ارے آپ تو سچ مچ جاپانی جانتے ہیں''۔

اس پر ہم نے انگریزی میں کہا ''بھیا! جتنی جاپانی ہم جانتے تھے وہ ان تین جملوں میں خرچ ہو چکی ہے ہم فضول خرچی کے قایل نہیں ہیں۔ لہٰذا کوئی اور زبان جانتے ہو تو اس میں بات کرو ورنہ تم اپنی جگہ خوش اور ہم اپنی جگہ خوش''۔

وہ بولا ''میں تھوڑی سی انگریزی جانتا ہوں۔ بنگالی بھی تھوڑی سی آتی ہے۔ بنگلہ دیش سے آ رہا ہوں۔ وہاں ایک فرم میں ایک سال کے لئے انجینئرنگ اکسپرٹ بن کر گیا تھا۔ اب اپنے وطن واپس جا رہا ہوں۔''

ہم نے کہا ''جس نشست پر آپ بیٹھے ہیں وہ غالباً انجینئروں کے لئے محفوظ ہے۔ آپ سے پہلے یہاں ایک انگریز انجینئر بیٹھا تھا۔ اب آپ آئے ہیں۔'' اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا ''آپ دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔''

ہم نے کہا ''کیا کریں زبانِ یارِ من ترکی ہے۔ اگر تم بھی ہماری طرح اہلِ زبان ہوتے تو اردو محاوروں کو بگھار دے کر اپنی بات کو چٹخارے دار بناتے اور تب تمہیں پتہ چلتا کہ ہم کتنے دلچسپ آدمی ہیں۔ بہر حال اب تمہارے دیس کو جا رہے ہیں اور ہماری جھولی میں تمہاری زبان کے دو چار جملے ہیں۔''

ہوائی جہاز بنکاک سے اڑ چکا تھا اور اب کچھ دو چار ہم صورت نہ سہی ہم سیرت ہوائی جہاز میں آن بیٹھے تھے۔ پھر ناشتے کی باری آئی اور ہمارے سامنے ناشتے کی کشتی رکھی گئی تو

دیکھا کہ سور کے گوشت پر دو تلے ہوئے انڈے رکھے ہیں۔ ہم نے ایر ہوسٹس سے کہا ''بی بی! ہم سور کا گوشت نہیں کھاتے۔ لہٰذا ہمارے لئے صرف انڈے لے آؤ۔''

وہ بولی ''ایسی بات ہے تو انڈے ہٹا لیجئے۔ سور کا گوشت میں لے جاؤنگی''۔ ہم نے کہا ''محترمہ سور کے گوشت پر انڈے رکھے ہوئے ہیں، اب ہم انہیں کیسے کھا سکتے ہیں۔''

ایر ہوسٹس نے کہا'' میں مجبور ہوں۔ بنکاک سے ہمیں اسی قسم کا ناشتہ ملا ہے۔ ہر کھانے کا ڈیزائن اور ناک نقشہ یہی ہے یعنی سور کا گوشت نیچے اور تلے ہوئے انڈے اس کے اوپر۔''

ہمارے جاپانی دوست آئی یو کو غصہ آ گیا۔ بولے'' اتنی بڑی ایرلائنس ایک مسافر کو کھانا بھی نہیں کھلا سکتی''۔ اس کے بعد ہمارے جاپانی دوست نے اپنے بیگ میں سے بنکاک کا ایک بڑا کیک نکالا۔ پھر سوکھے بادام، اخروٹ اور نہ جانے کیا کیا چیزیں ہمیں پیش کرنے لگے۔ ہر بار کہتے یہ میری طرف سے تحفہ ہے۔ بنکاک سے ہانگ کانگ تک کا سفر تقریباً تین گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ ان تین گھنٹوں میں ہمارے دوست نے کھانے پینے کی اتنی چیزیں تحفے میں پیش کیں کہ ہمیں جاپان آئے ہوئے دس دن ہو چکے ہیں اور اب تک ہم ان کے بادام اور اخروٹ کھائے چلے جا رہے ہیں۔ جاپانیوں کی تحفہ دینے کی عادت کے بارے میں کبھی تفصیل سے لکھیں گے۔

صاحبو! مہربانو! قدردانو! ہوشیار! خبردار!۔ اپنے ہوش وحواس پر قابو رکھو۔ اگر تمہارے پاس اخلاق کا دامن ہے تو اسے مضبوطی سے تھامے رکھو، اپنا ایمان سنبھالو، اپنے نفس کو جتنا مار سکتے ہو مارو۔ ابھی کچھ ہی دم میں ہمارا ہوائی جہاز ہانگ کانگ پر اُترنے والا ہے۔ ہانگ کانگ کا حال بعد میں لکھیں گے۔ ہم میں اس وقت اتنی تاب ہے نہ مجال کہ ہانگ کانگ کے بارے میں کچھ عرض کر سکیں۔

(''جاپان چلو، جاپان چلو۔'' ۱۹۸۰)

☆☆
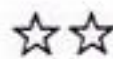
ٹوکیو میں ہمارا ورودِ مسعود

ہم نے پچھلی قسط میں آپ کو ہانگ کانگ کی آمد کے بارے میں حسبِ استطاعت خبردار کیا تھا۔ ہانگ کانگ ملک کیا ہے، بس ایک جزیرہ سا ہے۔ اسے سمٹا ہوا دل عاشق کہہ لیجئے۔ جب ہمارا ہوائی جہاز نیچے اُترنے لگا تو پورا جزیرہ ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ فلک بوس عمارتوں کو اپنی ہتھیلی میں سجائے ہوئے سمندر کی لہروں سے کھیلتا ہوا یہ جزیرہ اتنا خوبصورت لگا کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ یہاں برسوں انگریزوں کی حکمرانی رہی ہے اور اب بھی ایک اعتبار سے ہے۔ باشندے زیادہ تر چینی ہیں۔ چینی زبان بولتے ہیں اور انگریزی پر بھی ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ یہاں سے چین کی سرحد بھی دکھائی دیتی ہے۔ بڑا کاروباری مرکز ہے۔ ہانگ کانگ کی رونق وہاں کے باشندوں سے نہیں بلکہ ان سیاحوں سے ہے جو آتے ہوئے اپنی جیبوں میں دولت اور دلوں میں ارمان بھر کر لے آتے ہیں۔ چونکہ ہانگ کانگ کی بندرگاہ فری پورٹ ہے، اس لیے ہر کوئی منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔ یہاں ہر چیز بکتی ہے۔ ہمارے ایک دوست اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ دو سال پہلے ہانگ کانگ کے ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں سامان خریدنے گئے۔ چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھیں، کوئی شئے پسند نہ آئی۔ اچانک سلیز گرل پر جو نظر پڑی تو وہ پسند آ گئی۔ لہٰذا اسیلز گرل کو خرید کر لے آئے۔ ہانگ کانگ سے کوئی شخص خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا۔ ہر مراد پوری ہو جاتی ہے۔ کاش سکندر کو ہانگ کانگ جانے کا موقع ملتا۔ ہمارا ہوائی جہاز یہاں دو گھنٹہ ٹھہرنے والا تھا۔ ہمیں یہ سہولت دی گئی کہ ہم چاہیں تو طیرانگاہ کے ڈیوٹی فری بازار سے چیزیں خرید لیں۔ دو گھنٹے

گزارنے کا معاملہ تھا سو ہم اپنے جاپانی دوست آئی یو کے ساتھ ڈیوٹی فری بازار میں کھو گئے۔ یہاں دنیا جہان کی چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ ہم نے زندگی میں کبھی اس طرح شاپنگ نہیں کی جس طرح کی جاتی ہے۔ بہت شاپنگ کی تو سگریٹ خریدے یا پان خریدے۔ اس کے علاوہ شاپنگ کے میدان میں ہمارا کوئی عملی تجربہ نہیں ہے۔ لہٰذا ہر دوکان کے سامنے یوں کھڑے رہے جیسے بین کے سامنے بھینس کھڑی ہوتی ہے۔ تاہم سگریٹوں کی شاپنگ کے معاملہ میں اپنے دیرینہ تجربہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے اتنے سارے سگریٹ خرید لئے کہ جب ہم ہوائی جہاز میں واپس ہوئے تو ہمارے دونوں کندھوں اور دونوں ہاتھوں میں سگریٹوں سے بھری ہوئی تھیلیاں لٹک رہی تھیں۔

ہانگ کانگ کے ہوائی اڈہ کے بارے میں ایک بات اور عرض کردیں کہ یہ بالکل سمندر سے متصل ہے۔ لہٰذا جب ہوائی جہاز ہوائی اڈہ پر اُترنے لگتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہوائی جہاز ہوائی اڈہ پر نہیں اتر رہا ہے بلکہ سمندر میں گر رہا ہے۔ ہمیں بھی اس منظر سے بڑی پریشانی ہوئی تھی۔ آپ کبھی ہانگ کانگ جائیں تو ہوائی اڈہ کی اس ہیئت ترکیبی سے بالکل پریشان نہ ہوں۔ اللہ نے چاہا تو آپ زمین پر ہی اتریں گے۔ غرض ڈھائی گھنٹوں کے بعد جب ہمارا ہوائی جہاز ٹوکیو کی طرف روانہ ہوا تو کچھ نہ پوچھئے کہ ہوائی جہاز میں کیا حالت تھی۔ تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ اب زیادہ تر مسافر جاپانی تھے۔ اور پان امریکن ہوائی سروس کو جاپانیوں پر بڑا ترس آتا ہے۔ ترس کیوں نہ آئے جاپانی آخر کو ترقی یافتہ ملک کے باشندے جو ٹھہرے۔ لہٰذا ہوائی جہاز کے عملے نے ہانگ کانگ کے بعد آداب مہمان نوازی یکسر بدل دیئے۔ وہ بنکاک والی بات نہیں تھی۔ بنکاک کے تجربہ کے پسِ منظر میں لنچ کے وقت ہم نے ڈرتے ڈرتے ایر ہوسٹس کو یاد دلایا اور گزارش کی کہ ہمیں سور کے گوشت سے محفوظ رکھا جائے۔ اس نے پوچھا "آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟" ہم نے کہا "مرغ، مچھلی، بیف یا سبزی جو کچھ بھی آپ کے بس میں ہو وہ ہمیں دے دیجئے۔ مسافر ہیں آپ کے حق میں دعا کریں گے۔" تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو دیکھا کہ وہ اپنے لبوں کی آخری حدوں تک ایک لمبی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے اور ہاتھ میں ایک بڑی سی کشتی پکڑے خراماں خراماں چلی آرہی ہے۔ کشتی پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ اس میں مرغ بھی ہے مچھلی بھی ہے بیف بھی ہے اور سبزی بھی۔ ہم نے کہا "اتنی ساری چیزوں کا ہم کیا کریں گے؟"۔ اپنی مسکراہٹ میں

ایک نئی طرح داری اور دلنوازی پیدا کرتے ہوئے معصومیت سے بولی ''آپ کھائیں گے اور کیا؟''۔ ہمارے جاپانی دوست نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ''محترمہ! آپ سے پہلے جو ایر ہوسٹس یہاں تھیں انھوں نے انھیں صبح میں بھوکا ہی رکھا تھا۔ مگر آپ کا لطف و کرم کیا معنی رکھتا ہے''۔ ہم نے اپنے جاپانی دوست کو ٹوکتے ہوئے کہا ''بھیا! کیوں بیچاری کا دل دُکھاتے ہو۔ ہم جہاں بھی گھنی چھاؤں دیکھتے ہیں وہاں بیٹھ جاتے ہیں۔ چھاؤں نہ ملے تو سورج سے بھی آنکھیں ملا لیتے ہیں۔ ان کا کرم ہے کہ انہوں نے ہمیں اس قابل سمجھا ورنہ ہم کیا اور ہماری بساط کیا۔''

ہانگ کانگ سے ٹوکیو تک ساڑھے تین گھنٹوں کا سفر کس طرح کٹا ہمیں یاد نہیں۔ ہانگ کانگ کے بعد ہوائی جہاز میں جاپانی زبان میں بھی اعلانات ہونے لگے۔ یعنی جاپانی میں ہمیں بتایا گیا کہ ایمرجنسی کی صورت میں ہمیں ہوائی جہاز کے کون سے دروازہ سے باہر کودنا چاہیئے، آکسیجن کی کمی کی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے، ہم نے پہلے پہل جاپانی زبان یہیں سنی۔ کانوں کو عجیب وغریب لگی۔ جب ہم ٹوکیو کے بین الاقوامی ہوائی اڈہ 'نریتا' کے قریب پہنچے تو شام ہو رہی تھی۔ مقامی وقت کے مطابق ساڑھے چار ہوں گے۔ ہوائی جہاز نے پھر ایک چکر ہوائی اڈہ کا لگایا اور اسی بیچ ہمارے جاپانی دوست نے ایک مرحلہ پر ایک پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا'' وہ دیکھو جاپان کا شہرہ آفاق پہاڑ فیوجی نظر آ رہا ہے۔'' ہم نے دیکھا کہ بڑا بُردبار اور سنجیدہ پہاڑ ہے۔ سر پر برف کی ٹوپی پہنے چپ چاپ کھڑا گیان دھیان میں مصروف ہے۔ پھر ہم نے جدھر نظر دوڑائی ادھر چھوٹے چھوٹے پہاڑ اور ان پہاڑوں کے دامن میں چھوٹے چھوٹے جاپانی گھر نظر آئے۔ ہماری آنکھوں نے پہلے پہل جاپان کو اسی طرح دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ٹوکیو کے بین الاقوامی ہوائی اڈہ نریتا پر تھے۔ ہم نے سوچا ہوائی جہاز پر سیڑھی لگ جائے تو ہم بھی نیچے اتریں گے۔ مگر پتہ چلا کہ یہاں ہوائی جہازوں کو سیڑھی لگانے کا رواج نہیں ہے۔ ہوائی جہاز خود ایک ایسے گلیارے سے جا لگتا ہے، جہاں سے آپ خود بخود چلتے ہوئے راستہ پر کھڑے ہو کر کہیں بھی جا سکتے ہیں، یہاں آپ کو قلی کوئی نہیں ملے گا۔ اپنا سامان آپ اٹھایئے اور خودکار راستہ پر اسے رکھ کر کھڑے ہو جایئے۔ راستہ بھی چلے گا آپ بھی چلیں گے۔ اور سامان بھی چلے گا۔ ہم جہاں بھی جاتے ہیں، اردو شاعری ہمارے ساتھ چلی آتی ہے۔ خودکار راستہ پر چلتے ہوئے (اگر آپ اسے چلنا کہیں) ہمیں شاہد صدیقی مرحوم کا ایک شعر یاد آ گیا

ایک پل کے رُکنے سے دور ہوگئی منزل
صرف ہم نہیں چلتے ، راستے بھی چلتے ہیں

ہمیں کیا پتہ تھا کہ شاہد صدیقی کے اس شعر کی صداقت پر ایمان لانے کے لئے بالاخر ہماری قسمت میں جاپان آنا لکھا تھا۔ بڑی دیر تک راستہ چلتا رہا اور ہم ساری حیات اور ساری کائنات کو جو دو بیگس پر مشتمل تھی ساتھ لے کر چلنے کے وہم میں مبتلا رہے۔ ٹوکیو کے نریتا ہوائی اڈہ کا شمار دنیا کے سب سے اچھے اور نوجوان ہوائی اڈوں میں ہوتا ہے۔ مئی ۱۹۷۸ء میں اس ہوائی اڈہ نے کام کرنا شروع کیا اور یہ ٹوکیو کے جنوب مشرق میں ٦٦ کیلومیٹر دور واقع ہے۔ یہاں دن بھر میں کوئی ۲۰۰ ہوائی جہاز دنیا کے کئی ممالک سے آتے ہیں۔ بڑی چہل پہل اور رونق لگتی ہے۔ جاپان کی چکا چوند کر دینے والی روشنیوں سے ہماری شناسائی یہیں ہوئی۔ ہمیں کسٹم کی رسومات پوری کرنا تھیں اور ہم سخت پریشان تھے۔ اس لئے نہیں کہ ہم اپنے ساتھ افیون یا چرس لے آئے تھے بلکہ اس لئے کہ ہمارے بیگ میں جو سامان تھا وہ اس قابل نہیں تھا کہ کوئی جاپانی اسے دیکھ سکے۔ تین معمولی سے سوٹ تھے، تین بنیانیں تھیں (بشمول ایک پھٹی ہوئی بنیان کے) اور طباعت واشاعت سے متعلق کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ کسٹم کے جاپانی کلرک نے جو انگریزی جانتا تھا ہم سے پوچھا" آپ کو کچھ ڈکلیر کرنا ہے"۔ ہم نے کہا" غریب آدمی ہیں، اپنی شرافت کے سوائے اور کیا ڈکلیر کر سکتے ہیں"۔ وہ بولا" آپ کے بڑے بیگ میں کوئی قابل اعتراض چیز تو نہیں ہے۔ البتہ آپ کے ہینڈ بیگ میں کوئی چیز نظر آتی ہے"۔ موصوف نے کسی الکٹرانک آلے سے اس قابل اعتراض چیز کا پتہ چلا لیا تھا۔

ہم نے کہا" بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ ہمارے ہینڈ بیگ میں ہمارے مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے ہیں جنھیں ہم نے بس یونہی اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ چاہیں تو آپ انھیں ضبط کر لیں۔ یوں بھی جاپان میں اردو کتابوں کا کیا کام۔"

وہ بولا" آپ کی کتابوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ بے ضرری چیزیں ہیں۔ البتہ کچھ چیزیں ہیں جو سیاہ رنگ کی ہیں۔" تب ہمیں خیال آیا کہ موصوف کا اشارہ بیدری صنعت کے سامان کی طرف ہے۔ ہم جاتے ہوئے اپنے ساتھ بیدری صنعت کی کئی چیزیں جیسے جوتے کی طرح بنے ایش ٹرے، بٹن، ٹائی پن اور ڈبیاں لے گئے تھے۔ اپنے جاپانی دوستوں کو تحفے کے طور پر پیش

کرنے کے لئے۔ ہم نے فوراً اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور بیدری صنعت کا سامان نکال کر اس کی خدمت میں پیش کرنے لگے۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھتا رہا، پھر بولا "بہت خوبصورت چیزیں ہیں۔ آپ ہندوستانی اتنی خوبصورت چیزیں کیسے بنالیتے ہیں اور پھر مجھے حیرت ہے کہ اس دھات کا رنگ اتنا سیاہ کیسے ہوگیا۔"

ہم نے اپنا سینہ پھلا کر کہا "ایسی چیزیں بنانا ہم ہندوستانیوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ دھات سیاہ رنگ کی کیسے بن گئی تو بھیا! یہ ہمارا ٹریڈ سیکریٹ ہے۔ اگر آپ کو بتادیں تو ہماری کیا انفرادیت رہ جائے گی۔ ہم نے بیدری سامان میں اس کی گہری دلچسپی کو دیکھ کر ایک ایش ٹرے اس کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کی مگر اس نے لینے سے صاف انکار کردیا۔ بہت سمجھایا کہ یہ تحفہ ہے اور ہمارے ہاں کسٹم آفیسروں کو تحفے پیش کرنے کا رواج عام ہی نہیں بلکہ لازمی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ لے لیجئے۔

وہ بولا "نہیں جیسی آپ کی انفرادیت ہے ویسی ہماری بھی انفرادیت ہے۔" خیر ہم وہاں سے سامان اٹھا کر بھاگے۔ جہاں جاتے دروازے خود بخود کھل جاتے۔ جاپان کی آٹو میٹک زندگی سے یہ ہمارا پہلا واسطہ تھا۔ اگرچہ ہم ٹوکیو پہنچ چکے تھے مگر پھر بھی "ہنوز دلی دوراست" والا معاملہ درپیش تھا کیونکہ ٹوکیو ابھی ہم سے ۶۶ کیلومیٹر دور تھا۔ ایشیائی ثقافتی مرکز نے ہمیں لیموزین بس کے ٹکٹ پہلے ہی بھیج دیئے تھے اور ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ ہم ان میں بیٹھ کر ٹوکیو کے ٹی ایر ٹرمنل پہنچ جائیں اور پھر اس کی دوسری منزل کے انکوائری کاؤنٹر پر آجائیں۔ وہاں کوئی نہ کوئی ہمارا منتظر ہوگا۔ ہم نے لیموزین بس میں سامان رکھا اور بیٹھ گئے۔ جاپانی اپنی بسیں بھی ہوائی جہازوں کی طرح چلاتے ہیں۔ باضابطہ اعلان ہوتا ہے کہ یہ فاصلہ کتنی دیر میں طئے کریں گے۔ موسم اور وقت کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ ایمرجنسی کی صورت میں بس سے باہر نکلنے کی ترکیبیں بتائی جاتی ہیں۔ ڈرائیور اگرچہ موجود تھا مگر اس کا کام بٹن دبانا زیادہ اور بس چلانا کم تھا۔ اندھیرا ہو چکا تھا اور جاپانیوں کو اندھیرے سے سخت نفرت ہے لہذا اپنی سڑکوں اور گھروں کو اتنا روشن رکھتے ہیں کہ آدمی کو اپنی روشنیٔ طبع کا استعمال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ ہمیں جاپان آئے ہوئے آج ۱۳ دن ہوگئے ہیں اور اس بیچ ایک بار بھی ہمیں اپنی روشنیٔ طبع کا استعمال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ غرض روشنیوں میں جگمگاتے اور روشنیوں میں نہاتے ہوئے ہم ٹوکیو ایر ٹرمنل اسٹیشن

پہنچے۔ جاپان کی گھڑیوں میں شام کے سات بج رہے تھے اور ہماری گھڑی ہندوستان میں دن کے ساڑھے چار بجا رہی تھی۔ ہم بڑے ابن الوقت ہیں۔ لہٰذا فوراً اپنی گھڑی کو جاپانی وقت کے مطابق کیا۔ پھر اس مقررہ مقام پر پہنچے جس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ کوئی وہاں ہماری راہ میں آنکھیں بچھائے کھڑا ہوگا۔ جب ہم دوسری منزل پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک نوجوان جاپانی لڑکی ہماری تصویر اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہر مسافر کو بڑی بے تابی کے ساتھ تاک رہی ہے۔ ہمیں اس کی بے تابی بہت بھلی لگی۔ جیسے ہی اس کی نظر ہم پر پڑی، اس نے اپنی کمر کو دوہرا کیا اور ۶۰ درجہ کا زاویہ بنا کر تعظیماً جھک گئی۔ ہم نے کہا'' کمبنوا ''۔ (جاپانی میں شام کا سلام)۔

وہ بولی'' آپ حسین سان ہیں؟'' (جاپانی میں سان، صاحب کو کہتے ہیں) ہم نے اثبات میں سر ہلایا تو بولی'' میں مس کمورا ہوں، یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز سے آپ کے استقبال کے لئے آئی ہوں''۔

ہم نے کہا'' تو پھر کرو ہمارا استقبال۔''

ہنس کر بولی'' کچھ دیر توقف کیجئے۔ ایشیائی ثقافتی مرکز کے بک ڈیولپمنٹ ڈیویژن کی سربراہ مسز آسانو بھی آپ کے استقبال کے لئے آئی ہیں اور وہ دوسری طرف آپ کو دیکھنے گئی ہیں''

('' جاپان چلو، جاپان چلو۔'' ۱۹۸۰)
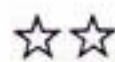
ٹوکیو میں یادِ ابنِ انشاء کی

ناظرین کرام! ہم اس وقت دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے مہنگے شہر میں ہیں۔ مہنگائی کا یہ عالم ہے کہ اس شہر میں ہمیں اپنے سوا کوئی اور سستی چیز نظر نہیں آتی۔ ٹوکیو کے نریتا ایئرپورٹ پر جب ہم اترے تھے تو تب ہی ہماری آنکھیں کھل گئی تھیں۔ جب ہم ایشیائی ثقافتی مرکز کے بک ڈویژن کی سربراہ مسز آسانو کے ساتھ ٹوکیو گرین ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے تو ہماری آنکھیں مزید کھلتی چلی گئیں۔ صاف وشفاف اور کشادہ سڑکیں روشنی میں اس طرح نہارہی تھیں کہ اگر سوئی بھی سڑک پر گری ہو تو صاف نظر آجائے۔

سجے سجائے بازاروں پر حیرت کی نظر ڈالتے ہوئے ہم ٹوکیو گرین ہوٹل پہنچے۔ یہ ہوٹل مرکزی ٹوکیو میں واقع ہے۔ مسز آسانو نے ہمیں یہ خوشخبری بھی سنائی کہ شہنشاہ جاپان کا محل بھی پڑوس ہی میں واقع ہے۔ ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ زندگی بھر ہمیں ایک اچھے پڑوسی کی تلاش رہی ہے جو کبھی میسر نہ آسکا۔ شہنشاہ جاپان کے پڑوسی بن کر کچھ دن آرام سے گزار لیں گے۔ ٹوکیو گرین ہوٹل کئی منزلہ عمارت ہے۔ ہمیں اس کی چوتھی منزل میں ایک کمرہ ملا۔ نام چونکہ گرین ہوٹل ہے اس لئے بڑا سرسبز وشاداب ہوٹل ہے۔ یہاں کی ہر چیز ہری ہے۔ کچھ دن بعد ہمیں اپنا رنگ بھی طوطے کی طرح ہرا نظر آنے لگا تھا۔ ٹوکیو کے بارے میں ہی کیا سارے جاپان کے بارے میں یہ عرض کردیں کہ جاپان کے ۸۰ فیصد علاقے پر پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں۔ ۲۰ فیصد علاقہ میدانی ہے جس پر سارے جاپانی مل جل کر رہتے ہیں۔ وہ تو اچھا ہے کہ جاپانیوں کا قد چھوٹا ہوتا ہے ورنہ

ان سب کا مل جل کر رہنا دشوار ہو جاتا۔ ادب میں ہمارا قد جو کچھ بھی ہے اس کے بارے میں آپ بخوبی جانتے ہیں۔ لیکن ہمارا جسمانی قد پھر بھی اتنا بلند نہیں ہے، بس پانچ فٹ گیارہ انچ کا قد ہے۔ پھر بھی ٹوکیو کی سڑکوں پر ہم نکلتے ہیں تو اپنی قد آور شخصیت کے باعث لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ کچھ جاپانی دوستوں کا کہنا ہے کہ جب سے ہم ٹوکیو آئے ہیں ٹوکیو بھرا پُرا سا نظر آنے لگا ہے۔ حالانکہ آبادی اور علاقہ کے لحاظ سے یہ دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ ٹوکیو کی آبادی ایک کروڑ سے زیادہ ہے اور ہر دسواں جاپانی ٹوکیو میں رہتا ہے۔ رہنے کی جگہ کی قلت کے باعث جاپانی اپنی زمین کے ایک ایک انچ کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ جاپانیوں کی ہر چیز چھوٹی ہوتی ہے سوائے کردار کے۔ ہم جس ہوٹل میں ٹھہرے ہیں خود اس کا حال سن لیجئے کہ جب ہم اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ اس میں ہر سہولت موجود ہے۔ ٹیلی ویژن ہے، ٹیلیفون ہے، کمرے سے ملحق باتھ روم بھی ہے، باتھ روم میں نہانے کا ٹب بھی موجود ہے۔ پھر پورا کمرہ ایرکنڈیشنڈ بھی ہے۔ اس میں لکھنے پڑھنے کے لئے ایک چھوٹی سی میز بھی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ایک کرسی بھی موجود ہے۔ بس ایک تکلیف یہ ہے کہ جب بھی ہم صبح اُٹھ کر اپنے بستر میں بھرپور انگڑائی لیتے ہیں (جس کی عادت ہمیں برسوں سے ہے) تو ہماری انگڑائی کبھی ٹیلی ویژن سے ٹکرا جاتی ہے اور کبھی انگڑائی میں ٹیلیفون اٹک جاتا ہے۔ دو تین دن تک اپنی انگڑائی کے ذریعے ٹیلیفون کے ریسیور کو گرانے کے بعد ہم نے اب یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ آنکھ کُھلتے ہی لپک کر ہوٹل کے کاریڈور میں چلے جاتے ہیں اور دو چار بھرپور انگڑائیاں لے کر پھر اپنے کمرے میں واپس آ جاتے ہیں۔ صرف ۳۵ دنوں تک ٹوکیو میں رہنے کی خاطر ہم اپنی برسوں کی انگڑائی سے دستبردار ہونے سے تو رہے۔ اس ہوٹل کی تنگ دامانی کا حال کبھی ہم بعد میں بیان کریں گے۔ کیوں کہ اس حال کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کرنے کے بعد ایشیائی ثقافتی مرکز کے ڈائرکٹر جنرل مسٹر یو جی ایتو نے ہمیں مزاح نگار تسلیم کر لیا تھا (آپ نے ابھی تک تسلیم نہیں کیا ہے تو ہمیں اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔ ٹوکیو والوں نے تو اردو جانے بغیر ہی ہمیں مزاح نگار مان لیا ہے، جاپانی بڑے مردم شناس ہوتے ہیں) آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم کسی معمولی ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ روزانہ پانچ ہزار 'ین' (جاپانی سکہ) ادا کرتے ہیں اور وہ بھی صرف رہنے کا (یہ کرایہ بھی یونیسکو کے مہمان کی حیثیت سے ہم سے رعایت کے ساتھ وصول کیا جاتا ہے) کھانا ہم ہوٹل میں کم ہی کھاتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں اپنی بھوک اتنی پیاری

نہیں جتنی کہ عزت ہے۔ اور باتیں بعد میں ہوں گی، پہلے مسز آسانو کا حال سنئے جو ایشیائی ثقافتی مرکز کے بک ڈویژن کی چیف ہیں، اور ہمارے خیر مقدم کے لئے بہ نفس نفیس تشریف لے آئی تھیں۔ مسز آسانو سچ مچ جہاندیدہ خاتون ہیں۔ ساری دنیا گھوم چکی ہیں۔ ہندوستان بھی کئی بار تشریف لا چکی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کے بارے میں ہم سے زیادہ جانتی ہیں۔ انھوں نے ہی ہمیں ہندوستان کے بارے میں یہ بتایا کہ ہندوستان میں چیزیں بہت سستی ہیں۔ (ہمیں یہ بات جاپان جانے تک معلوم نہیں تھی، آپ میں سے بہتوں کو تو اب بھی معلوم نہیں ہوگی) مسز آسانو نے پہلے پہل ہمیں بتایا کہ ہندوستانی بڑے مہذب، شائستہ اور ایماندار ہوتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ مسز آسانو سے ملاقات نہ ہوتی تو ہمیں اپنے وطن عزیز کے بارے میں اتنی اہم معلومات کہاں سے حاصل ہوتیں۔ ہم تیرہ گھنٹوں کے ہوائی سفر کے بعد ٹوکیو پہنچے تھے اور یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ مسز آسانو ہمارے استقبال کے لئے آئی تھیں۔ ہوٹل میں ہمارا سامان رکھوانے کے بعد بولیں "آج رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں گے"۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے۔ ہم نے کہا "مسز آسانو مانا کہ ٹوکیو میں اس وقت رات کے آٹھ بجے ہیں مگر وطنِ عزیز میں اس وقت شام کے پانچ بجے ہوں گے۔ یہ وقت تو ہمارے چائے پینے کا ہے۔ یوں بھی ہوائی جہاز میں ہم خوب ڈٹ کر کھا چکے ہیں۔ اب کھانے کی حاجت نہیں ہے۔"

بولیں "ٹوکیو میں آپ کی پہلی شام میرے ساتھ گزرے گی۔ چاہے آپ چائے پئیں یا ڈنر کھائیں"۔

ہم نے مذاق میں کہا "مسز آسانو کیا آپ کو پتہ ہے کہ اردو میں آپ کے نام کے کیا معنی ہوتے ہیں؟"

ہنس کر بولیں "مجھے پتہ ہے کہ میرا نام آسانو ہے، اور آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں ہر مشکل آسان کر دیتی ہوں"

ہم نے حیرت سے کہا "سچ مچ بتایئے آپ کو اپنے نام کے یہ اردو معنی کس نے بتائے تھے"

اپنے چہرے پر اچانک سنجیدگی طاری کر کے بولیں۔ "آپ ہی کی زبان کے ایک پاکستانی ادیب ہوا کرتے تھے جو ہمارے ایشیائی ثقافتی مرکز کے سیمناروں میں شرکت کے لئے آیا

کرتے تھے۔کئی بار وہ ٹوکیو آئے۔ بڑے زندہ دل آدمی تھے۔نام ان کا ابن انشا تھا۔آپ نے انہیں ضرور پڑھا ہوگا''۔

ہم نے کہا'' مسز آسانو! ابن انشا ہمارے محبوب اور پسندیدہ ادیب رہ چکے ہیں ملاقات ان سے کبھی نہیں ہوئی۔ ہمارے بڑے بھائی ابراہیم جلیس کے جگری دوست تھے۔اتنے جگری دوست کہ دونوں دو تین مہینوں کے وقفہ سے آگے پیچھے اس دنیا سے رخصت ہو گئے''۔

بولیں'' بڑے زندہ دل آدمی تھے، میں تو سمجھتی تھی کہ انھوں نے صرف مذاق میں اور مصلحتاً میرے نام کے یہ اردو معنی تراش رکھے تھے۔اب آپ نے بھی میرے نام کے یہی معنی بتائے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابن انشا نے میرے نام کا کوئی مزاحیہ ترجمہ نہیں کیا تھا۔ پھر آپ کا بھی کیا بھروسہ، آپ بھی تو مزاح نگار ہیں''۔

ہم نے حیرت سے کہا'' مسز آسانو! آپ کو کس نے بتایا کہ ہم مزاح نگار ہیں''۔

بولیں'' آپ ہی نے تو اپنے Bio-Data میں سب کچھ لکھا ہے۔میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں کہ آپ سور کا گوشت نہیں کھاتے۔آپ کی تاریخ پیدائش بھی مجھے زبانی یاد ہے۔''ہم مسز آسانو کی عام معلومات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً ان کے ساتھ ڈنر کھانے کے لئے چلے گئے۔

وہ بولیں'' آج رات آپ کو جاپانی ریستوراں میں نہیں ایک چینی ریستوراں میں لے جاؤں گی۔ ابھی تو آپ آئے ہیں۔ آتے ہی آپ کے جوتے کھلوانا نہیں چاہتی''۔ جاپانی ریستورانوں میں نیچے بیٹھنے کا رواج ہوتا ہے۔جن لوگوں نے حیدرآباد کے چوکی ڈنروں میں حصہ لیا ہے وہ اپنے تئیں یہ سمجھیں کہ وہ جاپانی ریستوران میں کھانا کھا چکے ہیں۔ مینو البتہ مختلف ہوتا ہے۔ہم ٹوکیو کے جس علاقہ میں ٹھہرے ہیں اسے سوئیدو باشی کہتے ہیں۔ باشی جاپانی میں پُل کو کہتے ہیں اور سارے جاپان میں آپ کو کئی باشی مل جائیں گے۔ایک علاقہ کا نام تو شاباشی سے ملتا جلتا ہے۔ٹوکیو کا پہلا کھانا ہم نے ایک چینی ریستوران میں کھایا۔

مسز آسانو نے پہلے تو ہمارے لئے سنگترے کا رس منگوایا۔ دہلی میں قیام کے بعد سے ہماری عادت یہ ہوگئی ہے کہ جب بھی سنگترے کا رس سامنے پیش کیا جاتا ہے تو اس میں کالی مرچ اور نمک ضرور ملا لیتے ہیں۔ جیسے ہی ہم نے سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملانا شروع کیا

تو مسز آسانو نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا'' حسین صاحب! عجیب اتفاق ہے کہ ابن انشا بھی سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملایا کرتے تھے۔ کیا اردو میں مزاح نگاری کرنے کے لئے سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملانا ضروری ہوتا ہے۔''

ہم نے کہا'' مسز آسانو! کہاں ابن انشا اور کہاں ہم! ہم میں اور ان میں ایک قدر مشترک یہی ہے کہ ان کی طرح ہم بھی سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملایا کرتے ہیں۔ اس کے سوائے ہمیں کچھ نہیں آتا۔ ہم صرف رس میں نمک ملاتے ہیں۔ ابن انشا اپنی تحریروں میں جتنا نمک مرچ ملاتے تھے وہ گر ہمیں نہیں آتا''۔

مسز آسانو پھر یادوں میں کھوگئیں اور بولیں'' شاید آپ کو پتہ نہیں ابن انشا پہلے پہل ٹوکیو میں ہی بیمار ہوئے تھے۔ یہیں ان کا میڈیکل چک اپ ہوا تھا۔ پھر وہ یہاں سے گئے تو ایسے گئے کہ کبھی نہیں آئے۔''

مسز آسانو کی اس بات سے ہم اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ ٹوکیو میں جب بھی ہمارے سامنے سنگترے کا رس آیا تو اس میں کبھی نمک نہیں ملایا۔

مسز آسانو نے اس رات دنیا جہان کی باتیں کیں۔ کئی ہندوستانی دوستوں کا ذکر کیا۔ کھانے کا بل آیا تو ہم نے دیکھا کہ مسز آسانو نے بڑی آسانی کے ساتھ ہنستے کھیلتے چار ہزار ین کی رقم ادا کر دی اور ہمیں آٹے دال کے بھاؤ سے آگاہ کر دیا۔

ہم ڈنر کھا کر ہوٹل واپس ہوئے تو دس بج رہے تھے۔ دوسرے دن پبلشنگ کا کورس اور سمینار شروع ہونے والا تھا۔ مسز آسانو نے وعدہ کیا کہ وہ ہمیں سمینار میں لے جانے کے لئے صبح آجائیں گی۔ اسی وقت ہماری ملاقات تھائی لینڈ کی نمائندہ مس پرینا سے ہوئی جو اسی شام تھائی لینڈ سے پہنچی تھیں۔ ہم دس بجے اپنے کمرے میں پہنچے تو افسوس ہوا کہ اے کاش ہماری اہلیہ محترمہ آج یہاں موجود ہوتیں۔ وہ دس بجے ہمیں اپنے کمرے میں دیکھ کر کتنا خوش ہوتیں اس کا اندازہ کچھ ہم ہی لگا سکتے ہیں۔ کچھ دیر ٹیلی ویژن سے دل بہلاتے رہے۔ تاہم آدھے گھنٹے سے زیادہ جی نہیں بہلا سکے۔ کیونکہ سارے پروگرام جاپانی میں ہو رہے تھے۔ ہم نے سوچا کہ جب ساری زندگی رات دیر گئے لوٹنے میں گزار دی ہے تو ٹوکیو میں اس شریفانہ وضعداری سے کیوں انحراف کیا جائے۔ اس خیال کے آتے ہی ہم اپنے کمرے سے باہر نکلے تو دیکھا کہ مس پرینا بھی اپنے

کمرے کے باہر کھڑی ہیں۔ پوچھا ''خیریت تو ہے''

بولیں ''تھائی لینڈ میں اس وقت آٹھ بجے ہوں گے اور مجھے اتنی جلدی سونے کی عادت نہیں ہے۔ بس بور ہوئی جارہی ہوں''

ہم نے کہا'' آپ کے ہاں تو آٹھ بجے ہوں گے۔ ہمارے ہاں تو ابھی سات ہی بج رہے ہیں۔ یوں بھی ہم شب بیدار قسم کے آدمی ہیں۔ لہٰذا ٹوکیو کی سڑکیں ناپنے باہر جارہے ہیں''۔

بولیں'' آپ اجازت دیں تو میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں''۔ ہم دونوں ٹوکیو گرین ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ طئے کیا کہ سڑکوں کی نشانیاں ذہن میں محفوظ کر کے چلتے ہیں تا کہ واپسی میں آسانی ہو۔ ہوٹل کے کاؤنٹر سے ٹوکیو گرین ہوٹل کا کارڈ بھی اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پہلے ایک ٹیلی فون بوتھ کی نشانی ذہن میں محفوظ رکھی کہ اس کے برابر والی گلی میں مڑنا ہے۔ بیس قدم کے بعد ایک اور بوتھ ملا۔ جاپان میں ہر سڑک پر قدم قدم پر آپ کو ٹیلی فون بوتھ ملیں گے۔

ٹوکیو اس اعتبار سے خالص ایشیائی شہر نظر آیا کہ یہ ساری رات جاگتا ہے۔ تقریباً ساری رات ہوٹلیں کھلی رہتی ہیں (حیدرآباد والے پتھر گٹی کو اپنے ذہن میں رکھیں۔) سڑکوں پر ٹریفک برابر جاری رہتا ہے۔ ہم بڑی دیر تک ٹوکیو کی سڑکوں پر گھومتے رہے۔ دو گھنٹوں بعد واپس ہوئے تو ہم سچ مچ تھک چکے تھے۔ جب ہم اپنے کمرے کی طرف جانے لگے تو مس پرینیا نے انگریزی آداب کے مطابق ہم سے کہا'' آج رات کوئی اچھا سا خواب دیکھئے۔''

ہم نے کہا'' مس پرینیا کیا کریں۔ کمرہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں کسی خواب کے داخل ہونے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔''

مس پرینیا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ بعد میں انہوں نے ہمارے اس جملے کو سمینار کے شرکاء میں اس قدر مقبول کیا کہ بالآخر اس کی اطلاع ہوٹل کے انتظامیہ تک پہنچ گئی اور انتظامیہ کے ایک فرد نے ہم سے ازراہِ مذاق یہاں تک کہا کہ اگر آپ کو خواب دیکھنے کے لئے بڑے کمرے کی ضرورت ہے تو وہ آپ کو مل جائے گا۔ دس ہزار ین کرایہ دینا ہوگا۔ (''جاپان چلو، جاپان چلو۔''۱۹۸۰)

☆☆

پروفیسر سوزوکی، اُردو اور مسز سوزوکی

جاپان میں سوزوکی بہت ہوتے ہیں۔ٹوکیو میں پہلی بار ہم جس ٹیکسی میں بیٹھے تھے اس کے ڈرائیور کا نام بھی سوزوکی تھا۔وہ جو موٹر چلا رہا تھا خود اس کا نام بھی سوزوکی ہی تھا۔ان کی ایک موٹر سائیکل کا نام بھی سوزوکی ہے۔ان دنوں جاپان کے جو وزیر اعظم ہیں وہ بھی سوزوکی ہی کہلاتے ہیں۔جاپان کی یونیورسٹی برائے خواتین میں جب ہمارا خیر مقدم ہوا تو ہماری دیکھ بھال اور ہماری انگریزی کا جاپانی میں ترجمہ کرنے کے لئے جو خاتون مقرر ہوئیں وہ بھی اتفاقاً مسز سوزوکی ہی تھیں۔ بہت بھلی خاتون ہیں۔ ہندوستان بھی آ چکی ہیں۔ان کا ذکر ہم بعد میں تفصیل سے کریں گے۔ بہرحال جاپان میں قدم قدم پر آپ کو سوزوکی ملیں گے۔اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ زندگی میں جس پہلے جاپانی دوست سے ہماری ملاقات ہوئی تھی وہ بھی سوزوکی ہی تھے۔ہماری مراد ہے پروفیسر سوزوکی سے جو ٹوکیو یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات میں اُردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں۔

۱۹۷۳ء میں ان سے ہماری ملاقات دہلی کے جن پتھ ہوٹل میں ہوئی تھی۔ ہمارے دوست اور کرم فرما حسن الدین احمد بھی اس رات موجود تھے۔پروفیسر سوزوکی اپنے مقالے کی ریسرچ کے سلسلے میں کچھ دنوں کے لئے ہندوستان آئے تھے اور انہوں نے ہمیں رات کے کھانے پر بلایا تھا۔ہم اور حسن الدین احمد جب ان سے ملنے کے لئے جن پتھ ہوٹل پہنچے تو ہندوستان کی روایت کے مطابق اچانک بجلی فیل ہوگئی۔ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ پروفیسر سوزوکی نے ہم سے

مصافحہ کرتے ہوئے ٹھیٹ جاپانی لہجے میں میرؔ کا یہ شعر سنایا تھا۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ہم اُس وقت تک جاپان نہیں گئے تھے بلکہ کسی جاپانی سے کبھی ملاقات ہی نہیں کی تھی۔ ایک جاپانی کے منہ سے میر کا شعر سن کر ہمارے دل و دماغ میں روشنی تو ضرور پیدا ہوئی تھی لیکن دل و دماغ کی روشنی سے کسی کا چہرہ تو نہیں دیکھا جا سکتا۔ دہلی میں معمول ہے کہ جب بجلی چلی جاتی ہے تو بس چلی ہی جاتی ہے۔ جلد واپس آنے کا نام نہیں لیتی۔ پروفیسر سوزوکی کے ساتھ ہماری وہ رات اندھیرے میں ہی گزری تھی۔ نہ انہوں نے ہمیں جی بھر کے دیکھا اور نہ ہم نے انھیں۔ جن پتھ ہوٹل کے ڈائیننگ ہال میں ہم نے موم بتیوں کی روشنی میں رات کا کھانا کھایا تھا۔ پروفیسر سوزوکی نے کھانے سے پہلے کچھ مشروبات کا آرڈر دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''آج کی رات کھانے سے پہلے کوئی نہ کوئی شربت پینا ضروری ہے۔ کیونکہ ایک شربت جسے اردو والے زیادہ پیتے ہیں وہ آج ہم پی نہیں سکتے''۔

ہم نے پوچھا تھا'' پروفیسر سوزوکی! آپ کا اشارہ کس شربت کی طرف ہے؟''۔ ہنس کر بولے'' میری مراد شربتِ دیدار سے ہے۔ بجلی کو فیل ہوئے دو گھنٹے ہو چکے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آج رات نہ ہم آپ کو دیکھ سکیں گے اور نہ آپ ہمیں''

پروفیسر سوزوکی کو دوسرے دن صبح کے ہوائی جہاز سے حیدرآباد جانا تھا اور وہاں کچھ دن رُک کر گلبرگہ جانا تھا، ہم نے پروفیسر سوزوکی سے کہا تھا'' پروفیسر سوزوکی! آپ اُس جگہ جا رہے ہیں جہاں کے ہم نکالے ہوئے ہیں۔ حیدرآباد میں زندگی کے بیس برس گزارے اور گلبرگہ تو ہماری جائے پیدائش ہے۔ وہاں بھی اپنی زندگی کا خاصا وقت برباد کر چکے ہیں۔ ہم نے اندھیرے میں انہیں جناب عابد علی خان ایڈیٹر'' سیاست'' اور بزرگ دوست سلیمان خطیب کے پتے دیئے تھے کہ ان مقامات پر جایئے تو ان حضرات سے ضرور ملیئے۔ آپ کی ریسرچ ٹھکانے لگ جائے گی۔ بہر حال ۱۹۷۳ء میں پروفیسر سوزوکی نے ہمیں اپنا وزیٹنگ کارڈ دیتے ہوئے کہا تھا'' مجھے افسوس ہے کہ آپ کا دیدار نہیں کر سکا۔ پھر بھی میرا وزیٹنگ کارڈ اپنے پاس رکھئے۔ کم از کم آپ سے خط و کتابت تو ہوتی رہے گی اور کیا عجب کہ کبھی آپ جاپان بھی آجائیں''۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ

پروفیسر سوزوکی اس وقت صرف ایک رسمی خواہش کا اظہار نہیں کر رہے تھے بلکہ ہمارے حق میں دعا فرما رہے تھے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان کی دعا پورے سات سال بعد قبول ہو جائے گی اور ہم یوں اچانک جاپان چلے جائیں گے۔ ہم نے رسماً ان سے وزیٹنگ کارڈ لے لیا تھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ اس لئے نہیں دیا تھا کہ ہمارا کوئی وزیٹنگ کارڈ ہی نہیں تھا۔ زندگی میں ایک بار ہم نے اپنے وزیٹنگ کارڈ چھپوائے تھے اور انہیں لوگوں میں تقسیم بھی کئے تھے۔ اس کے بعد ہمیں احساس ہوا تھا کہ بعض لوگ 'وزیٹنگ کارڈ' کو خواہ مخواہ سنجیدہ لے لیتے ہیں۔ ان وزیٹنگ کارڈوں کے حوالے سے ہمارے تعلقات کا حلقہ خواہ مخواہ وسیع ہونے لگا تھا۔ یوں بھی ہمارا دائرہ احباب کچھ کم وسیع نہیں ہے کہ ہم اسے اور وسیع کرتے۔ لہٰذا بعد میں وزیٹنگ کارڈ کے جھنجھٹ میں نہیں پڑے۔ ہمارا اصول یہ ہے کہ نئے لوگوں سے ضرور ملو لیکن انہیں اپنے گھر کا پتہ نہ بتاؤ۔ اس سے زندگی بڑی پرسکون رہتی ہے۔ مگر پروفیسر سوزوکی چونکہ بیرونی باشندے تھے اور اس پر مستزاد یہ کہ جاپان میں اردو کی خدمت کر رہے تھے، اسی لئے ہم نے ہندوستانی روایت کے مطابق سگریٹ کی ڈبیہ کے ایک ٹکڑے پر اپنا نام اور پتہ لکھ کر دے دیا تھا کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آوے۔

پروفیسر سوزوکی دوسرے دن حیدرآباد چلے گئے۔ بعد میں ''سیاست'' میں ان کا ایک انٹرویو بھی نظر سے گزرا۔ گلبرگہ سے سلیمان خطیب کا خط بھی آیا کہ جاپان کے پروفیسر سوزوکی گلبرگہ آئے تھے۔ ہم سے زیادہ اردو جانتے ہیں اور صوفیائے کرام کی تعلیمات کے بارے میں بھی ہم سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ (اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے)

پروفیسر سوزوکی اُن دنوں ہندوستان کے صوفیائے کرام کی اُردو خدمات پر ریسرچ کرنے کے لئے آئے تھے۔ بات آئی گئی ہوگئی مگر پروفیسر سوزوکی کے خلوص کے ہم اس وقت قائل ہوگئے جب انھوں نے جاپان جا کر چار مینار سگریٹ کی ڈبیہ پر لکھے ہوئے ہمارے پتے پر شکریہ کا ایک خط لکھا۔ (جاپانی بہت سنجیدگی کے ساتھ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہم نے جاپان جا کر دیکھا کہ بیچارے جاپانیوں کی زندگی کا بڑا حصہ صرف شکریہ ادا کرنے میں گزر جاتا ہے۔ اس کے بارے میں کبھی الگ سے لکھیں گے۔ شکریہ) ہم نے آپ کا شکریہ جو سراسر بے موقع ہے محض اس لئے ادا کیا ہے کہ جاپان آنے کے بعد سے ہمیں بھی شکریہ ادا کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ شکریہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب ہم جاپان جانے لگے تو ہمارے ذہن میں صرف دو شخصیتیں تھیں۔ایک شخصیت پروفیسر سوزوکی کی اور دوسری شخصیت مسز اندو جین کی۔مسز اندو جین ہندی کی مشہور شاعرہ ہیں اور دہلی ٹیلی ویژن سے بھی وابستہ رہ چکی ہیں۔دہلی میں ہمارے قیام کے بعد سے ان سے ہماری یاد اللہ ہے۔پچھلے دو برسوں سے وہ ٹوکیو یونیورسٹی میں جاپانیوں کو ہندی پڑھا رہی ہیں۔ان کا پتہ ہمارے پاس تھا مگر پروفیسر سوزوکی کے پتے کی فکر تھی۔ہمیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ پروفیسر سوزوکی آیا اب بھی صوفیائے کرام کی تعلیمات پر ریسرچ کر رہے ہیں یا خود صوفی بن گئے ہیں۔ان کی دعا کی قبولیت کے بعد ہمیں موخرالذکر امکان زیادہ قوی نظر آنے لگا تھا۔خیر ہم نے ٹھان لیا تھا کہ تجھے ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔لہٰذا ٹوکیو پہنچتے ہی پہلی ہی رات کو ہم نے مسز آسانو سے کہ موصوفہ ہر مشکل آسان کر دیتی ہیں پروفیسر سوزوکی تاکیشی کا ذکر کیا اور کہا کہ ہندوستان میں ہم چونکہ انہیں دیکھ نہیں سکے تھے اب جاپان آئے ہیں تو لگے ہاتھوں دیکھ لینا چاہتے ہیں۔ بولیں میں پروفیسر سوزوکی کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ٹوکیو یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات میں اُردو کے صدر شعبہ ہیں۔ابن انشا بھی ٹوکیو آتے تھے تو سب سے پہلے پروفیسر سوزوکی تاکیشی سے ہی ربط پیدا کرتے تھے۔

چنانچہ مسز آسانو نے دوسرے ہی دن فون پر پروفیسر سوزوکی سے ہمارا رابطہ قائم کروا دیا۔پروفیسر سوزوکی کی یادداشت کے ہم اُس وقت قائل ہو گئے جب ہم نے اپنا نام بتایا تو دوسری طرف سے بولے "ارے مجتبیٰ صاحب! آپ جن پتھ ہوٹل کے اندھیرے میں سے اُٹھ کر ٹوکیو کی روشنیوں میں کدھر آ نکلے۔مجھے وہ رات اب تک یاد ہے۔آپ سے جلد از جلد کب ملاقات ہو سکتی ہے تاکہ میں شربت دیدار پی سکوں۔"

ہم نے کہا "آج ٹوکیو میں ہمارا پہلا دن ہے۔یونیسکو کے سمینار میں آئے ہیں۔ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ ہم کہاں ہیں اور آپ کہاں ہیں۔ذرا سنبھل جائیں اور یونیسکو کا پروگرام معلوم ہو تو فون پر ملاقات کا وقت طے کر لیں گے۔"

وہ بولے "ٹوکیو یونیورسٹی میں ہم آپ کا خیر مقدم کرنا چاہتے ہیں۔ پورا ایک دن ہمارے لئے خالی رکھئے"۔ہم نے انھیں ہوٹل کا پتہ اور فون نمبر دے دیا اور جواباً ان کا فون نمبر اور پتہ لے لیا۔بعد میں مسز آسانو نے بتایا کہ پروفیسر سوزوکی کا گھر ٹوکیو کے مضافات میں واقع

ہے۔ یونیورسٹی اگر چہ بہت قریب یعنی ۳۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ مگر یہ دن کے وقت کھلی رہتی ہے اور آپ کا سمینار بھی اسی وقت چلتا ہے لہٰذا آٹھ دس دن تک پروفیسر سوزوکی سے ملاقات کا کوئی امکان نہیں۔ مایوس ہو کر ہم نے فون کا سہارا لیا۔ بعد میں تقریباً ہر روز پروفیسر سوزوکی فون پر ہم سے اُردو بولتے تھے اور ہم اُن سے۔

ٹوکیو میں ہمارے قیام کو ابھی تین دن ہی ہوئے تھے کہ ایک رات دیر سے ہوٹل پہنچے تو پیغام ملا کہ کوئی صاحب ہیروشی ہاگیتا تھے جو ہم سے ملنے آئے تھے اور ہم سے ملاقات نہ ہونے پر سلیس اُردو میں اظہار افسوس بھی کیا تھا گویا بہت ہی اظہار افسوس کیا تھا۔ متاثر کن بات یہ دکھائی دی کہ انہوں نے ہمارا نام بالکل صحیح لکھا تھا۔ خود اُردو جاننے والے ہمارا نام صحیح نہیں لکھ سکتے۔ ایک جاپانی سے یہ توقع نہ تھی۔

دوسرے دن ہم نے پروفیسر سوزوکی کو فون کیا کہ کوئی صاحب ہیروشی ہاگیتا ہم سے ملنے آئے تھے۔ ہم تو انہیں نہیں جانتے۔ پروفیسر سوزوکی بولے" میں انہیں جانتا ہوں۔ وہ میرے طالب علم ہیں۔ اُردو میں ایم اے کر رہے ہیں۔ کل رات میں اپنے طلباء کے ساتھ آپ کے ہوٹل پر آیا تھا مگر آپ غائب تھے۔" (ہیروشی ہاگیتا اب ٹوکیو یونیورسٹی میں اُردو کے اُستاد ہیں)

ٹوکیو یونیورسٹی میں ہمارا خیر مقدم بارہ دن بعد ہوا مگر اس وقت تک جاپانی ٹیلیفون پر خوب اُردو بولی گئی بلکہ گھنٹوں بولی گئی اور ایک دن اسی ٹیلیفونی اُردو کے باعث ہم ایک مشکل صورت حال سے دوچار ہو گئے اور بے حد شرمندہ ہوئے۔

ہم نے مضمون کے آغاز میں سوزوکیوں کی کثرت کے پسِ منظر میں مسز سوزوکی کا ذکر کیا ہے جن سے ہماری ملاقات جاپان کی یونیورسٹی برائے خواتین میں ہوئی تھی۔ بات دراصل یہ ہوئی کہ ٹوکیو پہنچنے کے چار پانچ دن بعد ہی جاپان کی زنانہ یونیورسٹی میں ہمارا خیر مقدم طے ہو گیا۔ (ہمیں کیا پتہ تھا کہ جاپانی خواتین کو ہمارا خیر مقدم کرنے کی جلدی ہے) اس خیر مقدم کی تفصیل بعد میں لکھیں گے۔ اس وقت اتنا سن لیجئے کے زنانہ یونیورسٹی میں ہماری انگریزی کا جاپانی ترجمہ کرنے کی ذمہ داری مسز سوزوکی کی تھی جو اسی یونیورسٹی میں پڑھاتی ہیں۔ بہت مخلص خاتون ہیں۔ زنانہ یونیورسٹی میں ہم چھ گھنٹوں تک رہے۔ لنچ بھی لڑکیوں کے جھرمٹ میں کھایا۔ مسز سوزوکی نے ہمیں اپنا پتہ اور ٹیلیفون نمبر دیا اور خواہش کی کہ ہم جلدی ہی فون کر کے اُن سے ملاقات کا وقت

طئے کرلیں۔ جاپان میں ہمارا معمول یہ ہے کہ ہم اردو بولنے کی چاٹ میں صبح اٹھکر پہلے پروفیسر سوزوکی کو فون کرتے ہیں۔ لہٰذا دوسرے دن علی الصبح ہم نے پروفیسر سوزوکی کو فون کرنے کی غرض سے غلط فہمی میں مسز سوزوکی کا فون نمبر ملالیا۔ دوسری طرف سے ایک خاتون کی آواز آئی تو ہم نے انگریزی میں پوچھا ''آپ کون بول رہی ہیں؟''۔ دوسری طرف سے انگریزی میں جواب آیا ''میں مسز سوزوکی بول رہی ہوں''۔ ہم نے اپنا تعارف کرایا تو بیحد خوش ہوئیں۔ بولیں ''میں آپ کے فون کا انتظار ہی کررہی تھی''۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے حیران رہ گئے کہ پروفیسر سوزوکی کی بیوی کو ہمارے فون کا انتظار کیوں تھا۔ پھر سوچا غالباً پروفیسر سوزوکی نے اپنی بیگم صاحبہ کو ہماری آمد کے بارے میں بتایا ہوگا۔ بات چیت جاری رہی۔ مسز سوزوکی نے پہلے تو ہمارا حال پوچھا۔ طبیعت کے بارے میں استفسار فرمایا۔ یہ بھی پوچھا کہ رات آپ کو نیند برابر آئی یا نہیں۔ کوئی تکلیف ہو تو بتائیے میں اسے دور کئے دیتی ہوں۔ اور پھر یہ بتائیے کہ آپ کی ہماری ملاقات کب ہوگی''۔

آپ جانتے ہیں کہ ہم بڑے شریف آدمی ہیں۔ دوستوں کی بیویوں سے زیادہ باتیں نہیں کرتے۔ جب ہماری ذات میں مسز سوزوکی کی دلچسپی بڑھنے لگی تو ہم نے راست انداز میں کہا ''مسز سوزوکی آپ سے ملاقات تو ضرور ہوگی۔ لیکن ذرا پہلے اپنے شوہر سے ہماری بات کروائیے۔ یوں بھی ہم اُردو بولنے کے لئے بے حد بے چین ہیں۔''

مسز سوزوکی ذرا پریشان ہوکر قدرے توقف کے بعد بولیں ''میرے شوہر! میرے شوہر سے آپ بات کرکے کیا کریں گے؟''

ہم نے کہا ''ایک ضروری بات کرنی ہے۔ پھر اُردو بھی بولنی ہے''۔

مسز سوزوکی بولیں ''مگر وہ تو اُردو نہیں جانتے''۔

ہم نے کہا ''مسز سوزوکی! اب مذاق چھوڑیئے۔ آپ اپنے شوہر کو نہیں جانتیں۔''

مسز سوزوکی بولیں ''میں مذاق نہیں کررہی ہوں۔ سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ اُردو نہیں جانتے بلکہ وہ آپ کو بھی نہیں جانتے''۔

ہم نے کہا ''کیا بات کرتی ہیں آپ بھی۔ ان سے ہندوستان میں ہماری ملاقات ہو چکی ہے۔ ٹوکیو آنے کے بعد ہم روزان سے فون پر بات کرتے ہیں''۔

مسز سوزوکی بولیں ''اگر یہ بات تھی تو کل جب زنانہ یونیورسٹی میں آپ سے ہماری

ملاقات ہوئی تھی تو آپ نے اس راز کو کیوں پوشیدہ رکھا۔ ذرا رکیئے میں اپنے شوہر کو ابھی بلاتی ہوں۔'' اپنے شوہر کو بلانے کے لئے جب فون کا ریسیور اُنہوں نے رکھا تو اچانک ہمیں احساس ہوا کہ یہ وہ مسز سوزوکی ہیں جن سے کل زنانہ یونیورسٹی میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ سوزوکیوں کی بہتات میں ہم نے فون کا غلط نمبر ملا لیا تھا اور بیچاری مسز سوزوکی کو پریشان کر رہے تھے۔ مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ چارو نا چار فون کا ریسیور پکڑے رہے۔ دو منٹ کے وقفے کے بعد پھر فون پر مسز سوزوکی آئیں۔ انہوں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا'' مسٹر حسین! اس وقت تو میرے شوہر باہر گئے ہوئے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ آپ میرے شوہر سے بات کریں میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔''

ہم نے حد سے زیادہ ندامت کے لہجے میں کہا'' مسز سوزوکی! ہمیں معاف کر دیجئے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کے شوہر سے کبھی بات نہیں کریں گے۔ اصل میں ہمیں غلط فہمی ہوگئی ہے۔ ہم ٹوکیو یونیورسٹی کے پروفیسر سوزوکی کو فون ملانا چاہتے تھے مگر غلطی سے آپ کا نمبر ملا بیٹھے۔ ڈائری میں مسٹر اور مسز کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ مسافر ہیں۔ ٹوکیو میں نئے نئے آئے ہیں۔ سوزوکیوں کی کثرت سے پریشان ہوگئے ہیں۔ خدا کے لئے ہمیں معاف کر دیجئے۔''

مسز سوزوکی نے فون پر اطمینان کا لمبا سانس لے کر پہلے تو زوردار قہقہہ لگایا پھر بولیں '' چلئے اس غلط فہمی میں آپ سے بات تو ہوگئی۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ میں بہت پریشان تھی کہ آپ نہ جانے میرے شوہر سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟''

فون کا ریسیور رکھ کر ہم اتنے نادم ہوئے کہ بڑی دیر تک اپنی پیشانی پر پسینے کے قطرے پونچھتے رہے۔ بعد میں پروفیسر سوزوکی کو اس حادثہ کی اطلاع دی تو بہت خوش ہوئے۔ بولے '' آپ کے حق میں یہ حادثہ ناخوشگوار ہوگا مگر میرے لئے تو خوشگوار ہے۔''

('' جاپان چلو، جاپان چلو۔'' ۱۹۸۰)

جاپان میں اُردو

صاحبو! ان دنوں ہندوستان کے سوائے ہر جگہ اُردو کی تلاش جاری ہے۔ امریکہ میں اُردو، برطانیہ میں اُردو، خلیجی ممالک میں اُردو، سنگاپور میں اُردو اور رنگون میں اُردو جیسے مضامین تو آپ نے پڑھے ہونگے۔ ابھی حال ہی میں ایک صاحب نے نائجیریا تک میں اُردو کی تلاش کی ہے۔ ان حالات میں یہ ناممکن تھا کہ ہم جاپان جاتے اور وہاں اُردو کو تلاش نہ کرتے۔ بفضلِ تعالیٰ جاپان میں تو اچھی خاصی اُردو موجود ہے بلکہ اتنی اُردو موجود ہے کہ ہمیں وہاں اُردو کو تلاش کرنا نہیں پڑا بلکہ اُردو نے خود ہمیں تلاش کرلیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب جاپانی اُردو کے کرتا دھرتاؤں کو پتہ چلا کہ ہم جاپان آئے ہوئے ہیں تو انہوں نے ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک اُردو والا دوسرے اُردو والے کے ساتھ کرتا ہے یعنی فوراً ہمارے خیر مقدمی جلسہ کا اہتمام ہوگیا۔ اس کے ذمہ دار ہمارے دوست سوزوکی تاکیشی تھے جو ٹوکیو یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات میں اُردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں۔ اُردو ماحول اور اُردو تہذیب میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ انہیں دیکھ کر حسرت ہوتی ہے کہ اے کاش ہم بھی اُردو کے لئے اتنا کچھ کرسکتے۔ ابھی حال ہی میں انہوں نے اوساکا یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات کے اُردو استاد پروفیسر اسادہ کے اشتراک سے ایک جاپانی اُردو لغت مرتب کی ہے۔ پروفیسر سوزوکی اپنی یونیورسٹی میں فوراً ہمارا خیر مقدم کرنا چاہتے تھے لیکن آپ تو جانتے ہیں کہ اُردو کے ہر اچھے اور سچے کام میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ سو جاپان میں بھی یہی ہوا۔ یونیسکو والوں نے ہمارا پروگرام اتنا کسا ہوا بنایا تھا کہ جاپان پہنچنے کے بعد کئی دن

تک بھی ہم اپنا خیر مقدم نہ کروا سکے۔ عجیب بے چینی کا عالم تھا۔ ہم نے یونیسکو والوں سے گڑگڑا کر کہا کہ خدا را ہماری ایک دو پہر خالی رکھی جائے تا کہ ہم ٹوکیو یونیورسٹی میں اپنا خیر مقدم کروا آئیں۔ یوں بھی آج تک کسی یونیورسٹی میں ہمارا خیر مقدم نہیں ہوا ہے۔ اب جاپانیوں کی غفلت سے ایک موقع ہاتھ آیا ہے تو اس میں یونیسکو اپنی ٹانگ اڑا رہا ہے۔ کہنے کو رہ جائے گا کہ کسی یونیورسٹی میں کبھی ہمارا بھی خیر مقدم ہوا تھا ورنہ یونیورسٹیوں سے ہمارا کیا تعلق۔ جب یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تو تب بھی یونیورسٹی سے بے تعلق اور بے نیاز سے رہتے تھے۔ ہماری لگاتار عاجزیوں نے بالآخر یونیسکو کے عہدہ داروں کے دل میں ہمارے لئے رحم کا جذبہ پیدا کر دیا اور ایک دن ہم سچ مچ اپنا خیر مقدم کروانے کے لئے ٹوکیو یونیورسٹی کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ پروفیسر سوزوکی نے کہہ رکھا تھا کہ ہم ٹھیک دو بجے شعبہ اُردو میں پہنچ جائیں۔ مگر اپنا خیر مقدم کروانے کی ہمیں کچھ اتنی جلدی تھی کہ ڈیڑھ بجے ہی یونیورسٹی کے سینہ پر مونگ دلنے کے لئے جا پہنچے۔ تھوڑی دیر کے لئے احساس بھی ہوا کہ جاپانی وقت کے پابند ہوتے ہیں۔ کوئی کام وقت سے پہلے یا وقت کے بعد نہیں کرتے۔ اگر ہم آدھا گھنٹہ پہلے بھی پہنچ گئے تو ہمارا خیر مقدم مقررہ وقت سے پہلے نہیں کریں گے۔ بہر حال پروفیسر سوزوکی کے کمرے کے باہر ایک بورڈ پر فارسی رسم الخط میں لکھا تھا ''خوش آمدید مجتبیٰ حسین۔'' ہم کمرے کے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ تین چار جاپانی لڑکیاں اپنے سامنے اُردو کی کتابیں پھیلائے بیٹھی ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی ان لڑکیوں نے کہا ''السلام علیکم''۔ ہم نے وعلیکم السلام کے بعد انگریزی میں پوچھا کہ پروفیسر سوزوکی کہاں ہیں تو ایک لڑکی نے نہایت سلیس اُردو میں کہا ''وہ تو دو بجے ہی یہاں آئیں گے کیوں کہ آپ کا استقبال تو دو بجے ہونا ہے۔ پروفیسر سوزوکی ایم۔اے کی کلاس لینے گئے ہیں۔'' ہم پر دو باتوں کی وجہ سے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اوّل تو وقت سے پہلے پہنچنے پر اور دوسرے یہ کہ جب جاپانی لڑکیاں اُردو بول رہی ہیں تو ہم نے کیوں خواہ مخواہ اپنی انگریزی دانی کا مظاہرہ کیا۔ ہم نے ان لڑکیوں سے پوچھا ''آپ اُردو پڑھتی ہیں۔'' ایک طالبہ مسز شاشورے نے بتایا کہ وہ ٹوکیو یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔اے کر رہی ہیں اور ماشاءاللہ عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری پر مقالہ لکھ رہی ہیں۔ عصمت چغتائی کی ساری کتابیں موصوفہ کے سامنے تھیں۔ بعض کتابیں ایسی بھی تھیں جن کا دیدار خود ہم نے کبھی نہیں کیا تھا۔ ایک اور بی بی تاکاناشے کے سامنے کرشن چندر کی کتابیں ''شکست'' ''پودے''

اور ''جب کھیت جاگے'' رکھی تھیں۔ ہم خط کا مضمون لفافہ دیکھ کر بھانپ لیتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے پوچھا ''اور بی بی آپ غالباً کرشن چندر پر ریسرچ کر رہی ہیں۔'' اثبات میں سر ہلا کر بولیں ''کرشن چندر میرے پسندیدہ ادیب ہیں۔ کیا آپ کی کبھی کرشن چندر سے ملاقات ہو چکی ہے''۔

ہم نے ڈینگ مارنے کے انداز میں کہا ''بی بی! اگر کرشن چندر آپ کے محبوب ادیب ہیں تو ہم نہ صرف کرشن چندر کے بلکہ عصمت چغتائی کے بھی محبوب ادیب رہ چکے ہیں''۔

ہماری بات کو سن کر دونوں طالبات کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ بولیں ''کیا سچ مچ آپ کرشن چندر اور عصمت چغتائی سے مل چکے ہیں۔ یہ تو بڑی عظیم ہستیاں ہیں''۔

بعد میں پانچ سات منٹ تک ہم نے ان طالبات کو اُردو ادب میں اپنے صحیح مقام سے آگاہ کیا۔ اُردو ادب کے لئے اپنی گراں قدر خدمات ان کے گوش گزار کیں۔ یہ بھی کہا کہ ہم بھی کچھ کم عظیم ہستی نہیں ہیں۔

مسز شاشورے بولیں ''اگر آپ عصمت چغتائی کو سچ مچ جانتے ہیں تو میرا ایک کام کر دیجئے۔ مجھے ان کی کتاب 'دھانی بانکیں' نہیں مل رہی ہے۔ کیا آپ ان سے کہہ کر یہ کتاب میرے لئے بھجوا دیں گے''۔

ہم نے جھوٹ موٹ کہا ''آپ اطمینان رکھیں ہندوستان جانے کے بعد ہم عصمت چغتائی کو اس سلسلہ میں بتائیں گے اور آپ کو یہ کتاب مل جائے گی''۔

مسز شاشورے نے پوچھا ''آپ ہندوستان کے کس علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں؟''

ہم نے کہا ''بی بی! ویسے تو ہم ان دنوں دہلی میں رہتے ہیں لیکن اصل میں ہمارا تعلق حیدرآباد سے ہے۔ کبھی آپ نے نام سنا ہے''۔

بولیں ''حیدرآباد تو میرا محبوب شہر ہے۔ میں وہاں جا چکی ہوں۔ چار مینار کا شہر۔ معصوم سیدھے سادے اور خوش اخلاق لوگوں کا شہر''۔

ہم نے کہا ''اتنی کم عمری میں آپ کو حیدرآباد جانے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟''۔

بولیں ''جاپان کی یونیورسٹیاں اپنے طلباء کو اس علاقہ اور ماحول میں ضرور بھیجتی ہیں جس علاقہ اور ماحول کی یہ زبان سیکھ رہے ہوتے ہیں''۔

بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ ٹوکیو یونیورسٹی کے اُردو پڑھنے والے سارے طلباء ہندوستان

اور پاکستان کے کئی شہروں کا دورہ کر چکے ہیں۔

مسز شاشورے نے ہم سے پوچھا "کیا آپ کبھی حیدرآباد جاتے ہیں؟"۔ ہم نے اثبات میں جواب دیا تو بولیں "اگلی بار آپ جب بھی حیدرآباد جائیں تو چار مینار کے پچھلی کمان والے اور لاڑ بازار کے برابر والے مینار پر میرا نام ضرور تلاش کریں۔ میں نے اُردو رسم الخط میں اپنا نام وہاں کھودا تھا۔"

ہم نے کہا "بی بی! حیدرآباد میں اپنی زندگی کے بیس برس گزارنے کے باوجود آج تک ہم کبھی چار مینار پر نہ جاسکے۔ اب آپ کی خاطر جائیں گے۔ مگر یہ آپ کو اپنا نام وہاں لکھنے کی کیا سوجھی۔ اب ہم بھی جواباً اپنا نام آپ کے ٹوکیو ٹاور پر اُردو رسم الخط میں لکھ کر جائیں گے"۔

بولیں "جاپان میں آپ یہ نہ کرسکیں گے۔ کیوں کہ ہمارے یہاں عمارتوں کو تصنیف و تالیف کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا۔ آپ کے ہاں یہ رواج ہے کہ جہاں کہیں کوئی تاریخی عمارت دیکھی اس پر اپنا نام لکھ دیا۔ میں نے بھی چار مینار پر اپنا نام محض اس لئے لکھا تھا کہ وہاں چار پانچ اصحاب پہلے ہی سے اپنے ناموں کو کندہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید آپ کے ہاں ایسا کرنے کا دستور ہے۔"

اس کا جواب مسز شاشورے کو ہم کیا دے سکتے تھے۔ لہٰذا خاموش ہو گئے۔ تاہم حیدرآبادیوں سے ہماری گزارش ہے کہ اگر انہیں یہ نام چار مینار پر دکھائی دے تو ہمیں ضرور اطلاع کریں۔ ہم مسز شاشورے کو اس کی اطلاع دیدیں گے۔ بے چاری بہت بے چین ہیں۔ آپ کے حق میں دعا کریں گی۔

اتنے میں کچھ اور طلباء وہاں آ گئے۔ ایک لڑکی کتابوں کا بوجھ لادے اچانک کمرے میں آئی اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بولی "میں آیکو آدکی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ آج کی محفل میں نہ رہ سکوں گی۔ مجھے ایک ضروری کام ہے۔ آپ سے معذرت کرنے آئی ہوں۔"

ہم نے پوچھا "آپ کونسی کلاس میں پڑھتی ہیں؟"

شرما کر بولیں "جی میں فارسی کی پروفیسر ہوں۔ پڑھتی نہیں پڑھاتی ہوں۔"

جاپانیوں کی عمر کا اندازہ لگانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ ہم اپنی مترجم ساکورادا کے بارے میں یہ سمجھتے تھے کہ موصوفہ غیر شادی شدہ ہونگیں۔ جب شناسائی بڑھی تو پہلے یہ پتہ چلا کہ دوسری

جنگِ عظیم میں ٹوکیو میں موجود تھیں ۔ بعد میں ایک بار وہ ہمیں اپنے گھر لے گئیں تو دیکھا کہ گھر میں ان ہی کی عمر کی ان کی ایک بیٹی اور دو بیٹے موجود ہیں ۔ جاپانی بہت عمر چور ہوتے ہیں اس لئے آدمی کو بہت محتاط رہنا چاہیے ۔

پروفیسر سوزوکی ٹھیک دو بجے کمرے میں آئے تو ان کے ساتھ مہمانوں کا ایک جم غفیر آ گیا۔ ہندی کے پروفیسر تنا کا اور ہندوستانی تاریخ کے پروفیسر مسٹر ناکامورا بھی آ گئے ۔ پروفیسر سوزوکی نے ٹوکیو میں اردو اور ہندی سے سروکار رکھنے والی ساری شخصیتوں کو جمع کرلیا تھا۔ ریڈیو جاپان کے ہندی شعبہ کے سربراہ مسٹر اناہارا بھی آ گئے ۔ اوساکا یونیورسٹی کے اُردو استاد مسٹر اسادہ بھی موجود تھے ۔ مسٹر ست پرکاش گاندھی بھی وہاں ملے جو ٹوکیو یونیورسٹی میں اُردو کے استاد ہیں ۔ پروفیسر سوزوکی کے چہیتے شاگرد ہیروشی ہاگیتا بھی ملے جو اُردو ادب کو سکھوں کی دین پر ریسرچ کر رہے ہیں ۔ وہیں ایک صاحب مساوسوزوکی ملے جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ ایک خانگی کمپنی سلک روڈ پبلیشنگ کمپنی میں ملازمین کو اُردو پڑھاتے ہیں ۔ غرض ہر طرف اُردو بولنے والے موجود تھے ۔ ہمیں بڑا سکون محسوس ہوا۔

پروفیسر تنا کا چونکہ ہندی کے پروفیسر ہیں اس لئے ہم نے ان سے پوچھا'' آپ کے ہندی وبھاگ میں کتنے ودیارتھی شکشا پراپت کر رہے ہیں؟'' ۔

بولے'' میرے شعبہ میں ساٹھ طلباء زیرِ تعلیم ہیں'' ۔ ان کے منہ سے نہایت فارسی آمیز ہندی سن کر ہم بھونچکے رہ گئے ۔ جاپان ریڈیو کے مسٹر اکی را اناہارا سے ہم نے پوچھا'' اور مہاشے جی آپ کے ریڈیو سے ہندی پرسارن کس سمئے ہوتا ہے ۔''

بولے'' غالباً آپ جاپان ریڈیو کی ہندی نشریات کے نظام الاوقات کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں'' ۔ ہم نے کہا'' جاپان ریڈیو کا نظام الاوقات تو ہم بعد میں جانتے رہیں گے ۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ ہندی پروگرام کے انچارج ہیں لیکن اتنی اچھی اُردو کیسے بول رہے ہیں'' ۔

مسٹر اناہارا بولے'' قبلہ یہ اُردو اور ہندی کے جھگڑے تو آپ کے ملک کو مبارک ہوں ہمیں ان جھگڑوں سے کیا لینا دینا۔ دونوں زبانوں کی گرامر تقریباً یکساں ہے۔ تھوڑی سی سنسکرت اور تھوڑی سی فارسی اور عربی سیکھ کر ہم حسبِ موقع آپ کی اُردو اور ہندی دونوں زبانوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ ہم جاپانی کاروباری آدمی ٹھہرے ۔ ایک تیر سے دو شکار کرنے کی ہمیں عادت

ہے۔ جاپان میں جو آدمی ہندی جانتا ہے وہ اُردو بھی جانتا ہے اور جو اُردو جانتا ہے وہ ہندی بھی جانتا ہے۔''

ہم نے دل میں سوچا کہ اے کاش ہمارے ملک میں بھی لوگ زبانوں کے معاملہ میں کم از کم اتنے ہی کاروباری ہوتے تو ہندی اور اُردو کا جھگڑا نہ ہوتا۔ٹوکیو یونیورسٹی میں ہمارے خیر مقدم کا حال تفصیل کا طلبگار ہے۔لہٰذا اس قسط کو یہاں ختم کرتے ہیں۔بس اتنا بتاتے چلیں کہ ہماری خیر مقدمی تقریب دُنیا کی طویل ترین خیر مقدمی تقریب تھی جو دوپہر میں دو بجے سے رات کے بارہ بجے تک جاری۔

(''جاپان چلو، جاپان چلو۔'' ۱۹۸۰)

جاپان میں مزید اُردو

جاپان میں اُردو اور ہندی کی تعلیم کا انتظام دو یونیورسٹیوں میں ہے۔ ایک یونیورسٹی ہے ٹوکیو یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات جس کا ذکر ہم پچھلی قسط میں کر چکے ہیں اور دوسری یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات اوساکا ہے۔ ٹوکیو یونیورسٹی کی تاریخ تقریباً سو سال پرانی ہے۔ ۱۸۸۳ء میں اسے ایک اسکول کے طور پر شروع کیا گیا تھا۔ مختلف ادوار سے گزرنے کے بعد اس ادارے کو ۱۹۴۹ء میں ٹوکیو یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات کا نام دیا گیا۔ یہاں دنیا کی کئی بڑی زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ اُردو اور ہندی کی تعلیم کا انتظام ہند پاک مطالعات کے شعبہ کے تحت ہے۔ چار سال کی تعلیم کے بعد طلباء کو بی۔ اے کی ڈگری دی جاتی ہے اور ایم۔ اے کے لئے دو سال مختص ہیں۔ ہر سال مختلف جماعتوں میں اُردو کے ۶۰ طلباء تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ٹوکیو یونیورسٹی کی لائبریری میں مختلف زبانوں کی دو لاکھ بیس ہزار کتابیں موجود ہیں۔

اوساکا یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات کی تاریخ ساٹھ سال پرانی ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اسے ایک اسکول کے طور پر شروع کیا گیا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم میں اس ادارے کی ساری عمارتیں بمباری سے تباہ ہوگئی تھیں۔ البتہ اس کی لائبریری کی عمارت تباہ ہونے سے بچ گئی۔ مئی ۱۹۴۹ء میں اس ادارے کو یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا۔ اس یونیورسٹی میں بھی اُردو اور ہندی کی تعلیم کا انتظام ہند پاک مطالعات کے شعبہ کے تحت ہے۔ ان دونوں یونیورسٹیوں میں فارسی اور عربی کی تعلیم کا انتظام بھی موجود ہے۔ جاپان میں اُردو کے طلباء پروفیسر گاموکو جاپان کا بابائے اُردو کہتے

ہیں۔ پروفیسر گامونے اُردو تعلیم کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ وہ تینتیس ۳۳ رسال تک ٹوکیو یونیورسٹی میں اُردو پڑھاتے رہے۔ ان کے شاگرد جاپان میں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ خود پروفیسر سوزوکی بھی پروفیسر گاموکے شاگرد رہ چکے ہیں۔

ان بنیادی معلومات کے بعد آیئے اب ہم ٹوکیو یونیورسٹی کی اُس محفل کا ذکر کریں جس کا ادھورا حال ہم نے پچھلی قسط میں بیان کیا تھا۔ رسمی تعارف کے بعد پروفیسر سوزوکی نے ہمیں اپنے شاگردوں کے آگے یوں ڈال دیا جیسے قدیم روم میں بھوکے شیر کے آگے مجرم کو ڈال دیا جاتا تھا۔ طلباء نے ہم سے طرح طرح کے سوالات پوچھے جن کے صحیح جوابات سچ تو یہ ہے کہ ہمیں بھی معلوم نہیں تھے لیکن ہم چونکہ مہمانِ خصوصی تھے اس لئے جاپانیوں نے ہماری غلط معلومات پر اعتراض نہیں کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ جاپانی بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ چائے کا وقفہ ہوا تو ہمیں اطمینان محسوس ہوا کہ چلو سوالات سے جان چھوٹی۔ ہم نے اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر شعبہ اُردو کی الماریوں میں رکھی ہوئی کتابیں دیکھنی شروع کر دیں۔ حیدر آباد اور دہلی کے کئی دوستوں کی کتابیں وہاں دکھائی دیں۔ تنقیدی مضامین کے مجموعے، شعری مجموعے، ناول اور افسانوں کے مجموعے سب کچھ وہاں موجود تھے۔ کئی رسالوں کے خاص نمبر بھی موجود تھے۔ جوں جوں دوستوں کی کتابیں نظر سے گزرتی تھیں ہمارے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھتی تھی کیونکہ یہاں کئی غیر ضروری کتابیں تھیں، سوائے ہماری کتابوں کے۔ جب ہم کتابوں میں غرق ہونے لگے تو پروفیسر سوزوکی نے ہمارے تجسس کو تاڑ لیا اور کہا" یہاں آپ اپنی کتابیں تلاش نہ کریں تو اچھا ہے۔ آپ کی ایک کتاب جو آپ نے مجھے دہلی میں دی تھی وہ ہماری یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔ یہ تو صرف شعبہ اُردو کی لائبریری ہے۔"

اس پر ہم نے کہا" اچھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ساری اچھی کتابیں یونیورسٹی کی لائبریری میں رکھتے ہیں۔"

بولے" میں آپ کی خوش فہمی دور کرنا نہیں چاہتا"۔

ایک بات ہم نے محسوس کی کہ ان کتابوں میں ہندوستانی ادیبوں کی کتابیں اور ہندوستانی رسائل بہت کم تھے اور پاکستانی ادیبوں کی کتابیں اور رسائل زیادہ تعداد میں موجود تھے۔ ہم نے پروفیسر سوزوکی سے دبی زبان میں اس جانبدارانہ رویئے کی شکایت کی تو بولے

"ہندوستان میں اکثر اُردو ادیبوں اور ایڈیٹروں کو پتہ ہی نہیں ہے کہ جاپان میں اُردو کی تعلیم کا بندوبست ہے۔ہم سے جس طرح ممکن ہوتا ہے ہندوستانی ادیبوں کی کتابیں حاصل کرتے ہیں پاکستان کے اکثر ادیب اپنی کتابیں خود بھیج دیتے ہیں"۔

ہندوستان کا کوئی ادیب اپنی کتابیں ٹوکیو یونیورسٹی میں بھیجنا چاہتا ہوتو اس کی سہولت کے لئے ہم ٹوکیو یونیورسٹی کا پتہ ذیل میں درج کئے دیتے ہیں۔

URDU DEPARTMENT,
TOKYO UNIVERSITY OF FOREIGN STUDIES
NO 514, NISHIGAHARA
KITA KU - TOKYO

شام ہوئی تو پروفیسر سوزوکی نے ہم سے کہا کہ اب یہ جلسہ ٹیکسیوں کے ذریعہ ایک ہوٹل میں منتقل ہوگا جہاں ڈنر کا انتظام ہے۔ہم نے شاید پہلے بھی بتایا ہے کہ جاپانی ایک ہوٹل میں کھانا نہیں کھاتے۔کم ازکم دو تین ہوٹلیں ضرور بدلتے ہیں۔لہٰذا اس رات دو جاپانی ہوٹلوں میں کھانا کھایا گیا۔

پروفیسر سوزوکی کے سارے طلباء ساتھ تھے۔پہلے ہوٹل میں پہنچے تو پروفیسر سوزوکی نے بتایا کہ ابن انشاء بھی یہاں آچکے ہیں۔ہم نے برسبیل تذکرہ پوچھا "آپ کے شعبہ میں اُردو کے کون کونسے ادیب آچکے ہیں؟"

بولے" ابن انشاء اور مسعود مفتی کے بعد آپ کا تیسرا نمبر ہے۔یہاں لوگ آتے ہیں اور چپ چاپ نکل جاتے ہیں۔ہندی شعبہ میں ہندوستان سے جتیندر کمار جین کے سوائے کوئی نہیں آیا۔"

اس رات ہمیں محسوس ہوا کہ دنیا وسیع ہونے کے باوجود بڑی چھوٹی ہے۔اوسا کا یونیورسٹی کے اُردو استاد مسٹر اسادہ نے اچانک ہم سے پوچھا" پاکستان کے ایک مشہور طنز نگار ہوا کرتے تھے ابراہیم جلیس۔ان کا تعلق بھی حیدرآباد دکن سے تھا۔کیا آپ انہیں جانتے تھے؟"۔ ہم نے جب بتایا کہ ہم ان کے چھوٹے بھائی ہیں تو یادوں میں کھو گئے اور بولے" کراچی میں ان سے میری بیسیوں ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔مجھ پر بہت مہربان رہتے تھے۔اس طرح ہم سے تو آپ کے اور بھی کئی رشتے ہیں۔"

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں پروفیسر سوزوکی خود گلبرگہ جا چکے ہیں جو ہماری جنم بھومی ہے۔ ان کے علاوہ دو طلباء بھی گلبرگہ کی زیارت کر چکے ہیں۔ پروفیسر سوزوکی نے اچانک گلبرگہ کا ذکر چھیڑ دیا اور یوں وہاں کے بازاروں، وہاں کی گلیوں اور وہاں کے احباب کا ذکر چھڑ گیا۔

پروفیسر سوزوکی نے کہا" گلبرگہ کے احباب میں سلیمان خطیب کی یاد بہت آتی ہے۔ جب میں گلبرگہ گیا تھا تو انہوں نے میرے اعزاز میں کئی خیر مقدمی جلسے رکھے تھے۔ یہ بتایئے سلیمان خطیب کیسے ہیں؟ کس حال میں ہیں؟"

ہم نے کہا" پروفیسر سوزوکی شاید آپ کو پتہ نہیں کہ سلیمان خطیب اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔انھیں دنیا سے رخصت ہوئے تین سال بیت گئے۔"

پروفیسر سوزوکی اچانک گہرے غم میں ڈوب گئے۔ ساری محفل پر خاموشی چھا گئی۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھے رہے۔ پھر بولے" مجتبیٰ صاحب کبھی کبھی لاعلمی کے بھی کئی فائدے ہوتے ہیں۔سلیمان خطیب آپ کے لئے تین برس پہلے مرگئے۔ میرے لئے تو وہ آج تک بلکہ کچھ لمحے پہلے تک بھی زندہ تھے۔" یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک خاموش رہے۔ پھر اچانک اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے" اب محفل برخاست کی جائے تو مناسب ہے۔میرے طلباء آپ کو آپ کے ہوٹل چھوڑ آئیں گے۔"

اس طرح جو محفل دن میں دو بجے خیر مقدمی تقریب کے طور پر شروع ہوئی تھی وہ رات میں بارہ بجے ایک تعزیتی جلسے کے روپ میں ختم ہوگئی۔ ہم سوچتے رہے انسان برِ اعظموں اور ملکوں میں بٹ جانے کے باوجود ایک دوسرے سے کس قدر جڑا ہوا ہے۔

پروفیسر سوزوکی چلے گئے تو مسز شاشورے اور ہاگیتا ہیروشی ہمارے ساتھ رہ گئے۔ ہوٹل سے باہر نکلے تو سامنے ہی ایک جوئے خانہ نظر آیا۔ جاپان میں جگہ جگہ آپ کو ایسے جوئے خانے نظر آجائیں گے جنہیں جاپانی میں پچنکو کہتے ہیں۔ یہاں طرح طرح کی مشینیں نصب ہوتی ہیں، جن میں پیسے ڈال کر آپ اپنی قسمت آزما سکتے ہیں۔ دوسرے دن سمینار کی چھٹی تھی۔ ہم نے شاشورے سے کہا بی بی ہم نے کئی جاپانی دوستوں سے اُن مشینوں کی ترکیب استعمال کے بارے میں پوچھا مگر کوئی ہمیں ٹھیک ڈھنگ سے سمجھا نہ سکا۔آپ اہلِ زبان ہیں۔آپ اُردو میں سمجھائیں تو پتہ چلے کہ آخر یہ کیا کھیل ہے۔ مسز شاشورے نے ہمیں ان

مشینوں کے بارے میں سلیس اُردو میں نہ صرف سمجھایا بلکہ ہماری طرف سے اپنی جیب سے پیسے نکال کر مشینوں میں ڈالے اور خوب ہاریں۔ بعد میں مسز شاشورے کی ہدایت کے مطابق ہم نے ٹوکیو کے کئی جوئے خانوں سے استفادہ کیا اور ماشاء اللہ کافی رقم جیتی۔ اگر وہ یہ گُر اُردو میں نہ سکھاتیں تو گھاٹے میں رہتے۔ ہم جب اس محفل سے اپنے ہوٹل پہنچے تو رات کے دو بج رہے تھے۔

اُردو کا ذکر چل ہی نکلا ہے تو کیوٹو کی ایک شام کا بھی ذکر ہو جائے۔ اوساکا یونیورسٹی کے اُردو استاد مسٹر اسادہ نے ہم سے کہہ رکھا تھا کہ جب آپ جاپان کی قدیم راجدھانی کیوٹو آئیں تو اوساکا بھی ضرور آئیں۔ کیوٹو سے اوساکا کی مسافت بُلٹ ٹرین سے صرف آدھے گھنٹے کی ہے۔ بعد میں ہم کیوٹو پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ کیوٹو میں تین دن کی سیر کا پروگرام بھی یونیسکو کے ہر پروگرام کی طرح بے حد کسا ہوا ہے۔ لہٰذا آپ اوساکا نہیں جا سکتے۔

ہم نے پروفیسر اسادہ کو کیوٹو سے فون کیا تو ان کی بیگم صاحبہ نے فون اٹھایا۔ ہم نے انگریزی میں مسٹر اسادہ کو پوچھا تو انہوں نے ہمارا نام پوچھا۔ ہم نے نام بتایا تو 'السلام علیکم' کے بعد سلیس اُردو میں بولیں ''مسٹر اسادہ آپ ہی کی خاطر آج گھر سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ آپ کب اوساکا آ رہے ہیں''۔

ہم نے اپنی مجبوری بتائی تو مسٹر اسادہ خود فون پر آ گئے اور بولے ''اگر آپ اوساکا نہیں آ سکتے تو میں اپنے طلباء کو لے کر آتا ہوں۔ ہم لوگ شام میں آپ کے ہوٹل پہنچ جائیں گے۔''

کیوٹو کی وہ شام کتنی حسین تھی ہم بیان نہیں کر سکتے۔ پروفیسر اسادہ دو ٹیکسیوں میں اپنے طلباء کو لے کر ہمارے ہوٹل پر پہنچے۔ ایک طالبہ جاپان کے شہر نارا کی رہنے والی ہیں۔ اُردو میں ایم۔ اے کر رہی ہیں۔ ہندوستان کا بھی دورہ کر چکی ہیں۔ بہت شستہ اُردو بولتی ہیں۔ پروفیسر اسادہ اور مسز اسادہ پاکستان میں کئی سال رہ چکے ہیں۔ ان کی شادی بھی اسلامی طریقہ سے ہوئی تھی۔ وہ جب اُردو بولتے ہیں تو لگتا ہے کوئی پنجابی اُردو بول رہا ہے۔ پروفیسر اسادہ ان دنوں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''توبتہ النصوح'' کا جاپانی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ رات دو بجے تک ہم ہوٹل بدل بدل کر اُردو کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ اوساکا یونیورسٹی کے طلباء کا تجسس اور

اشتیاق ہمیں بہت بھلا لگا۔ پروفیسر اسادہ اور ان کے طلبا اس رات یہیں رک گئے۔ کیوٹو کی سیر کے بعد جب ہم ٹوکیو پہنچے تو پروفیسر اسادہ کا محبت بھرا خط آیا رکھا تھا۔

جاپان کے اُردو اساتذہ اور اُردو طلباء نے ہمیں جو محبت دی اس کا اظہار کم از کم اُردو میں ہم نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ ہمیں اپنے جذبات کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ یوں بھی بہت سے سچے جذبے اظہار کے محتاج نہیں ہوتے۔

(''جاپان چلو، جاپان چلو۔'' ۱۹۸۰)

جاپان میں ہم لکھ پتی بن گئے

پیسے کو ہم ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب سے جاپان آئے ہیں ہم کھانا کھانے سے پہلے اور کھانا کھانے کے بعد ہاتھ نہیں دھوتے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم نے جاپان آنے کے بعد Chop Sticks (لکڑی کی کاڑیوں) سے کھانا سیکھ لیا ہے اور اس فن میں وہ ید طولیٰ حاصل کیا ہے کہ خود جاپانی بھی ہمارا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ جاپانیوں کی اکثریت ہوٹلوں میں کھانا کھاتی ہے۔ ان کے برآمدوں میں ایک شوکیس رکھا ہوا ہوتا ہے اور اس شوکیس میں وہ سارے کھانے جو اس ہوٹل میں دستیاب ہوسکتے ہیں اُن کے نمونے اور ہر کھانے کے برابر اس کی رائج الوقت قیمت بھی لکھی ہوتی ہے۔ آپ بیرے کو شوکیس میں رکھے ہوئے کھانے کا نمونہ بتا دیں اور ایک چوکی کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ جائیں۔ بیرا پہلے آپ کے سامنے گرم پانی میں کھولتا ہوا ایک تولیہ لاکر رکھ دے گا۔ آپ اس تولیہ کی مدد سے حسبِ استطاعت اپنا منہ صاف کریں۔ آپ چاہیں تو ہاتھ بھی صاف کر سکتے ہیں۔ پھر آپ کے سامنے بیرا چاپ اسٹکس لاکر رکھ دے گا۔ اس کے بعد آپ کا مطلوبہ کھانا آئے گا۔ ہم نے پہلے ہی دن سے دانہ چگنے کے لئے چاپ اسٹکس کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ اس کی ترغیب ہمیں ہندوستانی سفارت گھر کی تھرڈ سکریٹری مسز پریم روز شرما نے دی تھی۔ یونیسکو سمینار کی افتتاحی تقریب میں مسز پریم روز شرما ہم سے ملنے کے لئے بطور خاص آئیں تھیں اور انکے آنے سے ہماری ہمت کی خاصی افزائی ہوئی تھی۔ وہ پچھلے دو برسوں سے جاپان میں مقیم ہیں۔ افتتاحی تقریب کے بعد ایشیائی ثقافتی مرکز نے

جوظہرانہ ترتیب دیا تھا اس میں ہم مسز پریم روز شرما کے توسط سے جاپانی کھانوں کے بیشتر اسرار ورموز سے واقف ہو گئے تھے۔ جاپانی بڑے حُسن پرست ہوتے ہیں۔ لہٰذا اپنے کھانوں کو بھی حسین اور خوبصورت بنانے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ میز پر کھانے کی جو اشیا سجائی جاتی ہیں ان میں کھانے کی اشیاء کم اور پھول اور پتے زیادہ ہوتے ہیں۔ پھولوں کی سجاوٹ کو جاپان میں ایک الگ فن کی حیثیت حاصل ہے۔ جسے 'اکیبانہ' کہتے ہیں۔ کھانے کی اشیاء کے اطراف انواع و اقسام کے پھول، گلدستے اور پتے رکھے ہوتے ہیں۔ آدمی میں اتنی تمیز ہونی چاہئے کہ وہ پھول پتے نہ کھائے بلکہ صرف کھانے پینے کی اشیاء پر ہی اکتفا کرے (ویسے جاپانی کھانے کو ہر چیز کھالیتے ہیں)۔ بعض پھول پتے اتنے خوبصورت ہوتے ہیں کہ آدمی انہیں سلاد کے دھوکے میں کھا سکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ایک ساتھی نے مذکورہ ظہرانے میں کھانا کم اور حُسن زیادہ کھایا تھا۔ یعنی دو چار خوبصورت پھول کھالئے تھے اور کچی سبزی کے طور پر نہ جانے کون سے پتے کھالئے تھے۔ ہم بھی شاید یہی کرتے اگر مسز پریم روز شرما ہماری رہبری نہ فرماتیں۔ مسز شرما نے ہی ہمیں سلیس ہندوستانی میں بتایا تھا کہ جاپانی کھانا کھاتے وقت نہ صرف اپنے پیٹ کی غذا کا بلکہ اپنی روح کی غذا کا بھی بندوبست کرتا ہے۔ ہم روح کی غذا سے اتنے گھبرائے کہ بعد میں جتنی بھی دعوتیں ہوئیں ان میں سلاد کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مرغی کی سالم ٹانگیں اور سالم مچھلی ہی کھاتے رہے۔

معاف کیجئے ہم اصل موضوع سے بھٹک گئے ورنہ ہم تو آج اہل وطن کے دلوں میں یہ کہہ کر حسد کی آگ کو بھڑکانا چاہتے ہیں کہ جاپان آنے کے بعد ہم لکھ پتی بن گئے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں ہم پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں۔ مزاج بھی قلندرانہ پایا ہے۔ جیب میں دس پیسے ہوں یا دس ہزار روپئے ہوں ہماری ذات میں کوئی نفسیاتی تبدیلی نہیں پیدا ہوتی۔ بس فرق اتنا ہے کہ جیب میں دس پیسے ہوں تو پیدل چلتے ہیں اور دس ہزار روپئے ہوں تو ٹیکسی میں اُڑتے پھرتے ہیں۔ مال ومتاع سے زندگی بھر بے نیاز رہے اور بفضلِ تعالیٰ دولت بھی ہم سے بے نیاز رہی۔ مگر اس کے باوجود ہماری قسمت میں جاپان آنے کے بعد لکھ پتی بننا لکھا تھا۔ ٹوکیو پہنچنے کے بعد اٹھارہ گھنٹوں تک ہمیں اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ لہٰذا اس قلیل مدت میں ہمیں ٹوکیو کے آٹے دال کا بھاؤ نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ سمینار کی افتتاحی تقریب کے بعد ہمیں پندرہ دنوں کا بھتہ دیا جائے گا تاکہ ہم جاپان میں موج منا سکیں۔

سو سیمینار کے بعد جب ہماری خدمت میں ایک لاکھ ۶۵ ہزار ین کا نذرانہ پیش کیا گیا تو ہم حیران رہ گئے۔ دبی زبان میں کہا بھی کہ ہم اتنی ساری دولت لے کر کیا کریں گے۔ ہم تو ننانوے کے پھیر میں ہی پریشان رہتے ہیں۔ لاکھوں کا حساب کتاب کہاں رکھیں گے۔ اتنی بھاری دولت سے کہیں ہمارا کردار خراب نہ ہو جائے اور ہمیں اپنا کردار بے حد عزیز ہے جو روپے پیسے کی تنگی کا سلسلہ اخلاقیات سے جوڑ کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ مگر ہم سے کہا گیا کہ یہ یونیسکو کا بھتہ ہے جسے آپ کو لینا ہی پڑے گا۔ اس میں تکلف کی کوئی بات نہیں۔ رہا دولت کی فراوانی کا معاملہ تو بھیا ٹوکیو میں جب گھومنے جاؤ گے تو خود تمہیں اپنی امارت کا اندازہ ہو جائے گا۔

غرض لکھ پتی بننے کی خوشی میں پہلی ہی رات کو ہم نے ایک دوست کو کھانے پر بلایا۔ ہم نے ایک جاپانی ریستوراں میں ذرا جم کے کھانا کھایا۔ جم کے کھانے سے مراد یہ ہے کہ مرغ کا گوشت منگوایا اور ساتھ میں مچھلیاں بھی منگوائیں۔ سنگترے کا رس تو ہر کوئی منگاتا ہی ہے۔ بل آیا تو پتہ چلا کہ ہم پانچ ہزار ین کی بھاری رقم سے محروم ہو گئے۔ بھتہ چونکہ پندرہ دنوں کا تھا اس لئے ہم نے مستقبل کے سارے ناشتوں، لنچوں اور ڈنروں کا متوقع حساب جوڑا تو احساس ہوا کہ اگر اسی رفتار سے ہم ٹوکیو میں کھانا کھاتے رہے تو جملہ پینتیس دنوں کے قیام میں ہمیں آخری سات دنوں میں بھوکوں مرنا پڑے گا۔ کہنے کو ہم لکھ پتی ضرور بن گئے تھے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں اپنی غربت کا احساس بھی شدت سے ہو رہا تھا۔ ہماری امارت اور غربت میں اتنا کم فاصلہ رہ گیا تھا کہ لگتا تھا ہمیں ٹوکیو میں قیام کے دوران میں پل صراط پر سے گزرنا پڑے گا۔

آیئے ذرا جاپانی ین کا حال بیان ہو جائے۔ ۲۱۰ ین کا ایک امریکی ڈالر ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ۲۱۰ ین میں ہمارے ساڑھے سات روپے بنتے ہیں۔ یہاں اشیاء کی قیمتیں ہزاروں میں ہیں۔ ایک ین تو کجا دس ین کے سکے بھی رائج ہیں۔ سو ین کا کوئی کرنسی نوٹ نہیں ہوتا، صرف سکہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد پانچ سو ین، ایک ہزار ین، پانچ ہزار ین، دس ہزار ین اور پندرہ ہزار ین کے کرنسی نوٹ ہوتے ہیں۔ ان کرنسی نوٹوں کی ریزگاری کے لئے آپ کو دکانوں کے چکر لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جگہ جگہ ریزگاری کی مشینیں نصب ہوتی ہیں۔ ایک ہزار ین کا کرنسی نوٹ مشین میں ڈالئے اور ریزگاری حاصل کر لیجئے۔ کبھی آپ غلط کرنسی نوٹ مشین میں ڈالیں تو مشین اس نوٹ کو پھر آپ کی خدمت میں واپس کر دیتی ہے۔ نہ آپ مشین کو دھوکہ دے سکتے ہیں

اور نہ ہی مشین آپ کو دھوکہ دیتی ہے۔ جاپانیوں کی طرح ان کی مشینیں بھی بڑی ایماندار ہوتی ہیں۔ ابتداء میں ہمیں اپنا کرنسی نوٹ مشین میں ڈالتے ہوئے بڑی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ کیا پتہ کہ مشین ہمارا کرنسی نوٹ ہڑپ کر جائے۔ ہندوستان میں وزن کرنے والی مشینوں کے معاملے میں اکثر ہمارے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ ادھر دس پیسے کا سکہ ڈالا اور اُدھر مشین نے ہضم کرلیا۔ بعد میں گھونسوں اور لاتوں سے مشین کی تواضع کرنی پڑتی ہے تب بھی وزن کا کارڈ برآمد نہیں ہوتا۔ جاپان میں کبھی کسی مشین کو گھونسے رسید کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ بڑی خوددار اور ایماندار مشینیں ہوتی ہیں۔

غرض جاپانی لاکھوں میں کھیلتے ہیں اور لاکھوں کا حساب کتاب رکھتے ہیں۔ ہم تو پانچ ہزار ین کا کھانا کھا کر ہی پریشان تھے۔ بعد میں جاپانی دوستوں نے ہماری جو دعوتیں کیں تو دیکھا کہ یار لوگ ایک ہی ڈنر کا بل ایک لاکھ ین تک ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ہم نے اپنے ایک جاپانی دوست شنجی تاجیما سے کہا بھی کہ آپ لوگ لاکھوں میں حساب کتاب کیوں رکھتے ہیں۔ ہمیں بڑی پریشانی ہورہی ہے۔ ہم تو دو ہزار روپیوں تک کا حساب کتاب جانتے ہیں کیونکہ ہمیں اتنی ہی تنخواہ ملتی ہے۔ اس کے بعد کی گنتی ہمیں نہیں آتی۔

بولے "یہ آپ کی مجبوری ہے۔ میری مجبوری یہ ہے کہ مجھے چار لاکھ ین تنخواہ ملتی ہے۔ پھر چار لاکھ کا حساب کتاب رکھنا کونسا مشکل کام ہے۔ ایک کیلکیولیٹر خرید لیجئے۔" جاپانی ہر کام کیلکیولیٹر کی مدد سے کرتے ہیں۔ آپ وقت پوچھیں تو اپنی جیب سے کیلکیولیٹر نکال کر وقت بتادیں گے۔ سو ین میں سے کسی کو پچاس ین دینا ہو تو تب بھی کیلکیولیٹر کو زحمت دیں گے۔ اگر آپ پوچھیں کہ آج کیا دن ہے تو تب بھی کیلکیولیٹر کا بٹن دبا کر بتادیں گے۔ تاریخ بھی اسی کیلکیولیٹر کی مدد سے بتائی جاتی ہے۔ ہر جاپانی کی جیب میں ایک کیلکیولیٹر رکھا ہوتا ہے۔ جس کے ذریعہ مشکل سے مشکل حساب کو آسان کیا جاتا ہے۔ ہمارے دوست شنجی تاجیما نے ایک بار ہماری تاریخ پیدائش پوچھی۔ ہم نے تاریخ بتائی تو آدھے منٹ میں کیلکیولیٹر کو زحمت دے کر بتادیا کہ ہم جمعرات کے دن پیدا ہوئے تھے۔ ہم نے سکندر اعظم کی تاریخ وفات بتائی تو انہوں نے سکندر کے مرنے کا دن بتادیا۔ ہم نے بعد میں شیکسپیر کے مرنے کا دن بھی اسی سے معلوم کیا۔ کیلکیولیٹر بڑے کام کی چیز ہے۔ ہم نے اس کا استعمال سیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اب

ٹوکیو میں اپنا سارا حساب کتاب جاپانی دوستوں کی مدد سے رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے بتایا ہے یہاں اشیاء کی قیمتیں سینکڑوں اور ہزاروں میں ہوتی ہیں۔ دو سو ین میں سگریٹ کی ڈبیا آتی ہے۔ آدھی ڈبل روٹی سو ین کی ہوتی ہے۔ مرغ کی ایک ٹانگ پانچ سو ین کی، سستی چپل ایک ہزار ین کی اور جاپانی چھتری دو ہزار ین کی ہوتی ہے۔ اپنے سوٹ کو استری کروائیے تو تین سو ین نکالئے۔ کافی کا ایک پیالہ پئیں تو تین سو ین دیجئے۔ جاپان میں ہمیں ایک ہی چیز سستی نظر آئی اور وہ ہے ٹیلیفون کال۔ مشین میں دس ین کا سکہ ڈال کر بات کرتے چلے جائیے۔ جتنی دیر بات کرنی ہو اس حساب سے آپ کو وقفہ وقفہ سے دس ین کے سکے ڈالتے رہنا پڑتا ہے۔ کسی بھی فون سے آپ سارے جاپان میں کسی سے بھی بات کر سکتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ کسی دور دراز شہر میں کسی سے بات کرنی ہو تو سو ین کا سکہ مشین میں ڈالنا پڑتا ہے۔ ہم ٹوکیو سے اکثر اوساکا کو فون ملاتے ہیں جو پانچ سو کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور اوساکا یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر اسادہ سے بات کرتے ہیں۔ کبھی غلط نمبر نہیں ملا۔ جاپانی ٹیلیفون کی خوبی یہ ہے کہ اگر مطلوبہ شخص کو فون پر بلانے میں دیر ہو رہی ہو اور آپ کو انتظار کرنا پڑ رہا ہو تو اتنی دیر میں ٹیلیفون پر آپ کو موسیقی سنائی جاتی ہے تاکہ آپ کا وقت ضائع نہ ہو۔ ٹیلیفون کی سہولت ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ ہم ایک بار جاپان کے ایک گاؤں میں گئے۔ صبح کے وقت جنگل کی سیر کو نکلے تو دیکھا کہ گھنی جھاڑیوں میں ایک ٹیلیفون بوتھ لگا ہوا ہے۔ ہم نے پوچھا اس فون کا یہاں کیا کام۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ اگر ہم خدانخواستہ راستہ بھٹک گئے تو اس فون کی خدمات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

غرض حضرات! ہم جاپان میں لکھ پتی بن گئے ہیں۔ لیکن ہماری گزارش یہ ہے کہ آپ ہماری غربت پر اظہار ہمدردی کریں اور دعا کریں کہ خدا ہمیں یہاں عزت کی زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ وطن عزیز کی یاد بہت آتی ہے جہاں ایک روپیہ میں سگریٹ کی ڈبیا مل جاتی ہے۔ چار روپے میں ہم پیٹ بھر کھانا کھا لیتے ہیں۔ پچاس پیسے میں اپنے سوٹ کو استری کرواتے ہیں۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ وطن واپس ہونے کے بعد کبھی گرانی کی شکایت نہیں کریں گے کیونکہ جس نے ٹوکیو کی گرانی دیکھی ہے وہ کسی گرانی کو گرانی نہیں سمجھتا۔

(''جاپان چلو، جاپان چلو''۔ ١٩٨٠)

☆☆

مہذب پانی اور غیر مہذب پانی

جاپان جانے سے پہلے ہمیں پانی کی دو ہی قسمیں معلوم تھیں۔ کھارا اور میٹھا پانی۔ جاپان گئے تو پتہ چلا کہ یہاں پانی کی دو اور قسمیں رائج ہیں۔ مہذب پانی اور غیر مہذب پانی۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ وہاں بوتلوں اور بالٹیوں میں بند پانی مہذب اور دریاؤں میں بہنے والا پانی غیر مہذب ہوتا ہے۔ سچ پوچھیئے تو اس تقسیم میں بیچارے پانی کا نہیں بلکہ جاپانی کا قصور ہے کہ وہ ہر شئے میں اپنی تہذیب کو ملا دیتا ہے۔ وہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا بہت دشوار کام ہے۔ جاپان جانے کے بعد پتہ چلا کہ جاپانی پینے کے نام پر کم سے کم پانی پیتے ہیں اور دیگر مشروبات زیادہ پیتے ہیں۔ ہم ٹھہرے بلا کے آب نوش۔ کھانا کھاتے وقت بھی پانی کے گھونٹ کے ذریعہ نوالے کو حلق سے نیچے اتارتے ہیں۔ چائے پینا بھی ہو تو پہلے گلے کو ٹھنڈے پانی سے صاف کرتے ہیں۔

جاپانی کھانا کھانے سے پہلے 'گرین ٹی' یعنی سبز چائے پیتے ہیں اور کھانا کھانے کے بعد بھی اسی سبز چائے کو زحمت دیتے ہیں۔ اگر سبز چائے پینے کا من نہ ہو تو پھر وہاں پینے کے لئے پانی کا سوائے ہر چیز موجود ہوتی ہے۔ ہمیں بھی ابتداء میں کھانے کے ساتھ یہی سبز چائے پیش کی گئی تو ہم نے اس مشروب کو اسی طرح پیا جیسے ہم ہندوستانی کڑوی دوا پیتے ہیں۔ سبز چائے میں ہمیں کہیں 'چائے' نہیں دکھائی دی البتہ اس مشروب کا رنگ ضرور سبز تھا۔ اس میں نہ دودھ ہوتا ہے نہ شکر۔ یوں کہیئے کہ بالکل ننگی چائے ہوتی ہے۔ ہم چائے پیتے ہیں تو چائے کے ساتھ بہت کچھ پی

جاتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست ہمیں چائے کے ساتھ دار چینی، الائچی اور زعفران تک پلا دیتے ہیں۔ ایسی چائے پینے والے کو بھلا کہاں سبز چائے سے تشفی ملتی۔ اگر چہ پورا ایک دن منہ بنا بنا کر سبز چائے کو پیتے رہے۔ دوسرے دن ہم سے نہ رہا گیا۔ جب ناشتے میں پھر سے سبز چائے پیش کی گئی تو پانی سر سے اونچا ہو گیا۔ ہم نے اپنے جاپانی دوست شنجی تاجیما سے پوچھا "کیا آپ لوگ پانی نہیں پیتے۔ بہت اچھی چیز ہوتی ہے"۔

تاجیما نے کہا "پانی تو دریا میں بہنے، آسمان سے برسنے، ساحل سے ٹکرانے اور فواروں سے اُڑنے کے لئے ہوتا ہے۔ ہم پانی پیتے تو ہیں مگر خاص موقعوں پر۔"

ہم نے کہا "پانی کے جو فرائض آپ نے بیان کئے ہیں وہ اپنی جگہ درست ہیں بلکہ ہماری ہندوستانی فلموں میں بھی پانی کے یہی فرائض ہوتے ہیں۔ تاہم اگر آپ ہمیں خاص خاص موقعوں پر اپنی سبز چائے اور عام موقعوں پر پانی پلایا کریں تو زیادہ مناسب ہے۔ یہ تو بتائیے کہ جاپانی میں پانی کو کیا کہتے ہیں؟"

تاجیما نے ذہن پر زور دے کر کہا 'میزو' کہتے ہیں (انہیں ذہن پر زور دینے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ جو چیز استعمال ہی نہیں کرتے اس کا نام کیوں یاد رکھیں)۔

اس کے بعد اگلے دو تین دن تک ہمارا یہ معمول بن گیا کہ جیسے ہی کسی ہوٹل میں داخل ہوتے 'میزو' کی گردان کرتے پہنچتے۔ میزو، میزو کی اتنی تکرار کرتے کہ ہمارے سامنے میزو کے چار پانچ گلاس رکھ دیئے جاتے۔

چوتھے دن ہم اپنی مترجم کے ساتھ ایک ہوٹل میں گئے اور ہم پر حسب معمول دورۂ میزو پڑا تو ہماری بی بی مترجمہ نے ہمارے کان میں کہا "مسٹر حسین! پانی شوق سے پیجئے مگر ذرا تہذیب کے ساتھ"۔

ہم نے کہا "بی بی! آداب مئے نوشی تو ہمارے پاس بھی ہوتے ہیں۔ لیکن آداب آب نوشی کے بارے میں پہلی بار سنا ہے۔ کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ ہم پانی کے پیگ بنا کر پئیں اور پانی پینے کے بعد ہمارے قدم لڑکھڑائیں"۔

بولیں "آپ نے میری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ پانی کا جو آپ جاپانی نام لے رہے ہیں خاصا غیر مہذب نام ہے۔ پانی کا مہذب اور شائستہ نام 'اوہیا'

ہے۔ آپ تو پڑھے لکھے اور مہذب آدمی ہیں لہٰذا آپ کو 'اوہیا' پینا چاہئے 'میزو' نہیں''۔

ہم نے پوچھا'' تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم پچھلے تین دنوں سے جاپان میں غیر مہذب پانی پیتے آرہے ہیں۔ یہ بتائیے کہ میزو کے نام پر جو پانی آتا ہے اس میں اور اوہیا والے پانی میں کیا فرق ہوتا ہے۔''

بولیں'' پانی تو دونوں ہی یکساں ہوتے ہیں مگر اصل اہمیت تہذیب کی ہوتی ہے۔ اگر آپ پانی کا غیر شائستہ نام اپنی زبان پر لانے کے بجائے شائستہ نام زبان پر لے آئیں تو اس سے آپ کی پیاس بھی بجھ جائے گی اور تہذیب بھی سیراب ہوگی۔''

اس کے بعد جاپان میں ہم جتنے دن رہے 'اوہیا' پیتے رہے اور اپنی تہذیب کو سیراب کرتے رہے، میزو کو بالکل ہاتھ نہ لگایا۔ ہم اس کے بعد مہذب ناموں اور غیر مہذب ناموں کے چکر سے اس قدر خوفزدہ ہوگئے کہ ہر شئے کا جاپانی نام معلوم کرنے کے بعد پوچھتے کہ کہیں اس کا کوئی غیر مہذب نام تو نہیں ہے۔ ایک بار خود اپنی بی بی مترجمہ سے رازداری کے انداز میں پوچھا ''بی بی! یہ جو آپ کا نام ہے وہ مہذب ہے یا غیر مہذب''۔

شرم کے مارے اپنے کانوں کی لوؤں تک کو سرخ کرتی ہوئی بولیں'' مسٹر حسین! آپ بڑے غیر مہذب سوالات پوچھتے ہیں''۔

جاپانیوں کی تہذیب کے بارے میں اگر لکھنے پر آئیں تو دفتر کے دفتر لکھ سکتے ہیں لہٰذا ہمارے تھوڑا لکھے کو بہت جانیئے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ دنیا بھر میں یہی وہ واحد قوم ہے جس نے مشینوں سے رشتہ جوڑنے کے باوجود اپنی تہذیب کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ سارا جاپان صبح سے لے کر رات تک مشینوں اور اپنی تہذیب کے درمیان ایک خوشگوار ہم آہنگی پیدا کرنے میں مصروف رہتا ہے اور بالکل نہیں تھکتا۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ ایک جاپانی اپنی زندگی میں جتنے 'شکریئے' ادا کرتا ہے وہ ہم چار جنم میں بھی ادا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ہر جگہ ہر مقام پر آپ کو جاپانی ایک دوسرے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ ہمیں شکایت رہتی ہے کہ ہمیں شکریئے کے لئے مناسب الفاظ نہیں ملتے۔ برخلاف اس کے جاپانیوں کے شکریئے میں اتنے الفاظ ہوتے ہیں کہ ایک سانس میں پوری دلجمعی کے ساتھ آپ شکریہ تک نہیں ادا کر سکتے۔ ہم کسی کے احسان کو صرف 'شکریہ' یا 'دھنیہ واد' یا 'تھینک یو' کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔ لیکن جاپانی میں آپ جب تک

'' دوموآ رئی گاتو گزائی مشتہ'' نہ کہیں تب تک محسن نہیں ٹلتا۔ پھر احسان اور شکریہ کا رشتہ بھی نازک ہوتا ہے۔ کسی نے آپ کو راستہ دیا تو فوراً تعظیماً جھک کر اس کی خدمت میں ایک عدد '' دوموآ رئی گا تو گزائی مشتہ'' پیش کر دیجئے۔ آگے چل کر کسی سے آپ نے پتہ پوچھا اور وہ پتہ نہ بتا سکا تو تب بھی جھک کر اسے '' دوموآ رئی گا تو گزائی مشتہ'' سے نوازیئے۔ جاپانی ہر چھوٹی چھوٹی بات کا '' دوموآ رئی گاتو گزائی مشتہ'' بنا دیتے ہیں۔ ہم شخصی طور پر جاپانیوں کی طرح اتنے مہذب نہیں ہیں لیکن پھر بھی یہ حالت ہو گئی تھی کہ ایک دن کوریا کے مندوب مسٹر کم نے جنکا کمرہ ہمارے کمرے سے متصل تھا کہا '' مسٹر حسین! آپ آدھی رات کو اپنے کمرے میں کس کا شکریہ ادا کرتے رہتے ہیں۔ آخر وہ کون ہے۔ جس کی خدمت میں آپ وقفہ وقفہ سے 'دوموآ رئی گا تو گزائی مشتہ' پیش کرتے ہیں''۔ مسٹر کم کے توجہ دلانے پر ہمیں احساس ہوا کہ ماشاء اللہ اب ہم نیند میں بڑبڑانے کے لئے بھی '' دوموآ رئی گاتو گزائی مشتہ'' کا استعمال کرنے لگے ہیں۔

آپ تو جانتے ہیں کہ ہمارے حصے میں شہرت اور مقبولیت کچھ زیادہ ہی آئی ہے۔ ٹوکیو پہنچے تو احساس ہوا کہ ہم ٹوکیو میں پہلے ہی سے خاصے مقبول ہیں اور ہماری شہرت سارے جاپان میں پھیلی ہوئی ہے۔ چنانچہ کسی ہوٹل میں جاتے یا کسی اسٹور میں داخل ہوتے تو سیلز گرلس ہمارا نام لے لے کر پکارنا شروع کر دیتی تھیں اور ہم سیدھے سیلز گرلس کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے تھے کہ محترمہ آپ نے ہمیں یاد کیا۔ بتایئے ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔ اس پر سیلز گرلس جھینپ کر کہتیں کہ '' یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ خدمت تو ہم آپ کی کرنا چاہتے ہیں۔''

تین چار دنوں تک یہ معمہ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک دن یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کے ڈائرکٹر مسٹر یماوکا سے کہا '' مسٹر یماوکا! مانا کہ ہم بہت مشہور ادیب ہیں اور ہماری شہرت کے ڈنکے چار دانگ عالم میں بجتے ہیں۔ لیکن جاپان آنے کے بعد ہمیں یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ہم یہاں ہندوستان سے زیادہ مشہور ہیں۔ جس کسی ڈپارٹمنٹل اسٹور میں جاتے ہیں سیلز گرلس ہمارا نام لے کر پکارتی ہیں لیکن جب ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو انجان بن جاتی ہیں''۔

مسٹر یماوکا نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر کہا '' مسٹر حسین آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اصل میں وہ 'سیماسین' کہتی ہیں اور ان کا تلفظ کچھ ایسا ہوتا کہ آپ اس 'سیماسین' کو مسٹر حسین سمجھ لیتے ہیں۔''

ہم نے پوچھا ''یہ 'سیماسین' کیا چیز ہوتی ہے۔'' پتہ چلا کہ ''سیماسین'' ایک لفظ نہیں پوری ڈکشنری ہے۔ اس کے کئی معنی ہیں اور ہر معنی کے رنگ مختلف ہیں۔ اس کے ایک معنی ہیں ''معاف کیجئے'' دوسرے معنی ہیں ''آپ کی توجہ کے محتاج ہیں'' تیسرے معنی ہیں ''آپ کی مہربانی'' چوتھے معنی ہیں ''آپ کی کیا خدمت کی جائے۔'' اس لفظ کے دس بارہ اور بھی مفہوم ہیں جواب ہمیں یاد نہیں رہے۔ یہ لفظ ایک ایسا کوزہ ہے جس میں دریا بند ہے۔ اس لفظ کے معنی معلوم ہوئے تو ہم نے اپنی شہرت کو تہہ کر کے الگ رکھا اور خود 'سیماسین' 'سیماسین' کا ورد کرنے لگے۔

جاپانی ملاقات کے وقت مصافحہ کرنے یا ہاتھ اٹھا کر سلام کرنے کے روادار نہیں ہوتے۔ ہماری تربیت کچھ ایسی ہوئی ہے کہ نہ صرف مصافحہ کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ موقع ملے تو ملاقاتی سے گلے مل کر اس کی پسلیوں کی مضبوطی کا امتحان بھی لیتے ہیں۔ ہم سے دو چار دنوں تک یہ بدتہذیبی سرزد ہوتی رہی کہ دھڑا دھڑ جاپانیوں سے مصافحہ کرتے رہے۔ یہ اور بات ہے کہ جس کسی سے مصافحہ کرتے وہ فوراً اپنے ہاتھ دھونے کے لئے بھاگتا تھا۔ آخر کو سمجھدار آدمی ہیں۔ تاڑ گئے کہ ہمارے مصافحے اور بغلگیریاں ضائع جا رہی ہیں۔ لہٰذا ہم نے بھی ملاقات کے جاپانی آداب اختیار کر لیئے۔ جاپانی جب بھی کسی شناسا کو دیکھتا ہے تو دو تین گز دور کھڑا ہو جاتا ہے اور ساٹھ درجہ کا زاویہ بنا کر تعظیماً جھک جاتا ہے۔ گویا کہنا چاہتا ہے کہ بھیا تمہیں دور ہی سے سلام۔ تعظیماً جھکنے کے آداب کے اور بھی کئی ذیلی آداب ہیں۔ پتہ چلا کہ ملاقاتی کی عمر اور رتبہ کے لحاظ سے آپ کو جھکنے کے زاویہ کا تعین کرنا پڑتا ہے۔ کتنی مرتبہ آپ کو جھکنا چاہیئے اس کا انحصار بھی کئی باتوں پر ہوتا ہے۔ جو شخص جھکنے میں پہل کرتا ہے وہ جتنی مرتبہ جھکے اتنی ہی مرتبہ آپ کو بھی جھکنا پڑتا ہے۔ ایک بار ہم نے اپنے ایک جاپانی دوست کے آگے جھکنے میں پہل کی تھی۔ وہ جھکا تو ہمیں احساس ہوا کہ ہمیں اور بھی جھکنا چاہیئے۔ اب جو ہم دونوں کے بیچ جھکنے کا سلسلہ شروع ہوا تو رکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ایک اور جاپانی دوست نے ہمیں آہستہ سے بتا دیا کہ بھیا چونکہ آپ نے جھکنے میں پہل کی ہے اسی لئے اب اس جُھکا جُھکی کو روکنے کی ذمہ داری بھی آپ ہی کی ہے۔ اگر اس نے ہمیں آگاہ نہ کیا ہوتو کیا عجب کہ اب تک ہم ایک ہی جگہ کھڑے جھکتے رہتے۔ ہم نے تعظیماً جھکنے کے آداب کو تفصیل سے سمجھنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن اس میں چونکہ ہر موقع پر جھکنے کا مختلف زاویہ بنانا پڑتا ہے اسی لئے ہم اس چکر میں نہیں پڑے کیونکہ جیو میٹری سے ہمیں اپنی

طالبِ علمی کے زمانے سے ہی نفرت ہے۔

جاپانیوں کی ایک اور تکلیف دہ ادا تحفے دینے کی ہے۔ کہیں بھی جائیے ایک عدد تحفہ آپ کی خدمت میں پکڑا دیا جائے گا۔ پھر ان تحفوں کی پیکنگ اتنی خوبصورت ہوتی ہے کہ اسے کھول کر یہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا کہ اس پردۂ زنگاری میں کیا رکھا ہے۔ ٹوکیو میں شروع کے پچیس دنوں تک ہم دونوں ہاتھوں سے خوشی خوشی تحفے قبول کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہمارا کمرہ تحفوں سے لبالب بھر گیا۔ ہم خود بڑی مشکل سے اپنے کمرے میں داخل ہوتے تھے۔ ٹوکیو سے واپسی میں جب آٹھ دن رہ گئے تو ہمیں ان تحفوں کی اذیت ناکی کا اندازہ ہوا۔ ہمیں اچانک یہ خیال آیا کہ ایرلائینس والے تو ہمیں بیس کلوگرام سے زیادہ سامان لے جانے نہ دیں گے۔ آخر ان تحفوں کا کیا ہوگا جو جاپانیوں نے ہمیں اتنی محبت سے دیئے ہیں۔ پوری ایک رات ان تحفوں کے بارے میں سوچتے گزار دی۔ دوسرے دن ہم نے یونیسکو کی بک ڈیولپمنٹ ڈویژن کی چیف مسز آسانو سے کہا ''محترمہ! جاپانیوں کی محبت کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں لیکن یہ محبت اب ایرلائینس کے قواعد کے حساب سے کئی کلوگرام وزنی ہوگئی ہے۔ ہم غریب آدمی ہیں۔ ایرلائینس کو اس زاید محبت کا خرچہ کہاں سے دیں گے۔'' انہوں نے تجویز پیش کی کہ اب تک جو تحفے ملے ہیں انہیں سمندری جہاز سے بھیج دیجئے۔ بھاگ دوڑ کر کے اس وقت تک کے سارے تحفے سمندری جہاز کی کمپنی کے حوالے کئے۔ مگر اس کے بعد تو ہمیں آٹھ دن اور جاپان میں رہنا تھا۔ ہم نے گڑگڑا کر مسز آسانو سے کہا محترمہ! اب تک جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ خدارا اب جاپانیوں کی محبت کو روکئے۔ ہم سے یہ برداشت نہ ہوگی۔ مگر جاپان میں ہمارا یہ آخری ہفتہ تھا۔ لہٰذا پارٹیوں، گیشا پارٹیوں اور دعوتوں کا ایک سیلاب سا اُمڈ آیا۔ ہر دعوت کو قبول کرنے سے پہلے ہم یہ وعدہ لے لیتے کہ ہمیں کوئی تحفہ نہیں دیا جائے گا مگر جاپانی سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں اپنی تہذیب کو نہیں چھوڑ سکتے۔ چنانچہ ہر دعوت کے بعد ایک تحفہ ہماری خدمت میں پیش کر دیا جاتا تھا اور ہماری آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ دو ایک دعوتوں میں تو کھانا کھانے کے بعد ہم فوراً بھاگ کھڑے ہوئے کہ تحفے سے نجات پانے کا یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا۔ مگر جاپانی ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے کیونکہ یہ تحفہ بالآخر ہماری ہوٹل پر پہنچ جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھ دنوں بعد ہمیں پھر سمندری جہاز کی کمپنی کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا۔

صاحبو! آپ جاپان جائیں تو تحفوں کو اپنے ذہن میں ضرور رکھیں۔ بلکہ ہو سکے تو اپنے ساتھ جاپانیوں کے لئے بھی کچھ تحفے لے جائیں۔ ہم تو کچھ زیادہ تحفے نہیں لے گئے تھے کیونکہ ہمیں جاپانیوں کی عادت کا اندازہ نہیں تھا۔ آپ کو تو ہم نے بتا دیا ہے۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ تحفے لے جائیے۔ ہو سکے تو کچھ تحفے ہماری طرف سے بھی ان کی خدمت میں پیش کیجئے۔

جاپانیوں کی ایک اور عادت جوتے اتارنے کی ہے۔ ہر گھر میں داخل ہونے سے پہلے جوتے اتارنا پڑتا ہے۔ ہر کمرے کے چپل الگ ہوتے ہیں۔ صحن میں جانے کے چپل بھی مختلف ہوتے ہیں۔ جوتوں کے بارے میں ہم الگ سے مضمون لکھیں گے کیونکہ ہندوستان میں بھی جوتوں کی کچھ کم اہمیت نہیں ہے۔ پہننے کے سوائے یہ ہر کام آتے ہیں۔ ہمارے یہاں دال تک جوتیوں میں بٹتی ہے۔ ہم نے ایک جاپانی دوست سے پوچھا آپ کے یہاں طرح طرح کے جوتے اور چپل ہوتے ہیں۔ ہر کمرے کے چپل تک الگ ہوتے ہیں ۔یہ بتائیے جلسوں اور مشاعروں میں پھینکے جانے والے جوتے کیسے ہوتے ہیں؟ ۔وہ بہت دیر تک ذہن پر زور دیتا رہا پھر بولا ''بھلا جوتے بھی کہیں پھینکنے کی چیز ہوتے ہیں۔ میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا''۔

اب ہم اسے اپنی بات کا مطلب سمجھانے کے لئے الگ سے مضمون لکھیں گے۔

جاپانیوں کو آخر ہم سے بھی تو کچھ سیکھنا چاہیئے۔ چاہے وہ جوتوں کا استعمال ہی کیوں نہ ہو۔

(''جاپان چلو، جاپان چلو۔'' ١٩٨٠)

یونیسکو کی چھتری

وہ ہمیں ٹوکیو میں دوسرے دن ملی اور ہم نے اسی دن اپنی بیوی کو خط لکھا'' وہ ہمیں آج ملی ہے۔ دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے۔ اب ہمیں اسی کی رفاقت میں ٹوکیو کے شب وروز گزارنے ہیں اور اسی کے سائے میں رہنا ہے۔'' آٹھ دن بعد ہم اپنے ہوٹل میں گہری نیند سے لطف اندوز ہورہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ نیند سے جاگ کر فون کا ریسیور اٹھایا تو پتہ چلا کہ ہندوستان سے فون آیا ہے۔ دوسری طرف سے ہماری بیوی کی آواز آئی تو ہم نے بے ساختہ پوچھا'' ہیلو کیسی ہو؟ خیریت سے تو ہونا؟''

ہماری بیوی نے کہا'' میری خیریت جائے بھاڑ میں۔ پہلے یہ بتاؤ اس وقت کمرے میں اکیلے ہو یا وہ بھی تمہارے ساتھ ہے''۔

ہم نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا'' وہ کون؟۔ میں تو کمرے میں اکیلا رہتا ہوں۔ کیسی باتیں کرتی ہو۔ میری غریب الوطنی کا تو لحاظ کرو۔ پھر ایسی باتیں کرنے کے لئے کئی سمندر پار سے فون ملانے کی کیا ضرورت ہے''۔

بولیں'' یہ تمہاری آواز میں اتنا خمار کیوں ہے؟۔ ایک عجیب سی مستی کیوں ہے؟''

ہم نے کہا'' رات کا ڈیڑھ بجا ہے۔ تمہارے فون کی گھنٹی پر جاگے ہیں۔ گہری نیند میں کیا اتنا خمار اور اتنی مستی بھی نہ آئے گی؟۔''

بولیں'' بالکل غلط۔ اس وقت تو رات کے صرف دس ہی بجے ہیں''۔

ہم نے بات کو کاٹ کر کہا'' ٹھیک ہے ہندوستان میں دس بجے ہوں گے مگر یہاں تو رات کا ڈیڑھ بجا ہے''۔

بولیں'' مجھے معلوم ہے کہ اب تمہارا وقت اور میرا وقت کبھی نہیں ملے گا۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔ تمہارے لہجہ کی سرشاری بتا رہی ہے کہ وہ چنڈال اب بھی تمہارے کمرے میں ہی ہے۔''

ہم نے غصہ سے کہا'' یہ کیا مذاق ہے۔ تم کس چنڈال کا ذکر کر رہی ہو۔ جاپان میں کوئی چنڈال ونڈال نہیں رہتی۔''

بولیں'' اب تو تم اُدھر ہی کے گن گاؤ گے۔ اسی لئے تو میں تمہارے جاپان جانے کی مخالف تھی۔ سچ بتاؤ وہ کون ہے جس کے بارے میں تم نے خود اپنے خط میں لکھا ہے کہ وہ تمہیں ٹوکیو میں دوسرے ہی دن مل گئی تھی۔ دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے اور یہ کہ اب تمہیں اسی کی رفاقت میں ٹوکیو کے شب و روز گزارنے ہیں۔''

ہم نے زوردار قہقہہ لگا کر کہا'' تم سچ مچ بڑی بھولی ہو۔ ٹوکیو میں ہمیں دوسرے دن جو ملی وہ کوئی حسینہ نہیں بلکہ یونیسکو کی چھتری ہے۔ رو میں شاید ہم چھتری لکھنا بھول گئے اور تم نے اس کا رشتہ عورت سے جوڑ لیا''۔

پوچھا'' اچھا تو یہ چھتری ہے؟''

ہم نے کہا'' اور کیا؟''

پوچھا'' اچھا یہ بتاؤ چھتری شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ؟''

ہم نے کہا'' بھلا چھتریوں کی بھی کہیں شادی ہوتی ہے؟''

بولیں'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ شادی شدہ نہیں ہے۔ یہ بتاؤ عمر کیا ہے؟''

ہم نے کہا'' بڑی پرانی چھتری ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی لوگ اسے استعمال کر چکے ہیں''

بولیں'' اے ہے کچھ تو اپنی عمر کا لحاظ کرو۔ اب تمہیں کون سی غیر مستعملہ چیز ملے گی۔ مرد کی ذات ہی ایسی ہوتی ہے۔ رسّی جل جاتی ہے پر بل نہیں جاتا'' پھر اپنے لہجے میں غمگینی اور رقت طاری کرتے ہوئے بولیں'' خدا کے لئے راہ راست پر آ جاؤ۔ تمہاری اولاد اب شادی کے قابل ہو رہی ہے اور تمہیں اب بھی نئی نئی چھتریوں کی تلاش ہے''۔

ہم نے کہا'' تمہارا الزام بالکل غلط ہے۔ یہاں ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہے۔ میں نے اپنے خط میں جس کا ذکر کیا ہے وہ سچ مچ چھتری ہے۔ کہو تو تمہارے سر کی قسم کھاتا ہوں جسے میں نے ہمیشہ عزیز رکھا ہے''۔

بولیں'' اچھا تو تم میرے سر کی عزت کرتے ہو۔ تبھی تو میرے سر پر ایک نئی چھتری لا رہے ہو۔''

یہ کہہ کر ہماری بیوی نے دھڑ سے فون رکھدیا اور ہندوستان سے تھوڑی دیر کے لئے اچانک جو ہمارا رشتہ قائم ہو گیا تھا وہ ٹوٹ گیا۔ نیند کوسوں دور بھاگ گئی۔ ہمیں ہندوستان کو چھوڑے ہوئے گیارہ دن ہو گئے تھے۔ کوفت ہوتی رہی کہ یونیسکو کی چھتری نے خواہ مخواہ گڑ بڑ کردی ورنہ ہمیں اپنی بیوی سے کتنی اہم اور ضروری باتیں کرنی تھیں۔ اپنے وطن عزیز کا حال پوچھنا تھا۔ یہ جاننا تھا کہ ہمارے بغیر ہندوستان کیسا لگ رہا ہے۔ کیا یہ اب بھی ترقی کر رہا ہے؟ ہمارے پیچھے سورج وقت پر طلوع ہو رہا ہے یا نہیں۔ ہمارے بغیر کہیں چاند کی روشنی ماند تو نہیں پڑ گئی۔ ان ضروری باتوں کے علاوہ کچھ غیر ضروری باتیں بھی کرنا تھیں۔ مثلاً ہمارے نکلتے وقت پکوان کی گیس ختم ہو گئی تھی، یہ آئی یا نہیں۔ ایک دوست کو مٹی کا تیل اکٹھا کر کے پہنچانے کے لئے کہا تھا یہ ملا یا نہیں۔ بجلی کٹنے والی تھی کٹی یا نہیں۔ ہم جب چلے تھے تو آندھرا پردیش کے چیف منسٹر کا تقرر زیر تصفیہ تھا۔ اس کا تصفیہ ہو گیا یا ہماری واپسی کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ ایسی ہی کئی باتیں تھیں مگر یونیسکو کی چھتری نے ٹانگ اڑا دی۔ بیوی پر سخت غصہ بھی آیا کہ محترمہ کی اولاد اب شادی کے قابل ہو گئی ہے لیکن اب تک ہم پر شک کرنے کی عادت نہیں گئی۔ عورت کی ذات ہی ایسی ہوتی ہے۔ رسّی جل جاتی ہے پر بل نہیں جاتا۔ اصل غصہ تو اس بات پر تھا کہ اس ٹرنک کال پر کم از کم سو روپے کا خرچہ تو آ ہی جائے گا جو بالآخر ہماری جیب سے ادا ہو گا۔

نیند اُچٹ گئی تو بس اچٹتی ہی چلی گئی۔ گھڑی دیکھی تو تین بج رہے تھے۔ کمرے کی کھڑکی کھولی تو ٹوکیو کی سڑکوں کو بدستور مصروف پایا۔ کھڑکی سے نظر ہٹائی تو میز کے برابر رکھی ہوئی یونیسکو کی وہ چھتری نظر آ گئی جو فساد کی اصل جڑ تھی۔

دس دن پہلے ہم یونیسکو کے سمینار کے افتتاحی اجلاس میں پہنچے تھے تو یونیسکو کی عہدہ دار مس جو نے ہمیں کئی اشیاء دینے کے بعد کہا تھا'' میں یہ چھتری بھی آپ کو سونپ رہی

ہوں۔ٹوکیو کا موسم بڑا غیر یقینی ہوتا ہے۔ کسی بھی وقت بارش ہو سکتی ہے۔اس چھتری کو ہمیشہ اپنے پاس رکھیئے۔دیگر اشیاء تو اب آپ کی نجی ملکیت بن گئیں۔لیکن خیال رہے یہ چھتری یونیسکو کی ملکیت ہے۔ جب تک جاپان میں رہیں اسے اپنے پاس رکھیئے اور جاتے ہوئے ہمیں واپس دے جایئے تاکہ یہ یونیسکو کے دیگر سمیناروں میں آنے والے مندوبین کے استعمال میں آسکے''۔

ہم نے مس جو کے ہاتھ سے چھتری کو لیتے ہوئے کہا'' مس جو! ہم نے ہمیشہ چھتری کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ برسات تو ہمارے پاس بھی ہوتی ہے لیکن ہم بھیگنے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں یا موقع پاتے ہی دوسرے کی چھتری کے نیچے گھس جاتے ہیں۔غریب آدمی کی زندگی بہر طور گزر جاتی ہے۔چھتری کو ہر جگہ اپنے ساتھ ٹنگائے پھرنا ہمیں پسند نہیں۔ چھتری تو پھر چھتری ہے ہم تو اپنی بیوی کو بھی کبھی اپنے ساتھ لے جانے کے روادار نہیں ہیں''

مس جو نے ہنس کر کہا'' ۳۵ دن اس چھتری کو اپنے ساتھ رکھئے۔ ہندوستان جانے کے بعد آپ شاید اپنی بیوی کو چھتری کے نعم البدل کے طور پر رکھنے لگ جائیں گے۔ عادت اور سنگت بڑی بُری چیز ہے''۔

ہم نے کہا'' آگے کا حال ہم نہیں جانتے۔چونکہ یہ یونیسکو کی ملکیت ہے اسی لئے اس چھتری کی حفاظت کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ بیوی کی طرح نہیں محبوبہ کی طرح دل وجان سے عزیز رکھیں گے''۔

یہ پلاسٹک کی چھتری تھی جس کے مٹھ پر گم ٹیپ سے چپکا ہوا ہمارا نام تھا '' مسٹر حسین، انڈیا'' ہو بہو ایسی ہی چھتریاں سمینار کے دیگر مندوبین کے حوالے بھی کی گئیں تھیں۔ ہم اس چھتری کو لے کر کانفرنس روم میں آئے تو یوں لگا جیسے ہمارے پیروں تلے سے زمین نکلی جارہی ہو۔ جاپان کے زلزلوں کے شہرۂ آفاق جھٹکوں سے یہ ہمارا پہلا واسطہ تھا۔ہم چھتری چھوڑ کر بھاگنا چاہتے تھے کہ ایک جاپانی دوست نے کہا'' زلزلوں کے ایسے جھٹکوں پر یہاں چھتری چھوڑ کر بھاگنا منع ہے۔یہ تو روز کا معمول ہے۔کب تک آپ بھاگیں گے اور کہاں تک آپ بھاگیں گے''۔سمینار کے دیگر مندوبین بھی ہراساں تھے بلکہ سری لنکا کے مندوب مسٹر جیا کوڈی تو اتنے خوفزدہ ہوگئے کہ گھبراہٹ میں اچانک یونیسکو کی چھتری کو کھول

کر کھڑے ہو گئے۔

زلزلے کا زور تھا تو ہم نے مس جو سے کہا'' بی بی! ہمیں آسمان سے آنے والی بلاؤں سے بالکل ڈر نہیں لگتا۔ فلکِ کج رفتار سے یوں بھی ہماری پرانی آشنائی ہے۔ ہمیں کوئی ایسی چھتری دیجئے جو ہمیں زمین کے نیچے سے آنے والی بلاؤں سے محفوظ رکھ سکے۔ جاپان اتنا ترقی یافتہ ملک ہے آپ نے ایسی چھتری ضرور ایجاد کی ہوگی۔''

وہ مسکرا کر چلی گئیں تو سری لنکا کے مسٹر جیا کوڈی تھر تھر کانپتے ہوئے ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے'' مسٹر حسین! میں کل ہی جاپان سے چلا جاؤں گا۔ مجھے ایسا دہلانے والا سمینار نہیں چاہیئے۔ اگر یہ روز کا معمول ہے تو میں یہاں بقیہ دن کیسے گزاروں گا۔ سری لنکا میں میرے دو چھوٹے اور معصوم بچے ہیں۔ ان کی ایک معصوم ماں بھی ہے۔ ان کا کیا ہوگا؟''

ہم نے کہا'' مسٹر جیا کوڈی! آپ تو پھر بھی مزے میں ہیں۔ ہمارے تو چار بچے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کے بچوں کی طرح معصوم نہیں ہیں۔ ایک بیوی ہے جو اتفاق سے معصوم ہے اور پھر اوپر سے یہ یونیسکو کی چھتری بھی اب ہمارے سایۂ عاطفت میں چلی آئی ہے۔''

صاحبو! ہم جاپان کو ذرا دلجمعی اور اطمینان کے ساتھ دیکھنا چاہتے تھے لیکن ہماری یہ خواہش محض اس لئے پوری نہیں ہوئی کہ یونیسکو کی چھتری ہمارے ساتھ تھی۔ محض اس چھتری کی خاطر ہمیں ایک ہی مقام کو دو دو مرتبہ دیکھنا پڑتا تھا۔ پہلی مرتبہ اس مقام کو دیکھنے جاتے تھے اور دوسری مرتبہ اس مقام سے اپنی بھولی ہوئی چھتری کو واپس لانے جاتے تھے۔ جاپان ریڈیو بھی دو مرتبہ گئے۔ ایک مرتبہ اپنا انٹرویو ریکارڈ کرانے اور دوسری مرتبہ یونیسکو کی چھتری کو واپس لانے کے لئے۔ جاپان کی زنانہ یونیورسٹی میں بھی دو مرتبہ گئے۔ ایک مرتبہ اپنا خیر مقدم کروانے کے لئے اور دوسری مرتبہ اپنی چھتری کو واپس لانے کے لئے۔ اگرچہ تھائی لینڈ کی مندوب مس پریتیا کا خیال تھا کہ ہم جان بوجھ کر زنانہ یونیورسٹی میں اپنی چھتری بھول آئے تھے تا کہ وہاں ایک بار اور جانے کا بہانہ ہاتھ آ سکے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری بھول بھی بڑی سوچی سمجھی ہوتی ہے۔ خیر دنیا کی زبان کو کون روک سکتا ہے اور دنیا نے کب کس کا بھلا چاہا ہے۔ تاہم اتنا جانتے ہیں کہ زنانہ یونیورسٹی سے اپنی بھولی ہوئی چھتری کو واپس لانے کے

لئے ہم جس قدر خوشی خوشی گئے تھے کہیں اور نہیں گئے بلکہ دوسری مرتبہ بھی اس چھتری کو وہیں چھوڑے آ رہے تھے۔ بُرا ہو یونیورسٹی کی عہدہ دار کا کہ ہمارے دبے پاؤں واپس جاتے وقت پکار کر کہا'' مسٹر حسین آپ جس چھتری کو لینے آئے ہیں۔اسے پھر بھولے جا رہے ہیں'' ہم نے بادل ناخواستہ عہدیدار کا شکریہ ادا کیا اور راستہ بھر ان کے تیز حافظے کو کوستے آئے۔

اس چھتری کو ہم کہاں کہاں بھولے اس کا حساب بتانا دشوار ہے۔ہم اسے لے کر یوکوہاما گئے، اومیا گئے، نارا گئے، کیوٹو گئے اور ہر جگہ اسے بھولے مگر یہ پھر بھی ہمیں واپس مل گئی۔ کیوٹو کی ہالی ڈے ان ہوٹل کا کمرہ خالی کر کے ہم باہر نکل آئے۔ کچھ دیر بعد یاد آیا کہ ہماری چھتری تو ہالی ڈے ان میں ہی رہ گئی ہے۔ بھاگم بھاگ واپس گئے تو دیکھا کہ کمرے پر ایک نوجوان جوڑے نے قبضہ کر لیا ہے۔نوجوانوں کی سرگرمیوں میں خلل ڈال کر اپنی چھتری واپس حاصل کی تو اس لطیفے کی صداقت پر ایمان لانا پڑا کہ ایک بزرگ ہماری ہی طرح اپنی چھتری ہالی ڈے ان کے کمرے میں بھول کر چلے گئے۔ چھتری کو واپس حاصل کرنے کے لئے ہماری ہی طرح واپس آئے تو دیکھا کہ ہنی مون منانے کے لئے آئے ہوئے ایک نوجوان جوڑے نے ان کے سابقہ کمرے پر قبضہ کر لیا ہے۔ چونکہ ہم سے زیادہ سمجھدار تھے۔اسی لئے کمرے کے دروازے پر کان رکھ کر اندازہ لگانے لگے کہ دیکھیں جوڑا کیا کر رہا ہے۔اس وقت لڑکا لڑکی سے پوچھ رہا تھا'' ڈارلنگ! یہ گھنیری زلفیں کس کی ہیں؟''

لڑکی بولی'' تمہاری ہیں''

'' اور یہ ہرنی جیسی آنکھیں کس کی ہیں؟

لڑکی بولی'' یہ بھی تمہاری ہیں''

'' اور یہ موتی جیسے دانت؟''

لڑکی بولی'' یہ بھی تمہارے ہیں''

ان مکالموں کو سن کر بڑے میاں پریشان ہو گئے اور چیخ کر بولے'' میاں برخوردار! جب معاملہ چھتری تک پہنچے تو خیال رہے کہ یہ تمہاری نہیں میری ہے''

صاحبو! اس چھتری سے ہمارے کمزور حافظے کا رشتہ کچھ اتنا استوار ہو گیا تھا کہ آدھی رات کو اچانک نیند سے جاگ کر اس چھتری کو تلاش کرتے تھے۔ جاپان میں سارے

عام مقامات پر چھتریاں رکھنے کے اسٹینڈ ہوتے ہیں۔ چھتری کو اسٹینڈ میں رکھ کر مقفل کیجئے اور کنجی اپنے ساتھ لیتے جایئے۔ دو مرتبہ ہم چھتری کے اسٹینڈ کی کنجی بھول گئے۔ کنجی کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔ بیچارے اسٹینڈ والے کو فاضل کنجی کا سہارا لینا پڑا۔ غرض اس چھتری نے ہمیں جاپان میں جگہ جگہ رسوا کیا۔ کسی مقام کی سیر کر کے واپس جانے کے لئے یونیسکو کی بس میں بیٹھتے تو اچانک ہمیں چھتری کی یاد آ جاتی تھی اور ہم اسے لینے کو بس سے کود پڑتے تھے۔ ایک پبلیشنگ کمپنی کا معائنہ کرنے کے بعد ہم بس میں واپس چلے آئے اور معمول کے مطابق پھر چھتری کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ آدھے گھنٹے کی تلاش کے بعد مایوس ہو کر بس میں خالی ہاتھ لوٹے تو دیکھا کہ چھتری ہماری نشست پر آرام کر رہی ہے۔ بس ڈرائیور کو بھی ہماری عادت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ بس چلانے سے پہلے پوچھتا تھا۔ ''کیا مسٹر حسین کی چھتری بس میں آ گئی ہے؟'' اثبات میں جواب ملتا تو کہتا'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ سارے مندوبین بس میں آ چکے ہیں۔''

عوام الناس کی اطلاع کے لئے ہم یہ عرض کرتے چلیں کہ جاپان میں قیام کے دوران میں ہمیں صرف دو منٹ کے لئے اس چھتری کو استعمال کرنے کا موقع ملا تھا۔ غالباً ٹوکیو میں ہماری آمد کا ہی فیض تھا کہ موسم اچانک خوشگوار ہو گیا تھا۔ جاپانی بھی حیران تھے کہ آخر موسم کو کیا ہو گیا ہے۔ ہم اُن پر اس راز کو فاش نہیں کرنا چاہتے تھے کہ موسم کی یہ خوشگواری ہماری دین ہے ورنہ وہ ہمیں وہیں روک لیتے۔

ایک دن ذرا سی بوندا باندی ہوئی تو ہم نے کہا چلو آج اس چھتری کو استعمال کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ مگر وہ تھی جاپانی چھتری۔ ہم سے کُھلنے کا نام نہ لیتی تھی۔ ایک جاپانی کی خدمات حاصل کر کے چھتری کھلوائی لیکن اِدھر چھتری کھلی اور اُدھر برسات رک گئی۔ چار و ناچار دوسرے جاپانی کی خدمات حاصل کر کے چھتری بند کروائی۔

جب اس چھتری کے دوبارہ حصول کے پیچھے ٹیکسیوں اور ٹرینوں میں خاصی رقم خرچ کر چکے اور جاپان کو چھوڑنے میں صرف آٹھ دن باقی رہ گئے تو ایک دن ہم نے چھتریوں کی ایک دکان پر اس چھتری کی قیمت پوچھی۔ پتہ چلا کہ ایک ہزار ین کی ہے۔ اس کے بعد ہم نے اس رقم کو جوڑا جو ہماری غائب دماغی کے باعث اس چھتری پر خرچ ہوئی

تھی۔ معلوم ہوا کہ کُل پانچ ہزار ین خرچ ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ اس رقم میں اس ٹرنک کال کا سو روپیے کا بل بھی شامل ہے جسے ہماری بیوی نے اس چھتری سے گھبرا کر ہمیں کیا تھا۔ آدمی کو حساب کے معاملے میں ایماندار رہنا چاہیئے۔

جب سمینار ختم ہوا تو وداعی تقریب کے بعد ہم نے سینہ تان کر بڑے فخر کے ساتھ اس چھتری کو مس جو کے حوالے کیا بلکہ جوشِ جنون میں فارسی میں یہاں تک کہہ دیا کہ ''سپردم بتو مایہ خویش را''

مس جو نے ہنس کر کہا ''مسٹر حسین! اب آپ ہندوستان جا کر اپنی بیوی کو بھی اسی طرح ساتھ رکھیں گے جس طرح یہاں چھتری کو رکھا کرتے تھے۔''

ہم نے کہا ''مس جو! اس چھتری کی وجہ سے اب تو ہمیں سچ مچ کسی کو ساتھ رکھنے کی عادت ہوگئی ہے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ اس چھتری نے جاپان میں ہمیں اپنی بیوی کی عدم موجودگی کا احساس ہی نہ ہونے دیا۔ یہ اب چھتری نہیں سچ مچ ہماری بیوی بن گئی ہے۔ ذرا دیکھئے تو سہی کہ ہم نے اسے کتنا کم استعمال کیا ہے۔ ۳۵ دن میں صرف ایک بار۔''

مس جو نے ہنستے ہنستے اس چھتری کے مٹھ پر سے گم ٹیپ کو چھیلا اور ہمارا نام نکال دیا۔ ہمارے دل پر ایک بجلی سی گری۔ تڑپ کر بولے ''مس جو اس چھتری پر سے ہمارا نام ذرا آہستہ نکالئے۔ دل پر چوٹیں سی پڑ رہی ہیں''۔ اتنا کہنے کے بعد نہ جانے کیوں ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ہمیں ٹوکیو سے ہندوستان واپس آئے ۳۵ دن بیت چکے ہیں لیکن یہ چھتری اب بھی ہمارے ذہن میں کھٹ سے کھل جاتی ہے۔ اگرچہ ہم اسے کھولنا نہیں جانتے تھے۔ نہ جانے کون اس چھتری کو ہمارے ذہن میں کھول دیتا ہے۔ یہ چھتری جو ٹوکیو کے بازاروں میں ہمارے ساتھ رہتی تھی۔ یہ چھتری جس کی مدد سے ہم نے یوکوہاما کے سمندر کی ریت پر نہ جانے کیا کیا شکلیں بنائی تھیں۔ ماونٹ فیوجی کے دامن میں یہ ہماری رفیق تھی۔ جاپان کے دیہاتوں کی گرد اس پر جمی تھی۔ نارا کے پگوڈوں میں یہ ہماری ہم رکاب تھی۔ کیوٹو کے گیشا گھروں میں یہ ایک چشم دید گواہ کے طور پر ہمارے ساتھ تھی۔ اس چھتری کے سائے میں اب کتنی جوان یادیں پل رہی ہیں۔ ہمیں یوں لگتا ہے جیسے ہم جان بوجھ کر اس چھتری کو ٹوکیو میں

بھول آئے ہیں کہ اسے لینے کے بہانے پھر ٹوکیو جاسکیں تا کہ جذبوں کے سلسلے پھر جوڑیں، یادوں کی کڑیاں پھر ملائیں، لمحوں کے موتی پھر پروئیں، ارمانوں کے دھاگوں سے پھر نئی داستانیں بُنیں۔

اے یونیسکو کی چھتری! ہماری ہمدم! ہماری رفیق اُداس نہ ہونا۔ ہم تجھے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے پھر آئیں گے۔ ہماری راہوں میں آنکھیں بچھائے رکھنا۔ کیا عجب کہ اب کی بار ہم بادل بن کر تجھ پر برسنے آجائیں۔

(''جاپان چلو، جاپان چلو۔''۱۹۸۰)

بُلٹ ٹرین میں کبھی نہ بیٹھو

صاحبو! جب سے جاپان آئے ہیں ہمیں اپنے وطن کی ریل گاڑیاں شدت سے یاد آ رہی ہیں۔ ٹوکیو میں ہماری آوارہ گردی کا واحد ذریعہ جاپانی ٹرینیں ہی ہیں۔ یوں بھی سارا جاپان ٹرینوں میں بھاگتا پھرتا ہے۔ ہم بھی ایک ٹرین سے اُترتے ہیں تو دوسری میں سوار ہو جاتے ہیں۔ دوسری سے اُترتے ہیں تو تیسری میں گھس جاتے ہیں۔ اب تو خیر ہمیں ان ٹرینوں میں بیٹھنے کی عادت ہو گئی ہے۔ ابتداء میں ان میں بیٹھتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ اس لئے کہ یہ ٹرینیں کسی بھی اسٹیشن پر ایک منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرتیں۔ ادھر ٹرین رکتی ہے اور اُدھر ساری ٹرین کے دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں۔ اُترنے والے اُتر جاتے ہیں اور ٹرین میں چڑھنے والے چڑھ جاتے ہیں اور پھر دروازے خود بخود بند ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اکثر یہ ڈر ہوتا تھا کہ اگر ہمارا ایک پاؤں ڈبے میں اور دوسرا پاؤں پلیٹ فارم پر ہو اور ایسے میں ڈبے کا دروازہ خود بخود بند ہو جائے تو ہمارا جو ہونا ہے سو ہو جائے گا مگر ہمارے بال بچوں کا کیا ہوگا۔ لیکن جاپانی ٹرینیں بڑی سمجھدار ہوتی ہیں۔ مسافر کا اتنا خیال رکھتی ہیں کہ سفر کرنے کا لطف ہی نہیں آتا۔ ہم جب تک پوری طرح ڈبے میں داخل نہیں ہو جاتے تب تک ٹرین کے دروازے بند نہیں ہوتے۔ ٹوکیو میں زیادہ تر ٹرینیں خانگی ریلوے کمپنیاں چلاتی ہیں۔ حکومت کی طرف سے بھی ایک ٹرین چلائی جاتی ہے۔ لیکن اس میں لوگ ذرا کم ہی بیٹھتے ہیں۔ کیوں کہ سرکاری ٹرین ہونے کی وجہ سے اس کا کرایہ دوسری ٹرینوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے اور کارگزاری بھی کچھ ایسی ویسی ہی ہوتی ہے۔ ہر کمپنی کی ٹرین کا رنگ

مختلف ہوتا ہے۔ نیلی، پیلی، لال، ہری، مٹیالی غرض ہر رنگ کی ٹرین ہوتی ہے۔ کچھ ریل گاڑیاں زمین کے اوپر چلتی ہیں اور اکثر زمین کے نیچے چلتی ہیں۔ ٹوکیو زمین کے اوپر جتنا آباد ہے اتنا ہی زمین کے نیچے بھی آباد ہے۔ کئی بڑے اسٹیشن زمین کے نیچے آباد ہیں۔

جاپان کی ریل گاڑیاں دنیا کی ترقی یافتہ ریل گاڑیاں سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن پھر بھی ہماری ریل گاڑیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ ہماری ریل گاڑیوں میں جو سہولتیں دستیاب ہیں وہ جاپانی ریل گاڑیوں میں ہرگز نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ہم اپنے وطن کی گاڑیوں میں اکثر دروازے سے لگے ہوئے ڈنڈے سے لٹک کر سفر کرتے ہیں تو بڑا لطف آتا ہے۔ یہ سہولت جاپانی ریل گاڑی میں بالکل نہیں ہے۔ ہم جب بھی ٹرین کا سفر کرتے ہیں تو اپنی بش شرٹ یا پتلون ضرور پھڑوا لیتے ہیں۔ یہ سہولت بھی جاپانی ٹرین میں نہیں ہے۔ پھر جاپانی ٹرینوں کے مسافر بھی بڑے بداخلاق ہوتے ہیں۔ کسی سے کوئی بات نہیں کرتے۔ بھلا یہ سفر کرنے کا کوئی طریقہ ہوا۔ ہم جاپانی ٹرینوں میں پچھلے ایک مہینے سے سفر کر رہے ہیں۔ کسی مسافر نے پلٹ کر یہ نہیں پوچھا میاں کہاں رہتے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ بال بچے کتنے ہیں؟ کتنے بچوں کی شادیاں ہو چکی ہیں؟ آپ کے شہر میں پیاز کا کیا بھاؤ ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ جاپانی لوگ ٹرین میں سفر کرتے وقت 'مون برت' رکھ لیتے ہیں۔ پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔ ٹرین آتی ہے تو کتاب میں انگلی رکھ کر ٹرین میں گھس جاتے ہیں اور سیٹ پر بیٹھتے ہی پھر کتاب کھول کر پڑھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اکثر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی لائبریری میں بیٹھے ہیں اور لائبریری کے نیچے پہیئے لگا دیئے گئے ہیں۔ جاپانی یا تو پڑھتے ہیں یا لکھتے ہیں۔ بات بہت کم کرتے ہیں۔ انہیں کون سمجھائے کہ میاں ریل گاڑیوں میں لوگ چہرے پڑھتے ہیں، کتابیں نہیں پڑھتے۔ ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے ہیں اور حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہیں۔ جاپانیوں کو سفر کرنا بالکل نہیں آتا۔ اس معاملے میں یہ ہم سے بہت پیچھے ہیں۔ صرف آرام دہ ریل گاڑیاں بنانے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ سفر کرنے کے کچھ آداب بھی ہوتے ہیں جن سے جاپانی بالکل واقف نہیں ہیں۔ ہمیں جاپانی ریل گاڑیوں سے یہ شکایت بھی ہے کہ یہ بہت ٹھیک وقت پر چلتی ہیں۔ انتظار میں جو لذت ہوتی ہے اسکا مزہ جاپانیوں کو کیا معلوم۔ ایسے ہی کئی معاملات ہیں جن میں جاپانی ہم سے بہت پیچھے ہیں۔ آپ یقین کریں کہ ہمیں ٹوکیو میں کسی بھی اسٹیشن پر ٹرین کے لئے دو منٹ

سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک ٹرین جاتی ہے تو دوسری اس کے پیچھے آ جاتی ہے۔ اور پھر ان کی رفتار بھی ایسی تیز کہ آدمی کا کلیجہ منہ کو آ جائے۔ پتہ نہیں انہیں کہاں جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ ہماری ریل گاڑیاں اسٹیشن میں داخل ہونے سے پہلے بیرونی سگنل کے پاس ضرور رُکتی ہیں۔ سیٹیاں بجاتی ہیں اور مسافر کھڑکیوں میں سے جھانک جھانک کر سگنل کو دیکھتے ہیں۔ کتنا مزہ آتا ہے۔ لگتا ہے جاپانی ریل گاڑیوں کا کوئی سگنل ہی نہیں ہوتا۔ بس منہ اٹھائے کسی بھی اسٹیشن میں گھس جاتی ہیں۔

ہم نے جاپان کی بلٹ ٹرین کی شہرت بہت سنی تھی۔ اس میں بھی سفر کر کے دیکھ لیا بالکل واہیات گاڑی ہے۔ ہمیں بلٹ ٹرین میں بیٹھ کر کیوٹو جانا تھا۔ یونیسکو کے عہدیدار شنجی تاجما سے کیوٹو کا فاصلہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ تقریباً پانچ سو کیلومیٹر سے کچھ اوپر کا فاصلہ ہے۔ اب آدمی اتنے لمبے سفر پر جاتا ہے تو سفر کی تیاریاں بھی کرتا ہے۔ ہم نے پوچھا اتنا لمبا سفر ہے بستر بند بھی ساتھ رکھ لیں۔ شنجی تاجمانے ہنس کر کہا'' اس میں سونے کی جگہ ہی کہاں ہوتی ہے کہ آپ اپنا بستر لگا سکیں۔''

پوچھا'' راستہ میں پانی کے لئے صراحی یا لوٹا رکھ لیں؟''

تاجمانے کہا'' پانی آپ کو ٹرین میں مل جائے گا''

پوچھا'' اور توشہ دان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

تاجمانے کہا'' صبح ناشتہ کر کے ٹوکیو سے چلیں گے۔ دوپہر کا کھانا کیوٹو میں کھالیں گے۔''

ہم نے کہا'' یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ہمارے ہاں چھ سو کیلومیٹر کے فاصلے والے سفر کے لئے کم از کم دو وقت کا کھانا، پانی بھری ہوئی ایک صراحی، ایک لوٹا، ایک بستر بند اور دو تکیے رکھنا ضروری ہوتا ہے''

شنجی تاجما چونکہ ہندوستان میں ایک سال رہ چکے ہیں اور ہماری ٹرینوں میں سفر کا خاصہ لمبا تجربہ رکھتے ہیں اسی لئے شرما کر بولے'' مجھے آپ کی مجبوری کا اندازہ ہے۔ ہندوستان میں سفر کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ مجھے ایک بار آپ کی ٹرین میں چالیس گھنٹوں تک بیٹھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان چالیس گھنٹوں میں میرے ساتھی مسافر کی دو صراحیاں ٹوٹی تھیں اور سارے

ڈبے میں جل تھل ہو گیا تھا۔ ہر اسٹیشن پر اُتر کر لوٹوں میں پانی بھرنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ ہماری ٹرینوں میں یہ سہولت نہیں ہوتی۔"

ہمیں بتایا گیا تھا کہ کیوٹو جانے کے لئے ٹوکیو سنٹرل اسٹیشن سے بلٹ ٹرین ٹھیک آٹھ بج کر اکتالیس منٹ پر نکلے گی۔ ہم نے سوچا یہ صرف ایک دھونس ہے جو ہم پر جمائی جارہی ہے۔ بھلا کونسی ٹرین وقت پر چلتی ہے۔ ہم ٹوکیو سنٹرل اسٹیشن پر پہنچے تو ساڑھے آٹھ بج چکے تھے اور بلٹ ٹرین کا دور دور تک کوئی پتہ نہ تھا۔ ہم نے تاجما کو چھیڑنے کے انداز میں کہا "حضرت وہ جو بلٹ ٹرین ۸ بج کر ۴۱ منٹ پر چلنے والی تھی وہ کہاں ہے؟"

تاجما نے کہا بس آتی ہی ہوگی۔ ٹھیک آٹھ بج کر پینتیس منٹ پر بلٹ ٹرین پلیٹ فارم پر نمودار ہوئی۔ اسکا انجن ہوائی جہاز کی شکل کا ہوتا ہے۔ دیکھنے میں بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ اس میں سولہ ڈبے لگے ہوتے ہیں۔ ساری ٹرین ایر کنڈیشنڈ ہوتی ہے۔ ہم ٹرین میں داخل ہوئے تو یوں لگا جیسے ہم طیارے میں پہنچ گئے ہیں۔ نشستوں کا انتظام بھی اسی طرح کا ہوتا ہے۔ یہ ٹرین ہانشو جزیرے میں واقع ٹوکیو سے کیوشو میں واقع ہکاتا تک ایک ہزار ستر کیلومیٹر کا فاصلہ تقریباً چھ گھنٹوں میں طئے کرتی ہے۔ یہ دنیا کی سب سے تیز رفتار ٹرین سمجھی جاتی ہے کیوں کہ یہ ایک گھنٹہ میں ۲۱۰ کیلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہے۔

ہم ٹرین میں بیٹھے اپنی گھڑی کو دیکھ رہے تھے کہ ٹھیک آٹھ بج کر اکتالیس منٹ پر ٹرین گولی کی طرح اسٹیشن سے نکلی۔ تب ہمیں یقین آیا کہ اس ٹرین کو بلٹ ٹرین کیوں کہتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر دس منٹ کے بعد ایک بلٹ ٹرین ہکاتا کے لئے نکلتی ہے۔ ان ٹرینوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی پابندیٔ وقت ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اگر کبھی ٹرین دس منٹ لیٹ ہو جائے تو مسافروں کو سارا کرایہ واپس کر دیا جاتا ہے۔ ان ٹرینوں میں آٹو میٹک کنٹرول ہوتا ہے۔ کبھی ٹرین کی رفتار تیز ہو جائے تو ٹرین کو خود بخود بریک لگ جاتے ہیں۔ جاپان میں زلزلے بہت آتے ہیں۔ جیسے ہی زلزلہ آتا ہے ٹرین خود بخود رک جاتی ہے۔ پٹریوں کی سلامتی کے بارے میں سگنل بھی سیکنڈوں میں ملتے ہیں۔ ہر ٹرین کا ٹیلی فونی ربط ایک دوسرے سے اور ساری ٹرینوں کا ربط ٹوکیو کے سنٹرل اسٹیشن سے ہوتا ہے۔ بلٹ ٹرین سے سفر کر کے ہمیں اس بات کا دکھ ہوا کہ اس میں دھکے نہیں لگتے۔ ٹرین کے چلنے کی آواز بھی اندر سنائی نہیں دیتی۔ دھکے نہ لگنے اور آواز نہ آنے

کے باعث اس کی رفتار کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ہمیں بھی اس کی رفتار کے بارے میں شبہ ہو گیا تھا۔ ہمارے دوست نے ہمیں ڈائننگ کار میں لے جا کر ٹرین کا میٹر دکھایا۔ سچ مچ ٹرین ۲۱۰ کیلو میٹر کی رفتار سے چل رہی تھی۔

صاحبو! اگر آپ کو بلٹ ٹرین کے ذریعے ٹوکیو سے کیوٹو جانے کا موقع ملے تو اپنے دل پہ قابو رکھئے۔ اس لئے کہ جاپان کا قدرتی حُسن آپ کو مسحور کر دے گا۔ بائیں طرف سمندر آپ کے ساتھ ساتھ چلے گا۔ چھوٹے چھوٹے جزیرے نظر آئیں گے۔ اور دائیں طرف فیوجی پہاڑ نظر آتا رہے گا جو وقفہ وقفہ سے بڑا ہوتا جائے گا۔ ٹرین میں سے فیوجی پہاڑ کا نظارہ خود حیران کر دینے والا ہوتا ہے۔ آپ کو ناگویا کا شہر بھی ملے گا جو جاپان کا چوتھا بڑا شہر ہے۔ ناگویا کا قلعہ بڑی شہرت رکھتا ہے جو دوسری جنگ عظیم میں برباد ہو گیا تھا۔ اسے ۱۹۵۹ء میں دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ تین گھنٹوں کے سفر میں ہم نے جاپان کا جو حُسن دیکھا وہ زندگی بھر ہمارے دل پر نقش رہے گا۔ خدا کرے یہ ہمیشہ ہماری یادداشت کا ایک اثاثہ بنا رہے۔ دوسری جنگ عظیم بھی یاد آئی جس میں اس قدرتی حسن پر بمباری کی گئی تھی۔ ان ہی جگہوں پر کہیں آگ اور بربادی کا ناٹک کھیلا گیا ہوگا۔ پھر ہیروشیما بھی تو یہاں سے پاس ہے۔ انسان جب از سرِ نو جینے کا اہتمام کرتا ہے تو بربادیوں کے نشان خود بخود مٹ جاتے ہیں۔

بلٹ ٹرین میں ٹیلیفون کی سہولت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ بلٹ ٹرین میں سفر کرتے کرتے ہم نے اوساکا کو فون کیا اور اُردو کے استاد مسٹر اسادہ کو یہ مژدہ سنایا کہ ہم کیوٹو آ رہے ہیں۔ ٹرین میں وقفہ وقفہ سے اعلانات ہوتے رہے کہ باہر کا موسم ایسا ہے۔ ہم اتنا فاصلہ طے کر چکے ہیں۔ اب فلاں اسٹیشن آنے والا ہے وغیرہ وغیرہ۔

تقریباً پونے تین گھنٹوں بعد جب ہم کیوٹو پہنچے اور گھڑی دیکھی تو پتہ چلا کہ گاڑی کے پہنچنے کے وقت میں آدھے منٹ کا بھی فرق نہیں ہے۔ ٹوکیو میں بھی ہمیں ایک بار ایک ٹرین سے سگامو اسٹیشن جانا تھا۔ اپنے ایک دوست سے ملنے کے لئے۔ اسٹیشنوں کے نام جاپانی میں لکھے ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں انگریزی میں بھی نام لکھے ہوتے ہیں۔ چونکہ ہم اکیلے سفر کر رہے تھے اس لئے ایک صاحب سے سگامو اسٹیشن کی پہچان پوچھی۔ ان صاحب نے کہا ۱۱ بج کر ۷ ۳ منٹ پر جو بھی اسٹیشن آئے اس پر اُتر جائیے، وہ سگامو اسٹیشن ہی ہوگا۔ اور ہم ٹھیک ۱۱ بج کر ۷ ۳ منٹ پر

سگاموا سٹیشن پر موجود تھے۔

بلٹ ٹرین سے اترنے کے بعد ہمارے دوست شنجی تاجمانے پوچھا'' آپ کا سفر کیسا رہا؟'' ہم نے کہا'' مسٹر تاجما آپ ہندوستان کی ٹرینوں میں سفر کر چکے ہیں۔ ہماری ٹرینوں میں جو سہولتیں ہوتی ہیں وہ آپ کے ہاں کہاں۔ وہ سفر ہی کیا جس میں آدمی کو دھکا نہ لگے۔ ہم نے تین گھنٹے آپ کی ٹرین میں سفر کیا۔ کسی نے ہمارے سر پر صندوق نہیں رکھا۔ کسی کا ہولڈال ہمارے پاؤں پر نہیں گرا۔ کسی مسافر نے نشست کے لئے دوسرے مسافر سے لڑائی نہیں کی اور پھر وہ ہر اسٹیشن پر 'چائے لے لو چائے'، اور 'پان بیڑی سگریٹ' والی مانوس آوازیں نہیں سنائی دیں۔ بھلا یہ بھی کوئی ٹرین کا سفر ہے۔''

تاجمانے شرم کے مارے نظریں نیچی کر لیں۔ بولے'' آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں آپ سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ یوں بھی جاپان اور ہندوستان کا کیا مقابلہ۔ ہمارا ملک چھوٹا ہے اور آپ کا ملک عظیم۔'' اور تاجما کی یہ بات سن کر ہمارا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔

لہٰذا صاحبو! کبھی جاپان جاؤ تو بلٹ ٹرین میں بالکل نہ بیٹھو۔ بڑی واہیات ٹرین ہے۔ بلٹ ٹرین میں بیٹھنے سے بہتر یہی ہے کہ آدمی ہوائی جہاز میں بیٹھ جائے۔

('' جاپان چلو، جاپان چلو۔'' ۱۹۸۰)

☆☆

خموشی گفتگو ہے

شاعر نے کہا ہے عزت اُسے ملی جو وطن سے نکل گیا۔ ہم جب بھی اس مصرعے کو پڑھتے تھے تو سوچتے تھے کہ شاعر کا کام دل کے پھپھولے پھوڑنا ہے۔ وطن میں لوگوں نے شاعر کے کلام

جاپان کی مشہور مصوّر مسز ماروکی کے ساتھ مجتبیٰ حسین

پر داد نہ دی اور بجا طور پر نہ دی تو وطن کے خلاف ہی شعر لکھ مارا۔ ہم نے اس مصرعے کو شاعر کے دل کی جلن سمجھ کر کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ مگر جاپان گئے تو احساس ہوا کہ اس مصرعے میں اور کچھ ہو

یا نہ ہو صداقت ضرور ہے۔ اس لئے کہ جب سے جاپان آئے ہیں ہم مصوری، آرٹ اور کلچر کے بہت بڑے پارکھ اور ناقد سمجھے جانے لگے ہیں۔ وطن میں کوئی آرٹسٹ ہمیں منہ نہیں لگاتا۔ دس گز دور رکھتا ہے۔ کہنے کو تو مقبول فدا حسین جیسے آرٹسٹ سے شناسائی ہے بلکہ ان پر ایک عدد خاکہ بھی لکھا ہے۔ مگر جاپان آتے ہی ہمارا نقشہ ہی بدل گیا۔ اب آرٹسٹ ہمارے آگے پیچھے گھومتے ہیں۔ اپنی پینٹنگس دکھاتے ہیں اور اپنے آرٹ کے بارے میں ہماری قیمتی رائے کو جاننے کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔ ہمیں بھی اپنی رائے کے قیمتی ہونے کا اندازہ ہے۔ تب ہی تو کسی کو کوئی رائے نہیں دی ہے۔ سب سے کہہ رکھا ہے کہ وطن واپس جا کر آپ کے بارے میں رائے لکھ کر بھیجیں گے۔

وطن والو! تمہیں اس اطلاع سے دُکھ ہوگا کہ تم نے جس کے آگے گھاس نہیں ڈالی وہ جاپان پہنچ کر آرٹ کا بڑا ناقد بن گیا۔ اصل میں خدا جب کسی کو کچھ بنانا چاہتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے بننے سے روک نہیں سکتی۔ قصہ صرف اتنا ہے کہ جب ہم جاپان جانے لگے تو ہمارے ایک دوست نے جو انگریزی میں آرٹ کے بہت بڑے ناقد سمجھے جاتے ہیں، ہم سے خواہش کی کہ ہم جاپان سے ان کے لئے جاپان کے بعض مشہور آرٹسٹوں کی پنٹینگس کے پرنٹس لیتے آئیں انہوں نے ہماری سہولت کے لئے جاپانی آرٹسٹوں کے نام اور ان کی پنٹینگس کے عنوانات بھی لکھ دئے تھے۔ جاپان کے ایک مشہور آرٹسٹ تائی کین کے بارے میں یہ بھی بتا دیا تھا کہ موصوف ہندوستان آئے تھے اور رابندر ناتھ ٹیگور سے ان کی دوستی تھی۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ ان پنٹینگس کے پرنٹس کو حاصل کرنے کی کوشش میں ہم ایک دن آرٹ کے ناقد اور قدر دان بن جائیں گے۔

ہم نے جاپان پہنچتے ہی یونیسکو کے عہدیداروں کو جاپانی آرٹسٹوں کے نام معہ ان کی پینٹنگ کے عنوانات کے سنانے شروع کر دئے۔ یہ بھی کہا کہ ہمیں ان کے پرنٹس ہر حالت میں چاہئیں۔ ہم نے یہ چالاکی ضرور کی کہ انہیں یہ نہیں بتایا کہ ان پرنٹس کی ضرورت ہمارے ایک دوست کو ہے۔ جاپانی بیچارے سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ دوسرے کی بات پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ ہم آرٹ کے اور وہ بھی جاپانی آرٹ کے بڑے قدر دان ہیں۔ ہماری شہرت جاپانی آرٹسٹوں میں پھیلی اور وہ ہمارے قدر دان بن گئے اور ہم نے ان کی قدر دانی کے خوب مزے لوٹے۔

ہم جاپان کے سائیتما ضلع کے ایک گاؤں مشاسی رونزانگ میں پہنچے تو ایک جاپانی دوست نے ہمیں یہ مژدہ سنایا کہ جاپان کا مشہور آرٹسٹ جوڑا ماروکی ایڈی اور ماروکی پوشی یہیں پاس میں رہتے ہیں۔ ان کی پنٹینگس کا میوزیم بھی یہیں ہے۔ ماروکی ایڈی اور ماروکی پوشی دونوں میاں بیوی ہیں۔ دونوں آرٹسٹ ہیں اور دونوں نے زندگی بھر ہیروشیما کی بربادی کو پینٹ کیا ہے۔ ہمیں جب یہ اطلاع ملی تو ہم نے فوراً کہا کہ ہم یہ میوزیم دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں وہاں لے جایا گیا اور ہیروشیما کی تباہی کی پنٹینگس کے سامنے کھڑا کردیا گیا۔ آپ سے کیا بتائیں کہ ہمارے دل پر کیا گزری۔ ایک ایک پنٹینگ کو دیکھتے تھے تو کلیجہ منہ کو آجاتا تھا۔ مسٹر ماروکی اب ۸۰ برس کے اور مسز ماروکی ۷۰ برس کی ہوگئی ہیں۔ ۱۶راگست ۱۹۴۵ء کو جب ہیروشیما پر بم گرایا گیا تو دونوں میاں بیوی ٹوکیو میں تھے۔ بم گرنے کے تیسرے دن یہ پہلی ٹرین سے ہیروشیما گئے، جوان کا آبائی شہر ہے۔ وہاں جو بربادی دیکھی تو فیصلہ کیا کہ زندگی بھر ہیروشیما کی تباہی کی تصویریں بناتے رہیں گے۔ اسی میوزیم کے برابر ان دونوں آرٹسٹوں کی رہائش گاہ بھی ہے۔ اگر چہ یہ میوزیم ایک دیہات میں واقع ہے مگر لوگ ہیں کہ اسے دیکھنے کے لئے دھڑا دھڑ آتے ہیں۔ ہم بھی بڑی دیر تک اس میوزیم میں لگی تصویروں کے آگے اپنے سر کو ہلا ہلا کر داد دیتے رہے۔ داد دینے سے فرصت ملی تو ہم نے کہا کہ ہم ان دونوں آرٹسٹوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ آرٹسٹوں کو خبر بھجوائی گئی کہ آرٹ کا ایک مشہور ہندوستانی ناقد آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ مسز ماروکی گھر پر موجود تھیں۔ فوراً اپنے گھر کے اندر بلایا۔ بڑی عزت سے بٹھایا۔ ہم نے ان کی تصویروں کی تعریف کی۔ یہ بھی کہا کہ آپ کی تصویریں دیکھنے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اب ہیروشیما دیکھنے نہیں جائیں گے (یوں بھی ہماری دورے میں ہیروشیما جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا)۔ ہم نے یہ بھی کہا کہ اب زندگی بھر عالمی امن کے لئے کام کرتے رہیں گے۔ وہ بہت خوش ہوئیں اور بولیں ''جنگ کی بربادی کے خلاف ہماری یہ ادنیٰ سی کوشش ہے۔ ہیروشیما پر ایٹم بم کے گرنے سے دو لاکھ ساٹھ ہزار آدمی مرے تھے۔ مگر ہم اتنی بڑی ٹریجڈی پر صرف نو سو (۹۰۰) تصویریں ہی بنا سکے ہیں۔ اصولاً ہر مرنے والے کی ایک ایک تصویر ہونی چاہیئے تھی۔'' ماروکی جوڑا ہندوستان بھی آچکا ہے۔ دونوں ہندوستان سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ان کے کمرے میں ایک دریا کی تصویر بھی لگی تھی۔ پوچھا ''کیا آپ اس دریا کو پہچانتے ہیں؟''۔ تصویر دیکھی تو چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ یہ کسی بھی

دریا کی تصویر ہو سکتی ہے۔ ہم بھلے ہی آرٹ کے ناقد نہ ہوں چالاک ضرور ہیں۔ ہم نے کہا'' ہمیں تو گنگا دکھائی دیتی ہے''۔ بولیں'' آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا۔ گنگا کی شان نرالی ہے۔ اس کی سج دھج ہی الگ ہے۔ میں گنگا کو امن کی علامت سمجھتی ہوں''

مسز ماروکی نے بڑی آؤ بھگت کی۔ دو گھنٹے اپنے پاس بٹھایا۔ بعض ہندوستانی آرٹسٹوں کی خیریت پوچھی۔ ہم نے مسز ماروکی کو نہ صرف ان آرٹسٹوں کی خیریت کی اطلاع دی بلکہ یہ بھی کہا کہ انہوں نے آپ کو سلام پہنچانے کو کہا ہے۔ مسز ماروکی نے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلائی۔ ہم جانے لگے تو مسز ماروکی کی آنکھوں میں محبت اور شفقت کے آنسو تھے۔ بولیں'' بہت جلد پھر کہیں نہ کہیں آپ سے ملاقات ہوگی۔ اپنے حافظہ میں ہمیں محفوظ رکھنا''۔ اتنا سننا تھا کہ ہماری آنکھوں میں بھی عقیدت کے آنسو نکل آئے۔ اس جاپانی دیہات کی وہ شام ہمیں اب تک یاد ہے۔ ہیروشیما کی تباہی کی تصویریں بار بار آنکھوں کے آگے گھومتی رہیں۔ یوں لگا جیسے ہیروشیما میں مرنے والے سب کے سب ہمارے رشتہ دار تھے۔ اس رات کتنی دیر تک ہم سو نہ سکے۔ گمان ہونے لگا کہ کہیں ہم سچ مچ آرٹ کے ناقد تو نہیں بن گئے۔

آرٹ سے ہماری دلچسپی کی اطلاع جاپان میں پھیلی تو دوسرے آرٹسٹ بھی ہم سے ملنے کے لئے بے چین ہونے لگے۔ ایک ڈنر میں جاپان کے ایک مشہور مصور مسٹر وکانا ایک مترجم کے ہمراہ ہم سے ملنے کے لئے آئے۔ ہم سے کہا کہ اگر ہم ان کے گھر ایک دن قیام فرمائیں اور ان کی تصویروں کو دیکھیں تو یہ بات ان کے لئے باعث فخر ہوگی۔ ہم نے جھوٹ موٹ ہی اپنی مصروفیات کا ذکر کیا اور کہا کہ ہمیں اور بھی کئی آرٹسٹوں سے ملنا ہے۔ وقت بہت کم ہے پھر بھی چونکہ آپ خاص طور پر آئے ہیں اسی لئے ضرور آئیں گے۔ معلوم ہوا کہ موصوف ٹوکیو سے ۷۰ کیلو میٹر دور اومیا نام کے شہر میں رہتے ہیں۔ طے یہ ہوا کہ ہم اتوار کو ٹرین سے اومیا پہنچتے ہیں اور وہ اسٹیشن کے مشرقی دروازے پر ہمارے منتظر رہیں گے۔ سو ایک اتوار کو ہم مسٹر وکانا سے ملنے اومیا چلے گئے۔

مسٹر وکانا ہم سے چونکہ ایک مترجم کی معرفت ملے تھے اسی لئے ہم نے سوچا تھا کہ ہم سے تبادلۂ خیال کرنے اور آرٹ کے بارے میں ہمارے زریں خیالات کو جاننے کے لئے وہ مترجم کا بندوبست ضرور کریں گے۔ پھر اس معاملے میں غرض اُن کی تھی۔ لہٰذا ہم اپنی مترجم کو ساتھ

نہیں لے گئے۔ اومیا پہنچے تو مسٹر وکانا اپنے بال بچوں سمیت دو موٹروں میں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ بہت خوش ہوئے۔ پھر اشارے سے پوچھا آپ کی مترجم؟۔ پتہ چلا کہ انہوں نے محض اس خوش فہمی میں کہ ہم اپنی مترجم کو ساتھ لیتے آئیں گے اپنے طور پر مترجم کا بندوبست نہیں کیا ہے۔ اب وہ جاپانی میں ہم سے کچھ کہتے تھے اور ہم انگریزی میں ان سے نہ جانے کیا کہتے تھے۔ مسٹر وکانا انگریزی کا ایک ہی جملہ جانتے تھے اور وہ تھا' تھینک یو'۔ خیر ہم ان کی انگریزی کے مقابلے میں زیادہ جاپانی جانتے تھے کیوں کہ ہم جاپانی کے پانچ چھ جملے جانتے تھے۔ ہاتھوں کے اشارے سے وہ ہمیں کچھ کہتے تھے اور ہم بھی ہاتھوں کے اشارے سے ان کا جواب دیتے تھے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ہمیں ممکری آرٹسٹ بننے کا شرف حاصل ہوا۔ ہم نے تاڑ لیا کہ اب پورا ایک دن ہماری خموشی گفتگو اور بے زبانی زبان بن جائے گی۔

مسٹر وکانا نے اشاروں سے اپنے ارکانِ خاندان کا تعارف کرایا۔ اشاروں میں رشتوں کا اظہار بہت مشکل ہوتا ہے۔ لہٰذا بڑی دیر تک اُن کی بیٹی کو اُن کی بیوی اور بیوی کو موصوف کی والدہ سمجھتے رہے۔ زبان کی دشواری کو محسوس کر کے مسٹر وکانا نے اپنی ایک دوست کو فون کیا جن کے بارے میں مسٹر وکانا کو یہ خوش فہمی تھی کہ وہ انگریزی جانتی ہیں۔ وہ آئیں تو مسٹر وکانا بہت خوش ہوئے۔ ان سے جاپانی میں کچھ کہا اور خواہش کی کہ وہ اُن کی بات ہم تک انگریزی میں پہنچا دیں۔ انہوں نے پوری صدق دلی کے ساتھ انگریزی میں مسٹر وکانا کی بات ہم تک پہنچانے کی کوشش کی مگر ان کی انگریزی اتنی اعلیٰ معیار کی تھی کہ ہم ان کی انگریزی تک اپنی سمجھ کو نہ پہنچا سکے۔ مسٹر وکانا کی دوست کی انگریزی کی ایک مثال ہم پیش کرنا چاہیں گے۔ ایک مرحلہ پر انہوں نے ہم سے پوچھا "Mr Hussain ! are you a big man in your country?" (کیا آپ اپنے ملک کے بڑے آدمی ہیں؟)''

ہم نے حسبِ استطاعت اُن کے سوال کو سمجھ کر پوچھا'' ہم نے آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ اگر بڑے آدمی ہونے سے آپ کا مطلب مالدار آدمی ہونے سے ہے تو ہم قطعاً بڑے آدمی نہیں ہیں۔ صرف دو ہزار روپئے ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔ اگر بڑے آدمی ہونے سے آپ کا مطلب بڑا ادیب ہونے سے ہے تو بے شک ہم اپنے ملک کے بڑے ادیب ہیں۔ یوں بھی ہمارے ملک میں کوئی چھوٹا ادیب پیدا ہی نہیں ہوتا''۔

مسٹر وکانا کی دوست کچھ دیر تک سوچتی رہیں۔ اپنے ذہن میں جملوں کی صف بندی کرتی رہیں۔ پھر اپنے ہاتھ کو آسمان کی طرف اٹھا کر بولیں۔ I want to know whether all indians are multistoreyed like you? ('' کیا سارے ہندوستانی آپ کی طرح کئی منزلہ ہوتے ہیں؟'')

تب ہمیں یہ احساس ہوا کہ موصوفہ ہمارے لمبے قد کے حوالے سے یہ جاننا چاہتی ہیں کہ کیا سارے ہندوستانی ہم جیسے دراز قد ہوتے ہیں۔ اس پر ہم نے جواب دیا۔

"No madam ! some of the buildings are taller than me."

جب مسٹر وکانا کو یہ احساس ہوا کہ ان کی دوست بھی اتنی ہی انگریزی جانتی ہیں جتنی کہ ہم جاپانی تو وہ زبان کی طرف سے مایوس ہو گئے اور سچ مچ آرٹسٹ بن گئے۔ اب انہوں نے ہم پر اپنی محبت نچھاور کرنی شروع کردی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے خاندان نے روایتی لباس کیمونو پہنا اور ہمیں پکڑ کر ایک خاص کمرے میں لے گئے۔ پتہ چلا کہ اب چائے پینے کی تقریب ہوگی۔ مسٹر وکانا نے اس ساری تقریب کو فلمانے کا پروگرام بنایا اور کیمرہ چلادیا۔ جاپانیوں کے ہاں چائے کی تقریب 'Tea ceremoney' کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس تقریب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی عزت کرنا سیکھیں۔ ایک خاتون نے چائے بنائی اور اسے پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ چائے پیش کرنے والی ایک خاص ادا سے آپ کے سامنے چائے کا پیالہ رکھتی ہے اور زمین بوس ہوجاتی ہے۔ جس کو چائے پیش کی جارہی ہو اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ موڈبانہ بیٹھا رہے۔ چائے پینے کے خاص آداب ہوتے ہیں جن سے ٹانگوں میں خاصا درد ہوتا ہے۔ ایک ہی پوز میں گھٹنوں بیٹھ کر اور اپنی ٹانگوں کو خاصی تکلیف دے کر ہم نے یہ آداب سیکھ لئے تھے۔

ہمیں مسٹر وکانا کا گھر بہت عالی شان دکھائی دیا۔ جاپانی گھر بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا گھر کافی وسیع اور کشادہ تھا۔ گھر کے ہر گوشے سے ٹپکتا تھا کہ ایک آرٹسٹ کا گھر ہے۔ چائے کی تقریب کے بعد مسٹر وکانا ہمیں اسٹوڈیو میں لے گئے اور ایک کے بعد ایک پنٹینگ ہمارے سامنے رکھنے لگے۔ جس محبت کے ساتھ وہ پنٹینگوں کو ہمارے سامنے رکھتے جاتے تھے اس سے ان کا خلوص ٹپکتا تھا۔ ان کی کئی پنٹینگس کو دیکھنے کے بعد ہم نے ان کی دوست سے کہا'' مسٹر وکانا کی خوبی یہ ہے کہ وہ انسانی آنکھ کو ایک نئے ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں۔ ہر تصویر میں

آنکھوں کا زاویہ مختلف ہوتا ہے اور ان کی ادا الگ ہوتی ہے''۔ ہماری رائے کو جاپانی میں سن کر مسٹر وکانا پھڑک اُٹھے اور اپنی دوست کی معرفت جواب دیا'' مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ نے میری مصوری کی روح کو پہچان لیا''۔ اُس دن پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اگر ہم آرٹ کے ناقد بننا چاہیں تو بن سکتے ہیں۔

مسٹر وکانا کی پنٹینگس کے ذریعہ اپنی نظروں کو سرور عطا کر کے ہم ڈرائنگ روم میں واپس آئے تو ان کا سارا خاندان ہمارا منتظر تھا۔ ہم ابھی بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ پانچ سال کی ایک چھوٹی سی لڑکی نے ہمیں کاغذ سے بنا ہوا ایک سارس دیا۔ پتہ چلا کہ لڑکی نے ہمارے لئے بطورِ خاص بنایا ہے۔ ہم نے اس کے گال تھپتھپائے تو وہ کاغذ لے کر ایک اور سارس بنانے میں مصروف ہوگئی۔ ہم چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی فنکاری میں گم ہوگئے۔ اتنی چھوٹی سی لڑکی اور ہاتھ کی یہ صفائی۔ مسٹر وکانا کا سارا خاندان فنکاروں کا خاندان ہے۔ بیوی مجسمے بناتی ہیں۔ نواسی کاغذ کے پرندے بناتی ہے۔ بیٹا بھی تصویریں بناتا ہے۔

ہم نے پورا ایک دن زبان کو زحمت دیئے بغیر مسٹر وکانا کے گھر گزار دیا۔ اس دن ایک عجیب وغریب احساس یہ ہوا کہ بعض صورتوں میں زبان ترسیل کا ذریعہ نہیں بلکہ ترسیل میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ مسٹر وکانا نے رنگوں اور خطوط کی زبان کے ذریعہ ہم سے اتنا کچھ کہہ دیا کہ اگر ہم جواب میں اپنی زبان کا استعمال کرتے تو وہ لڑکھڑا جاتی۔

ہم جانے لگے تو مسٹر وکانا اپنے ارکان خاندان کے ساتھ ہمیں چھوڑنے کے لئے اومیا اسٹیشن پر آئے۔ انہوں نے صرف 'تھینک یو' کہا کیوں کہ وہ اتنی ہی انگریزی جانتے تھے اور ہم نے صرف'' دوموآری گاتو گزائی مس'' کہا، کیوں کہ ہم اتنی ہی جاپانی جانتے تھے۔ ان کی نواسی کچھ نہیں جانتی تھی۔ سو ہم جانے لگے تو اس نے دوڑ کر ایک اور خوبصورت سارس ہمارے حوالے کر دیا۔ یہ سارس اب بھی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ ہم جب بھی اس سارس کو دیکھتے ہیں تو لگتا ہے کہ اس کے آگے دنیا کی ساری زبانیں ہیچ ہیں۔ اس سارس میں معنی ومفہوم کے جتنے سمندر چھپے ہوئے ہیں ان کا احاطہ کرنے کی سکت دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہے۔ یہ سارس اب بھی اپنے پنکھ کھولے سدا ہماری یادوں میں اڑتا پھرتا رہتا ہے۔

☆☆

('' جاپان چلو، جاپان چلو''۔ ۱۹۸۰)

جاپان میں اسلام

جاپان کے ایک مشہور پبلشر ہیں۔ ہیروشی ایما مورا۔ ایک بار ہمیں اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا تو جیسا کہ ہماری عادت ہے ان سے انواع واقسام کے سوالات پوچھنے لگے۔ ان سے

جاپان کے مشہور پبلشر ہیروشی ایما مورا کے ساتھ (بائیں سے دائیں)
جیاکوڈی (سری لنکا) مجتبیٰ حسین، (نیپال کے مندوب)
ہیروشی ایما مورا اور کوریا کے مسٹر کِم

پوچھا ''آپ کا مذہب کیا ہے؟'' بولے ''میں عیسائی ہوں''۔ان کی بیوی کے مذہب کے بارے میں پوچھا تو اپنی اہلیہ کو باورچی خانہ سے طلب کر کے پوچھا ''تمہارا مذہب کیا ہے؟''۔ ہماری جستجو اور بے تکے سوالات کے باعث مسٹر ایماموار کو پہلی بار پتہ چلا کہ ان کی اہلیہ محترمہ کا مذہب کیا ہے۔ اگر ہم ان کے گھر نہ جاتے تو خود اپنی گھریلو زندگی کے بارے میں ان کی معلومات میں اتنا اضافہ کیونکر ہوتا۔ ہمارے تجسس کو مہمیز لگ چکی تھی۔ لہٰذا ہم نے لگے ہاتھوں اُن کی بیٹی کے مذہب کے بارے میں پوچھا تو کچھ دیر اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے رہے۔ اس مشکل سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے اپنی بیوی کو پھر باورچی خانہ میں سے طلب کرنا چاہتے ہی تھے کہ ہم نے کہا اب رہنے بھی دیجئے۔ ان کا بھی کوئی اچھا سا مذہب ہوگا۔ ان کے ہاں ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے پوچھا'' اور آپ کا مذہب؟''

اس نے اچانک اپنی بائیں آنکھ کی پتلی کو نیچے کیا اور دائیں آنکھ کی پتلی کو اوپر لے جا کر کچھ سوچنا شروع کیا۔ (جاپانی لڑکیاں ہر مشکل سوال کے جواب میں یہی حرکت کرتی ہیں۔ بہت بھلی لگتی ہیں)۔ اسی لئے ہم ہمیشہ ان سے مشکل سوالات ہی پوچھا کرتے تھے۔ کچھ دیر سوچ کر اپنے کندھوں کو ایک دم نیچے گراتی ہوئی بولی'' عجیب سوال ہے! میں نے ابھی تک اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ جب مذہب کی ضرورت لاحق ہوگی تو تب سوچا جائے گا۔''

مسٹر ایماموار نے لڑکی کی مشکل کو بھانپ کر کہا'' اصل میں ہمارے ہاں مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ ہمارا قدیم مذہب شنٹو کہلاتا ہے۔ پھر جاپان میں بودھ مت پھیلا۔ مگر بدھ مت اختیار کرنے کے باوجود اب بھی بدھ مت کے ماننے والے شنٹو مندروں میں جاتے ہیں اور شنٹو مذہب کے ماننے والے بودھ مندروں میں جاتے ہیں۔ پتہ نہیں کون سے خدا سے کب کام پڑ جائے۔

ان حالات میں یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم وہاں جا کر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کچھ نہ پوچھتے۔ ہمارا مسئلہ صرف اتنا تھا کہ جاپان میں قیام کے دوران میں بقر عید آنے والی تھی اور ہم عید کی نماز بہت پابندی سے پڑھتے ہیں۔ دو چار دوستوں سے پوچھا تو پتہ چلا کہ پورے جاپان میں دو مسجدیں ہیں۔ ایک مسجد تو خود ٹوکیو میں واقع ہے اور دوسری مسجد جاپان کے شہر کوبے میں موجود ہے۔ یہ دونوں مسجدیں ترکی کے خلیفہ نے کئی برس پہلے بنائی تھیں۔ چنانچہ ان دونوں

مسجدوں کی دیکھ بھال بھی حکومتِ ترکی کرتی ہے اور انکے امام بھی حکومتِ ترکی کی طرف سے مقرر کئے جاتے ہیں۔ جن دنوں ہم ٹوکیو میں تھے وہاں کی ترکی مسجد کے پرانے امام واپس جا چکے تھے اور نئے امام کے تقرر کا انتظار کیا جا رہا تھا۔

ایک دن یونیسکو کے دفتر میں انڈونیشیا کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب آیپ روسیڈی Ajip Rosidi اور ان کی بیوی سے ملاقات ہوئی۔ آیپ روسیڈی کی تحریروں کا ترجمہ دنیا کی تقریباً ساری زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ہندی میں بھی ان کی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اتفاق سے وہ جمعہ کا دن تھا۔ ہم سے کہنے لگے "آپ تو مسلمان ہیں۔ جمعہ کی نماز تو پڑھتے ہوں گے۔"

ہم نے یونہی کہہ دیا "پڑھتے تو ہیں لیکن ٹوکیو میں کہاں پڑھیں؟"

بولے "میں اور میری بیوی جمعہ کی نماز پڑھنے کیلئے جاپان اسلامک کانگریس کی مسجد کو جا رہے ہیں جو شنجو کو میں واقع ہے۔ آپ بھی ساتھ چلیں"

ہم نے کہا "سیمینار کا وقفہ دو گھنٹوں کا رہتا ہے۔ اتنی دیر میں شنجو کو جانا اور پھر واپس آنا ممکن نہ ہو گا۔ پھر ہمیں دوپہر کا کھانا بھی کھانا ہے"

بولے "میری گاڑی میں چلیے۔ رہی کھانے کی بات تو وہاں نماز کے بعد نمازیوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے"

ہمارے برابر سری لنکا کے مندوب مسٹر جیا کوڈی کھڑے تھے۔ انہوں نے کھانے کی بات سنی تو پوچھا "کیا مفت میں کھانا کھلایا جاتا ہے؟"۔

آیپ روسیڈی بولے "ہاں! جاپان اسلامک کانگریس کی طرف سے کھلایا جاتا ہے"۔

اس پر جیا کوڈی بولے "ایسی بات ہے تو میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں"۔

جیا کوڈی ویسے تو بدھ مت کے ماننے والے ہیں لیکن کھانے کی بات سن کر ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔ کسی نے سچ کہا ہے پیٹ بڑا ابدکار ہے۔

ہم آیپ روسیڈی کی گاڑی میں جانب مسجد روانہ ہوئے تو باتوں باتوں میں آیپ روسیڈی نے بتایا کہ اگرچہ ٹوکیو میں ترکیوں کی بھی ایک مسجد ہے لیکن وہاں کے امام صاحب غائب ہیں۔ اب جاپان اسلامک کانگریس نے شنجو کو میں جو ٹوکیو کا سب سے خوبصورت علاقہ ہے عارضی طور پر ایک مسجد قائم کر لی ہے۔ اس کے علاوہ اسلامک کانگریس نے اس علاقہ میں ایک

عالیشان مسجد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہوگی۔

ہم نے کہا'' مگراتنی بڑی مسجد کے لئے نمازی کہاں سے آئیں گے؟''

بولے'' آپ چل کر اسلامک کانگریس کی سرگرمیوں کو تو دیکھ لیجئے۔تب پتہ چلے گا''

ٹوکیو بھول بھلیوں کا شہر ہے۔ پھر شنجوکو تو وہاں کا سب سے مصروف علاقہ ہے۔آپ روسیڈی اس مسجد میں کئی بار آ چکے ہیں لیکن اس کے باوجود وہاں پہنچ کر وہ راستہ بھٹک گئے۔گاڑی پارک کرنے کے بعد ہم مسجد کا راستہ تلاش کر ہی رہے تھے کہ ایک نوجوان لڑکی نے ہمارے چہرے پر عبادت کے نور کو بھانپ کر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا'' کیا آپ مسجد کی تلاش میں ہیں؟'' ہم نے ہاں میں جواب دیا تو بولی'' السلام علیکم آپ میرے ساتھ چلیں۔میں بھی جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے جارہی ہوں''۔راستہ میں ایک اور جاپانی لڑکی "السلام علیکم" کہہ کر ہمارے ساتھ چلنے لگی۔ جاپان اسلامک کانگریس کی مسجد پانچویں منزل پر ہے۔لہٰذا ہمیں لفٹ میں سوار ہوکر مسجد میں جانا پڑا۔جاپان اسلامک کانگریس کے صدر پروفیسر ڈاکٹر شوقی فتا کی نماز کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ہمیں دیکھتے ہی زوردار مصافحہ کیا۔پوچھا'' آپ کہاں سے آرہے ہیں؟'' ہم نے جب بتایا کہ ہندوستان سے آئے ہیں تو بہت خوش ہوئے۔اپنے ساتھی ڈاکٹر عبدالسلام موریتا سے ملایا۔نماز کی تیاری ہو رہی تھی۔لوگ وضو کر رہے تھے۔ہم نے بھی وضو کیا۔ وضو کرنے کا ایسا معقول انتظام ہم نے ہندوستان کی کسی مسجد میں نہیں دیکھا۔نمازیوں میں مردوں اور خواتین کی تعداد تقریباً برابر تھی اور دلچسپ بات یہ تھی کہ ان میں اکثریت نوجوانوں کی تھی۔ خواتین اور مرد ایک ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔خواتین کی صفیں الگ ہوتی ہیں۔ چار پانچ عرب باشندے بھی نماز میں شریک تھے۔خطبہ جاپانی میں ہوا اور نماز اسی طرح پڑھائی گئی جس طرح ہم یہاں پڑھتے ہیں۔

نماز کے بعد کئی جاپانی مسلمانوں اور جاپان اسلامک کانگریس کے عہدیداروں سے ملاقات ہوئی۔آیئے ذرا جاپان اسلامک کانگریس کا کچھ حال بیان ہوجائے۔ جاپان اسلامک کانگریس کا قیام دسمبر ۱۹۷۴ء میں ہوا جب جاپان کے مشہور ڈاکٹر پروفیسر شوقی فتا کی نے اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ اسلام قبول کیا اور جاپان اسلامک کانگریس کی داغ بیل ڈالی۔ہمیں بتایا گیا

کہ جب جاپان اسلامک کانگریس کا قیام عمل میں آیا تو جاپان میں مسلمانوں کی تعداد بڑی مشکل سے پانچ ہزار تھی اور اب ان کی تعداد ساٹھ ہزار کے لگ بھگ ہوگئی ہے۔ ہمیں جاپان اسلامک کانگریس کی سرگرمیوں کو دیکھ کر یہ یقین ہو چلا ہے کہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گی۔ کیونکہ اسلامک کانگریس نے جاپان میں اسلام کی ترویج و اشاعت کے لئے ایک عملی پروگرام بنایا ہے۔

ڈاکٹر شوقی فتا کی پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں بھی کئی کارنامے انجام دے چکے ہیں۔ انہوں نے اسلامی دواخانوں کے قیام کے ذریعہ تبلیغ کا پروگرام بنایا ہے۔ پہلے اسلامی میڈیکل کلینک کو اپریل ۱۹۷۶ء میں حکومت نے تسلیم کیا۔ اس کلینک میں روزانہ ۱۳۰ میڈیکل آفیسرس ۸۰۰ سے زیادہ مسلم مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔ ایسے اسلامی کلینک سارے جاپان میں قائم کئے جا رہے ہیں۔ ان کلینکوں کی جانب سے مسلم ممالک کو وفود بھی بھیجے جاتے ہیں۔ حج کے موقع پر بھی جاپانی ڈاکٹروں کی ایک ٹیم سعودی عرب جاتی ہے۔ ۱۹۷۵ء سے جاپان اسلامک کانگریس نے عربی زبان کی تعلیم کا بندوبست بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کی تعلیمات کے بارے میں ایک اسٹڈی سرکل کا قیام بھی عمل میں آچکا ہے جس کے ہفتے میں دو اجلاس ہوتے ہیں۔ ایک پان عرب نیوز ایجنسی بھی قائم کی گئی ہے جس کے ذریعہ اسلامی ممالک کی تازہ خبریں فراہم کی جاتی ہیں۔

ہمیں جاپان اسلامک کانگریس اور عرب نیوز ایجنسی کے دفتر میں تین چار مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا۔ بہت سلیقہ اور منصوبہ بندی کے ساتھ یہ دونوں ادارے کام کرتے ہیں۔

ڈاکٹر فتا کی اسلامی میڈیکل کلینک کی دیکھ بھال کرنے کے علاوہ جاپان اسلامک کانگریس کے سارے اُمور کی نگرانی کرتے ہیں۔ دنیا کے سارے اسلامی ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ عموماً جمعہ کے دن خواہشمند جاپانیوں کو مسلمان بنایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر شوقی فتا کی جاپان کے صنعت کاروں، بیوپاریوں اور سیاستدانوں میں اسلام کو عام کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ جاپان کی بڑی ہوٹلوں میں ''اسلامی عشائیہ'' کا اہتمام کیا جاتا ہے جن میں جاپان کی سرکردہ شخصیتوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ انہی کوششوں کے نتیجہ میں جاپان کے ممتاز سیاستدان اور جاپان کے سابق وزیر مواصلات محمد کومی یامانے ۲۱ دسمبر ۱۹۷۸ء کو اسلام قبول کیا۔ اس وقت جاپان کی

پارلیمنٹ کے تین ارکان بھی مسلمان ہیں۔ جاپان کے کراٹا چمپین نے بھی اسلام قبول کر کے اپنا نام احمد رکھ لیا ہے۔ مسلمانوں کے کراٹا گروپ بھی الگ قائم ہیں۔ ڈاکٹر شوقی فتا کی یہ چاہتے ہیں کہ جاپان میں مسلمانوں کی تعداد پچاس لاکھ ہو جائے اور اس طرح اسلامی طرزِ زندگی کی جھلک جاپان کی عام زندگی میں دکھائی دینے لگے۔

اسلام کی اشاعت کے اس منظم پروگرام کے بعد کچھ حلقوں کی جانب سے جاپان اسلامک کانگریس کی سرگرمیوں کی مخالفت بھی ہونے لگی۔ جو ڈاکٹر اسلامی میڈیکل کلینکوں میں کام کر رہے ہیں ان کے خلاف ٹوکیو میڈیکل ہلت بیورو نے کارروائی شروع کی اور انہیں تنگ کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس کے خلاف جاپان اسلامک کانگریس نے جہاد کا اعلان کیا اور جاپانی عدالتوں میں ٹوکیو میڈیکل ہلت بیورو کے احکام کو چیلنج کیا گیا اور بالآخر جاپان اسلامک کانگریس کے حق میں ہی فیصلہ ہوا۔

جاپان اسلامک کانگریس کی موجودہ مسجد، میڈیکل کلینک کے برابر ہی قائم ہے۔ جس میں ہر جمعہ کو تقریباً ساڑھے تین سو مسلمان نماز ادا کرتے ہیں۔ شنجوکو میں ہی ایک عظیم الشان مسجد کی تعمیر کا کام بھی شروع کیا گیا ہے۔ یہ مسجد نو ہزار مربع میٹر کے رقبہ پر پھیلی ہوئی ہوگی جس میں بیک وقت پانچ ہزار مسلمان نماز ادا کر سکیں گے۔

جاپان اسلامک کانگریس نے پچھلے سات برسوں میں جو کام انجام دئے ہیں وہ حیرت انگیز ہیں۔ جس تیزی سے جاپانی نوجوان مسلمان بن رہے ہیں وہ بھی حیرت انگیز ہے۔

ایک دن ہم نے جاپان اسلامک کانگریس کے ایک عہدیدار سے باتوں باتوں میں کہا "حضرت جاپان کی معیشت کا سارا دارومدار عربوں کے تیل پر ہے۔ جو جاپانی اشیاء ساری دنیا میں اپنا ڈنکا پیٹتی پھر رہی ہیں، انھیں بنانے والی فیکٹریاں سب تیل کی مدد سے چلتی ہیں۔ آپ کے ہاں تیل نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ جو ٹوکیو راتوں کو جگمگاتا ہے سب تیل کی کرامات ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ عربوں سے تیل کے حصول کے لئے جاپان میں اسلام اس قدر تیزی سے فروغ پا رہا ہو۔ یوں بھی اب یہی ایک ایسا مذہب ہے جس کا تیل نکالا جا سکتا ہے"۔

وہ بولے "لاحول ولاقوۃ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ہم تو ہر شئے باہر سے درآمد کرتے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی قدرتی وسائل نہیں ہیں۔ لوہا بھی آپ کے ملک سے منگاتے ہیں۔

تیل عرب ممالک سے منگاتے ہیں۔ ہماری تو صرف فیکٹریاں چلتی ہیں اور محض اس لئے چلتی ہیں کہ ہم محنت کرنا جانتے ہیں۔ ہم خام مال درآمد کرتے ہیں اور تیار مال برآمد کرتے ہیں۔ ہم عربوں سے تیل بھی اسی قیمت پر لیتے ہیں جس قیمت پر دوسرے ممالک لیتے ہیں۔''

ہم ان سے مزید کچھ پوچھنا چاہتے تھے کہ اذان کی آواز آئی اور وہ نماز کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

جاپان اسلامک کانگریس کی سرگرمیوں نے ہمیں سچ مچ بہت متاثر کیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ اسلام کی تبلیغ کے لئے ایک حیدرآبادی کی خدمات سے بھی جاپان اسلامک کانگریس نے استفادہ کیا تھا۔ ہم نے ان کا نام جاننے کی کوشش کی مگر پتہ نہ چل سکا۔ کبھی آپ جاپان جائیں تو اسلامک کانگریس کے دفتر ضرور جائیں۔ ہم احتیاطاً پتہ لکھے دے رہے ہیں۔

JAPAN ISLAMIC CONGRESS
4F, 6TH ARAI BUILDING
1-5-4 KABUKI CHO
SHINJUKU-KU
TOKYO-160 (JAPAN)

(''جاپان چلو، جاپان چلو۔'' ۱۹۸۰)

☆☆

ٹوکیو کے بازاروں میں

بازار چاہے دہلی کے ہوں یا ٹوکیو کے ان سے ہمارا کوئی رشتہ آج تک قائم نہ ہو سکا۔

دُنیا میں ہوں دُنیا کا طلبگار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

نارا میں مجتبیٰ حسین سیمینار کی خاتون مندوبین کے ساتھ

ٹوکیو کے بازار دنیا بھر کی چیزوں سے بھرے پڑے ہیں۔ بہت سی چیزوں کے بارے

میں تو ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کس کام آتی ہیں اور ان کے خریدار کون ہیں۔ یوں بھی ٹوکیو میں ہمیں جاپانیوں کی محبت اور خلوص کے سوائے کچھ نہیں خریدنا تھا۔ کیوں کہ یہی وہ شئے ہے جس پر وطن عزیز میں کسٹم والے کوئی ڈیوٹی نہیں لگاتے۔ وہ لاکھ تلاشی لیں مگر ہمارے دل میں چھپی ہوئی محبت کی دولت کو کہاں پکڑ سکتے ہیں۔ پھر سو باتوں کی ایک بات یہ کہ دن بھر میں تین وقت کا کھانا خریدنے کے بعد ہماری جیب میں کوئی اور چیز خریدنے کی گنجائش کہاں باقی رہتی تھی۔ البتہ ایک چیز ہم جاپان میں ضرور خریدنا چاہتے تھے اور وہ ہے ہمارا لباس۔ جاپان جاتے ہوئے ہم بڑی مشکل سے کپڑوں کے تین جوڑے لے گئے تھے۔ سوچا تھا جاپان جا کر اپنے لئے بڑھیا کپڑے خریدیں گے بلکہ ہم تو کپڑوں کا ایک ہی جوڑا لے جانے والے تھے۔ مگر خدا بھلا کرے ہماری اہلیہ محترمہ کا کہ انہوں نے زبردستی دو پُرانے جوڑے مزید ہمارے سامان میں رکھ دیئے۔ اب جو جاپان جا کر ہم نے ٹوکیو کے بازاروں میں اپنے لئے کپڑے تلاش کرنے شروع کئے تو پتہ چلا کہ ان کپڑوں میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ ہمیں اپنے اندر سمو سکیں۔ جاپانیوں کا قد عموماً چھوٹا ہوتا ہے اسی لئے وہ اپنے حساب سے کپڑے تیار کرتے ہیں۔ کوئی پتلون کمر میں صحیح آتی تو پائنچے چھوٹے ہو جاتے اور پائنچے صحیح ہوتے تو پتلون کمر میں تنگ ہو جاتی تھی۔ یہی حال شرٹس کا بھی ہوا۔ ٹوکیو کا چپہ چپہ چھان مارا۔ ہمیں اپنے سائز کے کپڑے نہ ملے۔ لوگوں نے کہا کپڑا خرید کر سلوا لیجئے۔ ہم اس خیال سے متفق بھی ہو گئے لیکن اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے احتیاطاً سلائی کے دام پوچھے تو پتہ چلا کہ کپڑے کے دام سے دس گنا زیادہ ہونگے۔ ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور کے بارے میں پتہ چلا کہ وہاں امریکیوں کی سائز کے کپڑے ملتے ہیں۔ ہم وہاں بھی گئے۔ کپڑے سائز کے مطابق نکلے لیکن جاپانیوں نے ان تیار کپڑوں کے دام امریکیوں کی معاشی خوشحالی کے حساب سے رکھے تھے۔ یوں کپڑوں کی طرف سے ایسے مایوس ہوئے کہ چار و ناچار اپنے تین پرانے جوڑوں پر ہی جاپان میں اپنے قیام کو نبٹایا۔ رات میں چوری سے اپنے ہوٹل میں کپڑے کا ایک جوڑا دھوتے تھے اور دوسرے دن خود اپنے ہاتھوں ان پر استری پھیر لیتے تھے۔ جاپان جانے کے بعد ہی ہم نے کپڑوں پر استری کرنے کا گُر سیکھا۔ صاحبو! اگر آپ کا قد پانچ فٹ دس انچ اور آپ کا وزن ۷۰ کیلوگرام ہے اور اس کے باوجود اگر آپ کو جاپان جانے کا موقع ملے تو اپنے کپڑے اپنے ساتھ لے جایئے۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ اس معاملے میں جاپانیوں پر بالکل

بھروسہ نہ کیجئے۔

جب ہمیں احساس ہوگیا کہ ہم جاپان کے بازاروں سے کچھ نہیں خرید سکتے تو ہم ان بازاروں میں بے دھڑک گھومنے لگے۔اسی لئے ہم جاپان کے بازاروں کے بارے میں اورلوگوں کے مقابلے میں زیادہ جانتے ہیں۔ہم ہر شام جاپان کے بازاروں میں کھو جاتے تھے۔ ہمارا ریلوے پاس اکھیابارا کے اسٹیشن پر ختم ہوتا تھا اور اکھیابارا نہ صرف ٹوکیو بلکہ سارے جاپان کا سب سے بڑا الکٹرانک اشیاء کا بازار ہے۔وہ الکٹرانک اشیاء جن سے جاپان ساری دنیا میں جانا اور پہچانا جاتا ہے وہ یہاں فروخت ہوتی ہیں۔ایک سے ایک عالیشان دکان ہے جن میں انواع و اقسام کے ریڈیو، ٹرانزسٹر، ٹیلی ویژن، کیلکیولیٹرس، واکی ٹاکی، گھڑیاں اور کیمرے فروخت ہوتے ہیں۔لوگ سبزیوں کی طرح الکٹرانک اشیاء خریدتے ہیں۔یہاں جاکر ہمیں جاپانیوں کی عظمت کا احساس بھی ہوتا تھا اور ان پر ترس بھی آتا تھا۔مانا کہ جاپان الکٹرانک اشیاء کی تیاری کے معاملے میں اس وقت دنیا میں سب سے آگے ہے۔دنیا بھر میں اس کی سیکو اور سٹی زن گھڑیاں، نیشنل پاناسونک ریڈیو، ہٹاچی اور سونی کے ٹرانزسٹروں، یشیکا کے کیمروں، ٹویوٹا اور ڈٹسن کی موٹروں کی دھوم ہے۔مگر دنیا والوں کو جاپان کے ادیبوں، فنکاروں اور آرٹسٹوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔جاپان کے باہر کوئی ان کے نام نہیں جانتا۔جاپان کے ادب، آرٹ اور کلچر کو بنانے والے ٹرانزسٹروں، گھڑیوں، کیمروں اور موٹروں کے نیچے دب گئے ہیں۔ہم نے کئی جاپانی فنکاروں سے مذاق مذاق میں کہا، میاں چیزیں ضرور بناؤ مگر اتنی اچھی بھی نہ بناؤ کہ تم پسِ پشت چلے جاؤ۔چیزیں جاپان کی شناخت کا حصہ ضرور بنیں۔مگر تم بھی تو جاپان کی شناخت کا حصہ بنو۔ہم بھی چیزیں بناتے ہیں مگر یہ ہم سے زیادہ مقبول نہیں ہیں۔بھلے ہی ہمارے ٹرانزسٹروں، کیمروں اور موٹروں کو کوئی نہ پوچھتا ہو مگر ہمارے کالیداس، کبیر، میرابائی، امیر خسرو، غالب، میر، رابندر ناتھ ٹیگور اور ڈاکٹر اقبال کو ساری دنیا جانتی ہے۔جاپانی فنکار ہماری بات کو مذاق میں ٹال دیتے تھے۔ہوگی کوئی مصلحت ان کی۔صاحبو! ان سب باتوں کے باوجود ٹوکیو جاؤ تو اسا کسا ضرور جاؤ بشرطیکہ آپ اپنی عقل کو دنگ اور زبان کو گنگ کرنا چاہیں۔یہاں قدیم جاپان کی جھلک اب بھی دکھائی دیتی ہے۔جاپانی خواتین اور مرد اب بھی جاپان کے روایتی لباس کیمونو میں دکھائی دیتے ہیں۔کیمونو پہننے کے بعد جاپانی عورت کی چال میں عجیب سی طرحداری پیدا ہو جاتی ہے جو قدموں

کوناپ ناپ کرر کھنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ علاقہ ٹوکیو کے دیگر علاقوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں کے بازاروں کی سجاوٹ بھی روایتی ہے۔ اساکسا میں ہی آپ کو جاپان کی گیشا لڑکیاں دکھائی دیں گی۔ ویسے اب گیشا لڑکیاں کم سے کم ہوتی جارہی ہیں۔ زمانہ جو ترقی کررہا ہے۔ ہم نے جتنی بھی گیشا خواتین دیکھیں وہ سب کی سب ۳۵ برس سے زیادہ کی تھیں۔ آپ کو ان کی عمروں سے کیا لینا دینا۔ آپ تو بس ٹوکیو کے چاندنی چوک یعنی اساکسا کو دیکھنے جایئے اور قدیم جاپان کی ایک جھلک دیکھ کر آجایئے۔ مگر ذرا جلدی کیجئے۔ کہیں یہ جھلک ختم نہ ہو جائے۔ کیا کریں زمانہ جو ترقی کررہا ہے۔

اساکسا میں ہی کنین کا مشہور بودھ مندر ہے جو ساتویں صدی عیسوی میں بنایا گیا تھا۔ لکڑی کا بنا ہوا ہے مگر اس کی طرزِ تعمیر آپ کو حیرت میں ڈال دے گی۔ وہ چودھویں کے چاند کی رات تھی جب ہم اس مندر کو دیکھنے گئے تھے۔ لوگ دھڑا دھڑ اس مندر میں عبادت کے لئے آرہے تھے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر مندر کے آگے کھڑے ہو جاتے تھے۔ پوجا کا یہ طریقہ ہمیں خالص ہندوستانی لگا۔ جاپان کے دو بڑے مذہب ہیں، بودھ مت اور شنٹو مت۔ شنٹو مت جاپان کا قدیم مذہب ہے۔ مگر عموماً سارے جاپانی دونوں مذاہب پر یقین رکھتے ہیں۔ شادی شنٹو مندر میں کرتے ہیں تو ان کی آخری رسومات بودھ مت کے عقیدوں کے مطابق انجام پاتی ہیں۔ ایک جاپانی دوست نے ہمیں بتایا تھا کہ بھیا! ہم تو کاروباری آدمی ہیں دونوں مذہبوں پر یقین رکھتے ہیں۔ ٹوکیو کے سب سے مشہور علاقے دو ہیں۔ ایک کا نام گنزہ ہے اور دوسرے کا شنجو کو۔ گنزہ کو جاپان کا شوکیس کہا جاتا ہے۔ دکانوں کی سجاوٹ، بازاروں کی رونق، روشنیوں کی جگمگاہٹ، انسانوں کی ریل پیل، گنزہ کو چاندی کی طرح چمکدار بنادیتی ہے۔ یوں بھی جاپانی میں گنزہ چاندی کو کہتے ہیں۔ یہاں جاپان کے سب سے عالیشان تھیٹر، سینما گھر، ریستوران اور دکانیں آباد ہیں۔ یہیں کے ایک کابکی تھیٹر میں ہم نے ایک کابکی شو بھی دیکھا تھا۔ 'کابکی' کو موسیقی ریز ڈرامہ کہہ لیجئے۔ اس میں قصور کابکی کا نہیں بلکہ ہمارا تھا کہ یہ ہمیں پسند نہیں آیا۔ یہاں کی ایک ہندوستانی ریستوران میں ہم نے اپنے جاپانی دوستوں کو کھانے پر بلایا تھا۔ (ریستوران کا نام نہیں بتائیں گے کیونکہ ہم وطنوں کی برائی کرنا دیش سے غداری ہے) بیرے سر پر پگڑی باندھے کارٹون بنے پھرتے ہیں مگر بعد میں گاہکوں کی پگڑی اُچھالتے ہیں۔ بہت دنوں سے بریانی نہیں کھائی تھی سو

بریانی منگائی، قورمہ تو ہر کوئی کھاتا ہے۔ ہم چھ دوست تھے۔ جانے لگے تو لتا منگیشکر کے ایک فلمی گیت کی مدھر دھن کی آڑ میں بیرے نے ہم سے ہنستے ہنستے بیس ہزار ین وصول کر لیئے۔

صاحبو! اپنے دیش کا کھانا اپنے ہی دیش میں اچھا لگتا ہے۔ بعد میں ہم ٹوکیو کے اور بھی کئی علاقوں کے ہندوستانی ریستورانوں میں گئے۔ کھانا کھانے کے لئے نہیں بلکہ ان کا ٹائیلٹ استعمال کرنے اور لتا منگیشکر یا محمد رفیع کا گیت سننے۔ ایشیائی ثقافتی مرکز کے ڈائیرکٹر مسٹر یماوکا ہمیں اکثر گنزہ لیجاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ جاپان کے شرفا کا علاقہ ہے۔ مگر چند دنوں بعد ہمارے نوجوان دوست شنجی تاجمانے ہمیں طعنہ دیا کہ جو لوگ بوڑھے ہو جاتے ہیں وہ مجبوراً شریف بن جاتے ہیں۔ آپ تو خدا کے فضل سے ابھی اتنے بوڑھے نہیں ہوئے کہ اپنی مرادوں کی شامیں گنزہ میں برباد کریں۔ میرے ساتھ شنجوکو چلیے جہاں جاپان کے نوجوانوں کی شامیں گزرتی ہیں۔ ہم فوراً سینگ کٹا کر بچھڑوں میں جا ملے جیسا کہ ہماری عادت ہے اور پھر اس کے بعد جتنے دن ٹوکیو میں رہے اپنے وجود سے شنجوکو کی شاموں کو روشن اور معطر کرتے رہے۔ ہائے وہ شنجوکو کی شامیں۔ لفظوں میں اتنی سکت کہاں کہ وہ ان شاموں کو اپنی باہوں میں سمیٹ سکیں۔ روشنی میں نہاتے ہوئے تر و تازہ بدن، نوجوانوں کے بھٹکتے قدم، ان کی سرگوشیاں، ان کی بے نیازیاں، سچ جانیے ہم تو ان شاموں سے یوں گزرتے تھے جیسے کوئی گہری نیند میں کسی اچھوتے خواب سے گزر جاتا ہے۔ ہمارے بزرگ دوست مسٹر یماوکا نے پھر شرفا کے علاقے کا حوالہ دے کر ہمیں گنزہ لیجانا چاہا مگر ہم نے صاف کہہ دیا کہ اگلی بار اگر ٹوکیو آنا ہوا تو انشاء اللہ گنزہ میں ضرور اپنی شامیں گزاریں گے۔ اور عمر رفتہ کو آواز دیں گے۔ مگر اب تو شنجوکو کی شامیں ہمیں آواز دے رہی ہیں۔ للّٰہ ہمیں نہ روکیئے۔ ہر چراغ گل ہونے سے پہلے بھڑکتا ہے سو ہمیں بھی بھڑکنے دیجیئے۔ شام ہوتے ہی ہم اپنے نوجوان جاپانی دوستوں کے ساتھ شنجوکو کی باہوں میں پہنچ جاتے تھے۔

شنجوکو میں ٹوکیو کی کئی بلند عمارتیں ہیں۔ ساری عمارتیں زلزلہ پروف ہیں۔ زلزلہ آئے تو یہ اسی طرح ہلتی ہیں جس طرح تیز ہوا میں پیڑ ہلتے ہیں۔ مگر زلزلہ تھمتے ہی پھر اپنی اصلی حالت میں واپس آ جاتی ہیں۔ ہمیں شنجوکو کی نومرا بلڈنگ بہت پسند تھی جس کی پچاسویں منزل پر شیشے کا گھر تھا۔ اس بلڈنگ کی لفٹ اتنی تیز رفتار ہے کہ آدھے منٹ میں پچاسویں منزل پر پہنچا دیتی ہے۔ ہم سر شام شیشے کے اس گھر میں جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ چاروں طرف دور دور تک ٹوکیو ہی ٹوکیو دکھائی

دیتا ہے۔ ہمیں یہ بلڈنگ اس لئے بھی پسند تھی کہ یہاں سے فیوجی پہاڑ کا نظارہ بڑا دلفریب معلوم ہوتا ہے۔ ویسے تو فیوجی پہاڑ ٹوکیو سے ڈھائی تین سو کلومیٹر دور ہے مگر نومرا بلڈنگ کے اس شیشہ گھر میں بیٹھے بیٹھے اکثر ہمارا جی چاہتا تھا کہ ہم شیشہ گھر کی کھڑکی سے باہر ہاتھ نکال کر فیوجی پہاڑ کے سر پر سے اُس برفانی ٹوپی کو اُچک لیں جو پہاڑ کا طرۂ امتیاز ہے۔ ہم گھنٹوں فیوجی پہاڑ کو گھورتے رہتے تھے۔ پھر جب رات کا اندھیرا اُترنے لگتا اور فیوجی پہاڑ کی برفانی ٹوپی دھندلی ہونے لگتی تو ہم اپنی نظروں کو وہاں سے ہٹا کر ٹوکیو کی جگمگاتی اور دوڑتی بھاگتی سڑکوں پر ڈال دیتے تھے۔ لاکھوں موٹریں اور ہزاروں ٹرینیں نہ جانے کہاں بھاگی پھرتی ہیں۔ انہیں کیا پتہ کہ ایک پردیسی نومرا بلڈنگ کی پچاسویں منزل پر بیٹھا ان کی بھاگ دوڑ کا مزہ لے رہا ہے۔

درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہ گزر کو کیا خبر ہے

ٹوکیو کی آخری شام بھی ہم نے نومرا بلڈنگ کے شیشہ گھر میں گزاری تھی۔ فیوجی پہاڑ کو ہم نے اُس شام اس قدر گھورا کہ ہمیں یقین ہے کہ اس کی ٹوپی کی برف ضرور پگھل گئی ہوگی۔ اس کی برفانی ٹوپی پگھلی ہو یا نہ ہو، ہم تو پگھل گئے تھے اور اپنی ہی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک گئے تھے۔ کچھ یادیں ہی ایسی ہوتی ہیں جو دل سے اُبھر کر آنکھوں سے چھلک جاتی ہیں۔

صاحبو! ہم تو خواہ مخواہ سنجیدہ ہو گئے۔ خود بھی رنجور ہوئے، آپ کو بھی ملول کیا۔ آپ کو فیوجی پہاڑ کی برفانی ٹوپی سے اور ہماری یادوں سے کیا مطلب۔ بس اتنی سی گزارش ہے کہ کبھی ٹوکیو جانا ہو تو نومرا بلڈنگ کی پچاسویں منزل پر ضرور جانا۔ ہماری آنکھوں سے فیوجی پہاڑ کو دیکھنا، وہاں کے کافی ہاؤس میں ہمارے ہونٹوں سے چائے پینا، ہمارے ہاتھوں سے شیشہ گھر کی ریلنگ کو ضرور چھونا۔ وہیں کہیں ہمارا اور ہمارے دوستوں کا لمس بھی ہوگا۔ یہ سب کرنا مت بھولنا۔ سمجھ گئے نا۔ تو پھر رہا وعدہ۔

(''جاپان چلو، جاپان چلو۔'' ۱۹۸۰)

☆☆

حرفِ آخر

صاحبو! جب ہم لکھنے پر آتے ہیں تو لکھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ چاہے کوئی ہمارے لکھے کو پڑھے یا نہ پڑھے۔ جاپان کے سفر کے دوران میں ہم پر جو کچھ بیتی اس کا حال لکھ لکھ کر روزنامہ

جاپان کی ممتاز اُردو اسکالر اور سفرنامۂ جاپان کی مترجم مسز شاشورے کے همراه

''سیاست'' حیدرآباد کو بھیجتے رہے۔ اس کتاب میں آپ نے اب تک جو تحریریں پڑھی ہیں یہ اسی دور کی یادگار ہیں جب ہم جاپان کے بارے میں لکھنے کے سوائے کچھ اور لکھنے کے اہل ہی نہیں تھے۔

اس سفر نامہ کی اکثر قسطیں (بشرطیکہ اسے سفر نامہ کہا جا سکے) ہم نے جاپان کے قیام کے دوران میں ہی لکھی تھیں۔ کچھ قسطیں ہندوستان واپس آ کر لکھیں۔ سوچا تھا کہ ذرا اطمینان سے اور جی لگا کے جاپان کے بارے میں مزید کچھ لکھیں گے مگر وطن عزیز میں اطمینان کہاں اور جی کو لگانا کیسا۔

احباب کا جب اصرار بڑھا کہ ان مضامین کو کتابی شکل میں چھپنا چاہیئے تو ہم نے اپنے لکھے ہوئے ان مضامین کو نہ صرف یکجا کیا بلکہ پڑھا بھی۔ ماشاء اللہ اچھے مضامین ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ مگر ان مضامین میں وہی کوتاہی ہے جو ہماری تحریر کا وصف خاص ہے۔ یعنی غیر اہم اور غیر ضروری باتوں کا ذکر کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔ اہم اور کام کی باتیں رہ گئی ہیں۔ اب اسے کیا کیجئے کہ ہم خود اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ لوگ ہماری تحریروں کو پسند ہی اس لئے کرتے ہیں کہ ان میں کام کی باتیں نہیں ہوتیں۔ اب اگر ہم بھی مفید اور کام کی باتیں کرنے لگ جائیں تو بیچارے دوسرے ادیب کیا کریں گے۔ تاہم اِس 'حرفِ آخر' کو لکھنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم بھی جی کڑا کر کے کچھ کام کی باتیں کریں تا کہ ناقد حضرات کو یہ موقع نہ ملے کہ اس سفر نامہ کو ادب برائے ادب کے زمرے میں شامل کر لیں۔ صاحبو! حکومت ہند نے ہمیں اپنے نمائندے کی حیثیت سے پانچ ہفتوں کے لئے جاپان اس لئے روانہ کیا تھا کہ وہاں یونیسکو کی طرف سے منعقد ہونے والے پبلشنگ کے سمینار اور تربیتی کورس میں حصہ لیں۔ اس سمینار کا اس سفر میں کہیں ذکر نہیں ہے۔ اس معاملہ میں ہم جان بوجھ کر خاموش رہے۔ حکومت نے اگر ہمیں طباعت اور اشاعت کا ماہر جانا تو اس میں قصور ہمارا نہیں حکومت کا تھا۔ بھلے ہی حکومت نہ جانے مگر ہم تو اپنی صلاحیتوں کو جانتے ہیں۔ پبلشنگ سے ہمارا تعلق صرف اتنا ہے کہ اب تک ہماری تصنیف کردہ آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں (یہ اور بات ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت کا اہتمام بھی دوسرے اداروں نے کیا ہے) تاہم اس ضمن میں اتنے قصوروار ضرور ہیں کہ چھ سال تک ایک پرنٹنگ پریس کے منیجر رہ چکے ہیں اور ان دنوں اتفاق سے ایک اشاعتی ادارے سے وابستہ ہیں۔ پبلشنگ کے معاملہ میں اس محدود تجربہ کی روشنی میں یہ ناممکن تھا کہ ہم ایک بین الاقوامی سمینار میں جاتے اور وہاں اپنی علمیت کا ڈنکا نہ پٹواتے۔ لہٰذا سمینار کے پہلے دن ہی ہم نے ہندوستان میں کتابوں کی اشاعت کے تعلق سے ایک ایسا بصیرت افروز، معلومات افزاء اور خیال انگیز مقالہ پڑھا کہ سمینار

کے منتظمین نہ صرف عش عش کر اُٹھے بلکہ اپنی اپنی انگلیاں اپنے اپنے دانتوں میں دبالیں (اسی سے ہمیں پتہ چلا کہ جاپان میں بھی دانتوں میں انگلی دبانے کا طریقہ رائج ہے) پہلے دن تو ہم بہت خوش ہوئے کہ ہم نے اپنی علمیت اور مہارت کی دھاک بٹھادی اور اپنے ملک کا نام روشن کیا جس کی خاطر ہمیں جاپان بھیجا گیا تھا۔ لیکن دوسرے دن سے جب جاپانی پبلشروں نے بڑی کسرِ نفسی اور خجالت کے ساتھ (جیسا کہ ان کی عادت ہے) پبلشنگ کے میدان میں اپنی حقیر اور کمترین کاوشوں کا ذکر شروع کیا تو پورے ایک مہینہ تک ہمیں اپنی انگشت شہادت کو دانتوں تلے دبائے رکھنا پڑا۔

صاحبو! اگر ہم نے اس سمینار کا تفصیل سے ذکر نہیں کیا تو اس کی وجہ صرف اتنی تھی کہ ہم اپنے احساس کمتری پر قابو نہ پا سکے۔ سارے ایشیا میں جاپانی سب سے زیادہ 'پڑھا کو' قوم ہے اور دنیا بھر میں ان کے اشاعتی کاروبار کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ جاپانی یا تو لکھتا ہے یا پڑھتا ہے باتیں کم کرتا ہے۔ جہاں جائیے لوگ کتابیں خریدنے اور پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ ٹوکیو میں ایک محلہ ہے 'کندا' جو شہنشاہ جاپان کے محل سے متصل ہے۔ اس میں ہر طرف کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ کتابوں کی اتنی بڑی دکانیں ہم نے کہیں نہیں دیکھیں۔ ہوٹلوں اور تفریح گاہوں میں بھی کتابوں کی فروخت کا انتظام موجود ہے۔ کتاب خریدنے والوں کو اپنے علم کی پیاس بجھانے کے لئے بہت دور جانا نہیں پڑتا۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ چار پانچ سال کی عمر کے بچے بھی بڑے ذوق وشوق سے کتابیں نہ صرف خریدتے ہیں بلکہ انہیں پڑھتے بھی ہیں۔ جاپان کی آبادی تقریباً ساڑھے گیارہ کروڑ ہے اور سال بھر میں تقریباً ۸۰ کروڑ کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ گویا ہر جاپانی سال بھر میں ساڑھے چھ کتابیں ضرور خریدتا ہے (ایک ہم ہیں کہ پڑھنے لکھنے کے معاملے میں اتنی شہرت رکھنے کے باوجود پچھلے تین برسوں میں ہم نے کوئی کتاب نہیں خریدی۔ ہاں ادیب دوستوں کی کتابوں کے اعزازی نسخے ضرور قبول کرتے ہیں اور انہیں پڑھے بغیر ردی میں بیچ دیتے ہیں) بہر حال کچھ ایسے ہی عجیب وغریب احساسات تھے کہ جن کے باعث ہم نے سمینار کے ذکر کو گول کر دیا۔

ایک شخصیت کا ذکر بھی اس سفر نامہ میں تفصیل کا طلبگار تھا مگر ہم اس شخصیت کے سلسلے میں بھی انجان ہی رہے۔ محض یہ سوچ کر کہ ان کا ذکر ان کے شایانِ شان لکھیں گے۔ یہ شخصیت

ہے مسٹر ریو جی ایٹو کی جو یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کے ڈائرکٹر جنرل ہیں۔ جاپانیوں کی عمر کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ تاہم ہمارے اندازے کے مطابق یہ ۷۰ سال کے تو ہونگے ہی۔ مگر دل ان کا نوجوانوں کی طرح دھڑکتا اور دماغ نوجوانوں کی طرح سوچتا ہے۔ انہیں ہر 'ایشیائی چیز' سے پیار ہے۔ مگر وہ ہمیں 'ایشیائی چیز' سے کچھ زیادہ ہی سمجھتے تھے اور ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہمیں عزیز رکھتے تھے۔ نہ جانے ہماری کونسی ادا انہیں بھا گئی تھی۔ ہندوستان سے جاتے ہوئے ہم ان کے لئے چند گھٹیا سے تحفے لے گئے تھے۔ ان تحفوں کو پا کر وہ کچھ اس قدر نہال ہوئے کہ ہم سمینار میں شرکت کے لئے پہنچتے تھے تو اکثر ہماری کرسی پر ان کی طرف سے ہمارے لئے کوئی تحفہ رکھا ہوتا تھا جس پر مسٹر ریو جی ایٹو کی دستخط شدہ تحریر ہوتی تھی .For you Mr. Hussain۔ سمینار میں وہ بہت کم آتے تھے مگر بسا اوقات اپنی سکریٹری کو بھیج کر ہمیں اپنے کمرے میں طلب کرتے تھے۔ اگر چہ ہم کیوٹو کے ایک گیشا گھر کی سیر کر چکے تھے لیکن مسٹر ریو جی ایٹو کی عنایت سے ہمیں ٹوکیو کے ایک گیشا گھر میں بھی جانے کا موقع ملا۔ ٹوکیو میں وہ ہماری آخری رات تھی۔ مسٹر ریو جی ایٹو ہمیں ایک گیشا پارٹی میں لے گئے۔ وہ رات اب بھی ہمارے ذہن میں محفوظ ہے۔ ریو جی ایٹو نے گیشاؤں کو نہ جانے کیا اشارہ کر دیا کہ وہ ہماری خاطر تواضع ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کرنے لگیں۔ یہاں تک کہ کھانا بھی اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے کھلایا۔ ہم آلتی پالتی مارے ان کے سامنے بیٹھے رہے۔ ہمیں سگریٹ کو جلانے تک کی اجازت نہیں تھی۔ کیوں کہ ہم جب بھی سگریٹ جلانا چاہتے تو گیشا گرل آگے بڑھ کر اس سگریٹ کو جلا دیتی تھی۔ رات بھیگ گئی تو گیشاؤں نے مُرکیاں لے لے کر گانا شروع کیا۔ گانا تو خیر ہماری سمجھ میں کیا آتا۔ ریو جی ایٹو کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ ان بیبیوں کا گانا اچھا ہی ہوگا۔ گیشائیں اپنے گانے سے فارغ ہوچکیں تو اصرار کرنے لگیں کہ ہم بھی اپنے وطن کا کوئی گانا سنائیں۔

صاحبو! آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جاپان میں ہمیں گلوکار کی حیثیت سے خاصی شہرت مل چکی تھی۔ وطن میں کسی کو ہماری اس خداداد صلاحیت کی طرف دھیان دینے کی توفیق نہیں ہوئی۔ جاپان کے اکثر ریستورانوں میں گانے کا انتظام ہوتا ہے۔ ایک گھنٹے تک ریستوران کے گلوکار اور موسیقار گانا گاتے ہیں۔ اس کے بعد گاہکوں کو موقع دیا جاتا ہے کہ اگر وہ بھی کچھ سنانا چاہیں تو سنا دیں۔ جاپان میں ہماری آمد کے آٹھ دن بعد ایک رات ریستوران میں کھانا کھا رہے

تھے کہ ایک جاپانی دوست نے خواہش کی کہ ہم بھی کوئی ہندوستانی گانا سنائیں۔ اب جو ہم نے گانا گایا تو احساس ہوا کہ ہندوستانی موسیقی کے اصل قدردان تو جاپان میں ہی موجود ہیں۔ ہم سے کئی گانے سنے گئے۔ ہمیں اتنی داد ملی کہ محمد رفیع اور مکیش کو کیا ملی ہوگی۔ جاپانیوں نے ہمیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ ہم سے پوچھا گیا کہ ہم نے موسیقی کی باضابطہ تعلیم کس سے حاصل کی ہے اور کتنے برس تک اس میں ریاض کیا ہے؟۔ موسیقی کی باضابطہ تعلیم کے سلسلے مین ہم نے نہ جانے کس استاد کا ذکر کیا تھا اب ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔ غالباً بڑے غلام علی خان کا حوالہ دیا تھا۔ کیوں کہ موسیقی کے سلسلے میں ہمیں یہی ایک نام معلوم ہے۔ جاپان میں بھلا کون جانچ پڑتال کرنے والا تھا۔ جہاں تک ریاض کا سوال ہے ہم نے یہ ضرور کہا تھا کہ ہم روزانہ آدھا گھنٹہ موسیقی کے ریاض میں صرف کرتے ہیں۔ دوسرے سوال کا جواب ہم نے صحیح دیا تھا کیوں کہ ہم روزانہ آدھا گھنٹے تک غسل کرنے کے عادی ہیں۔ اس واقعہ کے بعد ہر رات ہمارا یہ معمول سا بن گیا کہ جاپانی ریستورانوں میں کھانا کھانے کے بہانے جاتے اور جاپانیوں کو اپنا گانا سنا کر واپس آتے۔ آخر میں تو ہمارا تعارف ہی ہندوستانی گلوکار کی حیثیت سے کرایا جانے لگا۔ ایک ریستوران کی مالکن تو ہمارے گانے سے کچھ ایسی مسحور ہوئیں کہ ہم سے کھانے کا بل نہیں لیا بلکہ ہمارے آٹوگراف لے کر نمایاں جگہ پر لگادیئے اور اس کے نیچے جاپانی میں لکھ دیا کہ ہندوستان کا ایک مشہور گلوکار اس ریستوران میں آیا تھا۔ یہ ریستوران ٹوکیو کے علاقہ ہراجوکو میں واقع ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی ہندوستانی اس ریستوران میں کھانا کھانے جائے اور اسے اس مشہور گلوکار کا اندازہ لگانے میں دشواری ہو تو اس کی سہولت کے لئے عرض ہے کہ یہ مشہور ہندوستانی گلوکار ہم ہی ہیں۔ اگرچہ وطن مالوف میں ہم مشہور نہیں ہیں۔ مگر جاپان میں تو ہم مشہور ہوگئے تھے۔ وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے۔

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو خاصہ طویل ہوگیا ورنہ ہم تو مسٹر ریوجی ایٹو کی طرف سے دی گئی گیشا پارٹی کا ذکر کر رہے تھے۔ اس رات بھی ہم نے گیشاؤں کے سامنے ہندوستانی موسیقی کے فن میں اپنے بیش بہا کمالات کا مظاہرہ کیا۔ وہ ان کمالات سے اس درجہ متاثر ہوئیں کہ ہمارے ساتھ رقص کرنے پر اصرار کرنے لگیں۔ پانی اب ہمارے سر سے اونچا ہو رہا تھا۔ ہم نے بہت منع کیا۔ معذرت بھی کی کہ ہم نے صرف موسیقی کے فن میں ریاض کیا ہے رقص سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ مگر گیشاؤں کا استدلال یہ تھا کہ موسیقی اور رقص لازم وملزوم ہیں۔ جب گانا گایا ہے

تو رقص بھی کیجئے۔ ہماری حالت دگرگوں ہونے لگی تو ہماری پریشانی کو بھانپ کر مسٹر ریو۔جی ایٹو خود میدان میں آ گئے۔ اور ہمارا ہاتھ پکڑ کر رقص کرنے لگے۔ ہمیں زندگی میں پہلی بار رقص کرنے کی سعادت ٹوکیو میں ہی حاصل ہوئی۔ جس گیشا گرل کے ساتھ ہم نے رقص کیا تھا ہم اس سے آج معافی کے طلبگار ہیں کیوں کہ رقص کے دوران میں کئی مرتبہ ہمارا بھاری پاؤں ان کے نازک پاؤں پر پڑ گیا تھا۔ مگر اللہ رے اس گیشا گرل کی فراخدلی اور دلداری کہ اس نے زبان سے اُف تک نہ کی۔ وضعداری کوئی جاپانیوں سے سیکھے۔ گیشاؤں اور ریو۔جی ایٹو کے ساتھ رقص و موسیقی کی وہ شام ہمیں کبھی نہیں بھولے گی۔ جب رات خوب بھیگ چکی تو دمِ رخصت مسٹر ریو۔جی ایٹو نے ہم سے کہا ''مسٹر حسین! آپ کل جاپان سے چلے جائیں گے۔ ہماری محبت کو یاد رکھئے۔ ایشیائی قوموں میں جب تک محبت نہیں بڑھے گی تب تک ایشیا ترقی نہیں کر سکتا۔''

ہمیں یاد ہے کہ دوسرے دن یونیسکو کے دفتر پر وداعی تقریب منعقد ہوئی تھی۔ سارے مندوبین نے مل کر ہمیں یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ ہم وداعی تقریر کریں (انہیں نہ جانے کس نے بتا دیا تھا کہ ہم وداعی تقریر بہت اچھی کرتے ہیں) جیسا کہ ہماری عادت ہے ہم نے نمک مرچ لگا کر ایک زوردار تقریر تیار کر لی تھی۔ جب ہماری تقریر ختم ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ مسٹر ریو۔جی ایٹو کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہم نے مزید غور سے دیکھا تو ہمیں اپنی آنکھوں میں بھی آنسو دکھائی دیئے اور ہمیں یقین ہو گیا کہ ریو۔جی ایٹو نے کل رات جس محبت کا ذکر کیا تھا وہ سچ مچ پروان چڑھنے لگی ہے۔

ایک اور شخصیت کا ذکر بھی ہم اپنے سفرنامہ میں نہ کر سکے۔ ہماری مراد جاپان کے مشہور گلوکار رسگا ہارا سے ہے۔ ان سے موسیقی سے متعلق یونیسکو کی ایک تقریب میں ملاقات ہوئی تھی۔ پیشہ کے اعتبار سے انجینئر ہیں لیکن موسیقی اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ انہوں نے موسیقی کے ذریعہ ساری انسانیت کو متحد کرنے کا ایک باضابطہ منصوبہ بنایا ہے۔ امریکہ میں ان کے کئی کنسرٹ ہو چکے ہیں۔ ان دنوں وہ کمبوڈیا کے یتیم بچوں کی امداد کے لئے ایک پروگرام پیش کر کے آئے تھے۔ ان سے ہماری ملاقات ہمارے دوست شنجی تاجما نے کرائی تھی۔ پہلی ملاقات میں وہ ہمارے اور ہم ان کے گرویدہ ہو گئے۔ آخر کو دو سچے اور بڑے موسیقاروں کا ملاپ جو تھا۔ مذاق تھوڑا ہی تھا۔ بڑے ملنسار، خلیق، مہذب اور شائستہ آدمی ہیں۔ ان کے ساتھ بڑی خوش گوار شامیں

گزریں۔ جاپان کے بہت مشہور آدمی ہیں۔ جاپان ٹیلی ویژن پر بھی اکثر ان کے پروگرام ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی ہم اُن کے ساتھ کسی ریستوراں میں جاتے تو لوگ انہیں پہچان کر فرمائش کرنے لگ جاتے کہ وہ اپنا گانا سنائیں مگر وہ ازراہ ہمت افزائی و مہمان نوازی و ذرہ نوازی پہلے ہم سے فرمائش کرتے کہ ہم ہی کوئی ہندوستانی گانا سنائیں۔ اور ہم اس کے جواب میں ان کے سامنے تقدیم و تاخیر کا مسئلہ لے بیٹھتے تھے اور انہیں اس نزاکت سے واقف کراتے تھے کہ ہمارے ہاں مشاعروں اور موسیقی کی محفلوں میں بزرگوں اور استادوں کو بعد میں دعوت سخن دی جاتی ہے۔ سگاہارا کا گانا ہم نے کئی بار سنا۔ جاپانی گانے کا مطلب تو خیر ہماری سمجھ میں کیا آتا مگر سگاہارا کی آواز کا جادو ہمارے سارے وجود میں سرایت کر جاتا تھا۔ شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو، والا معاملہ تھا۔

سگاہارا نے ایک شام ہم سے کہا کہ روزانہ جاپانی ریستورانوں میں جاتے جاتے آپ تھک گئے ہوں گے۔ آج آپ کو ایک مغربی ریستوران میں لے چلتے ہیں۔ ہم شاید پہلے بتا چکے ہیں کہ جاپانی ریستورانوں میں روشنی بہت زیادہ ہوتی ہے اور اس وافر روشنی کا شخصی فائدہ ہمیں یہ پہنچتا تھا کہ ہم کھانے کی ہر شئے کو دیکھ سمجھ کر اور ٹھونک بجا کر کھایا کرتے تھے (جاپانی کھانے کے نام پر ہر چیز کھا لیتے ہیں)۔ مغربی ریستوران میں پہنچے تو ماحول خاصا نیم تاریک تھا۔ سگاہارا نے تجویز رکھی کہ کھانے سے پہلے کچھ چرندم خورندم یعنی snacks بھی منگوا لیتے ہیں۔ ہم نے کہا آپ کے مہمان ہیں آپ جو چاہیں سو منگائیں۔ بس اتنا کرم کریں کہ سور کے گوشت سے ہمیں محفوظ رکھیں۔ سگاہارا نے بیرے کو بلا کر بڑی دیر تک آرڈر دیا اور تھوڑی دیر بعد ایک پلیٹ میں بادام کی شکل کی کچھ چیزیں لا کر ہمارے سامنے رکھ دی گئیں۔ ہم نے بسم اللہ کی اور اس شئے کو منہ میں ڈالا تو اس شئے کا ذائقہ بھی بادام کا سا لگا بلکہ بادام سے کچھ زیادہ ہی اچھا لگا۔ ہم نے بیک وقت چار پانچ بادام منہ میں ڈالے اور از راہ تحسین سگاہارا سے کہا ''برادر عزیز! جاپان کے بادام تو ذائقہ میں بے حد لذیذ اور خستہ ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے بادام اتنے لذیذ نہیں ہوتے''۔ ہماری بات کو سن کر شنجی تاجیما نے کہا ''مسٹر حسین! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ بادام نہیں ہیں''۔

ہم نے کچھ دیر سوچ کر کہا ''تو پھر چلغوزے ہوں گے'' (ہمیں سوچنے میں دیر اس لئے ہوئی کہ ہمیں چلغوزے کی انگریزی ہاتھ نہیں آ رہی تھی) اس کے جواب میں تاجیما نے نفی میں سر

ہلایا۔ ہمارا خیال پستہ کی طرف گیا۔ مگر ہمارے ذہن میں پستے کی انگریزی نہیں آئی۔ یوں بھی ہم شیکسپیر، ٹی ایس ایلیٹ یا سامرسٹ مام تھوڑے ہی ہیں کہ پستے کی انگریزی تک یاد رکھیں۔ لہٰذا اپنی انگریزی دانی سے مجبور ہو کر تاجیما سے پوچھ بیٹھے کہ جان من آخر یہ کیا چیز ہے؟ تاجیما نے کہا "مسٹر حسین! یہ Grass Hoppers ہیں۔"

یہ سن کر ہمارے منہ سے اُردو میں بے ساختہ نہ صرف "ٹڈّے" کا لفظ نکلا بلکہ دو عدد سالم ٹڈّے بھی نکل آئے۔ جاپانی ہونے کے ناطے تاجیما نے ٹڈّے کو بھی انگریزی لفظ جانا اور تردید کے طور پر اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں کو ملا کر گھاس میں ٹڈّے کے اچھلنے کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ No Mr. Hussain. This is not Tidda. This is Grass Hopper۔ ٹڈّے کی اصلیت جانتے ہی ہماری زبان پر اب تک بادام کا جو ذائقہ تھا وہ کافور ہو گیا۔ ہم نے اچھا اچھا کہہ کر ٹائلٹ کا رخ کیا۔ بڑی دیر تک ٹڈّوں کو اپنے پیٹ میں سے باہر نکالنے کی کوشش کی مگر اس دن نہ جانے ٹڈّوں کو کیا ہو گیا تھا کہ اچھل کر پیٹ سے باہر ہی نہ آتے تھے۔ جب ہم کلّیوں سے فارغ ہو کر دوبارہ کھانے کی میز پر آئے تو ٹڈّوں کے ذائقہ کے سلسلے میں ہماری تعریف سے متاثر ہو کر سگاہارا نے ٹڈّوں کی ایک اور پلیٹ منگوالی تھی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ مغربی ریستوران میں نیم تاریکی تھی۔ ہم ٹڈّوں کو جھوٹ موٹ ہی منہ تک لے جاتے تھے اور پھر مناسب موقع پا کر انہیں جیب میں اتار لیتے تھے۔ تاجیما نے بتایا کہ جاپان میں ٹڈّے بہت قیمتی ہوتے ہیں۔ ایک سوین میں ایک ٹڈّا ملتا ہے۔ یوں بھی جاپان میں کاشت کے ترقی یافتہ طریقوں کے باعث ٹڈّے نہیں پائے جاتے۔ انہیں کوریا سے درآمد کیا جاتا ہے۔ انہیں بہت سلیقہ سے بھونا جاتا ہے۔ تبھی تو یہ اتنے ذائقہ دار اور خستہ ہوتے ہیں۔

وہ ٹڈّوں کی افادیت کی اور ہم ان کے ذائقہ کی تعریف کرتے رہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس رات ہمارے حصہ میں پندرہ سوین کے ٹڈّے آئے تھے۔ پانچ سوین کے ٹڈّے تو ہم کھا چکے تھے۔ بقیہ ایک ہزار ین کے دس عدد ٹڈّے ہم نے اپنے ہوٹل پر واپس آ کر جیب میں سے برآمد کئے تھے۔ کمبختوں کو اس خوبی سے بھونا گیا تھا کہ ان کی مونچھیں تک صاف دکھائی دیتی تھیں۔ اگر کبھی آپ جاپان جائیں اور آپ کو بادام کھانے کا موقع ملے تو دیکھ لیجئے کہ کہیں اس بادام کے مونچھیں تو نہیں ہیں۔ سگاہارا اس رات دو باتوں کی وجہ سے بہت خوش تھے۔ پہلی وجہ تو یہ کہ

ہمیں ٹڈوں کا ذائقہ پسند آیا تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ اُس دن اُن کے گانے کا نیا ریکارڈ بازار میں آیا تھا۔ پہلا ریکارڈ وہ ہمارے لئے لے آئے تھے۔ بڑی محبت سے ہمیں یہ ریکارڈ پیش کیا اور کہا ''ہندوستان میں یہ ریکارڈ بجایا کیجئے تا کہ میں آپ کو یاد آ سکوں''۔ سگاہارا ہمیں سچ مچ یاد آتے ہیں۔ ہم اُن کا ریکارڈ بجا کر ہی انہیں یاد نہیں کرتے بلکہ جہاں کہیں بھی ٹڈا نظر آتا ہے تو سگاہارا کی یاد ہمارے ذہن میں اچھلنے لگتی ہے۔

ایسی ہی کتنی لطیف اور مزے دار باتیں تھیں جن کے ذکر سے یہ سفرنامہ خالی ہے۔ ہم یوکوہاما، کیوٹو اور نارا بھی گئے۔ ان شہروں کا حال احوال بھی اس سفرنامہ میں بیان نہ ہوسکا۔ نارا جاپان کا قدیم دارالحکومت رہا ہے۔ بعد میں کیوٹو دارالحکومت بنا۔ پچھلی صدی کے آخری ربع تک جاپان کے شہنشاہ یہیں رہا کرتے تھے۔ نارا اور کیوٹو کے پگوڈوں کو دیکھ کر ہم دم بخود رہ گئے۔ لکڑی کی ایسی عظیم الشان عمارتیں بنانا جاپانیوں کا ہی حصہ ہے۔ جاپان کے ان دو قدیم شہروں میں جاپان کی تاریخ خوابیدہ ہے۔ جاپانیوں کی قسمت کے فیصلے یہیں ہوتے تھے۔ کیوٹو کے ہالی ڈے ان ہوٹل کی کھڑکی سے آدھی رات کے وقت چاندنی میں سوئے ہوئے اس شہر کو دیکھتے تھے تو جاپان کی تاریخ کے کئی کردار ہمارے تصور میں زندہ ہو جاتے تھے۔ ان شہروں کی اسی تاریخی وتہذیبی اہمیت کے پیشِ نظر دوسری جنگِ عظیم میں ان شہروں پر بمباری نہیں کی گئی۔ کیوٹو ہی وہ شہر ہے جہاں ۱۸۶۸ء میں توکوگاوا فوجی حکمران خاندان کے آخری سربراہ نے شہنشاہ جاپان میجی کو اقتدار سونپا تھا کہ حضرت آپ ہی اس ملک کو سنبھالئے۔ ہم سے یہ نہیں سنبھلتا۔ ۱۸۶۸ء سے پہلے دنیا میں جاپان کی کوئی حیثیت تھی نہ اہمیت۔ میجی حکومت نے ہی وہ انقلابی فیصلے کئے جن کی بنا پر جاپان آج اتنی ترقی کرچکا ہے۔ شہنشاہ میجی کی حکومت نے ہی جاپان کے تعلقات امریکہ اور یوروپی ممالک سے پیدا کئے ورنہ اس سے پہلے جاپان گوشہ نشین سا ملک تھا۔ جاپانیوں نے صرف ایک صدی کے اندر مغربی ممالک کی سائنس اور ٹکنالوجی سے کچھ اس طرح استفادہ کیا کہ آج ترقی کے میدان میں مغربی ممالک سے آگے نکل گئے ہیں۔ ہم جاپان کی حیرت انگیز ترقی کا حال بھی لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ سوچ کر ٹال گئے کہ ممکن ہے آپ جس گھڑی کو دیکھ دیکھ کر اپنی عمر عزیز کا قیمتی وقت ضائع کررہے ہیں، وہ جاپانی ہو، آپ جس کیمرے کی مدد سے اپنی زندگی کے خوشگوار واقعات کو محفوظ کررہے ہیں وہ جاپانی ہو، آپ کے کان جس مدھر آواز کو سن رہے ہیں وہ شاید کسی جاپانی

ٹرانزسٹر یا ٹیپ ریکارڈ سے آ رہی ہو۔ آپ جس ٹیلی ویژن پر کوئی خوبصورت فلم دیکھ رہے ہوں وہ شاید جاپانی ہو۔ اگر آپ موٹر نشین ہیں تو آپ کے دل میں شاید یہ تمنا بھی ہوگی کہ ایک دن کوئی جاپانی موٹر آپ کے در پر کھڑی ہو۔ جاپانیوں نے اپنی اشیاء کے ذریعہ ساری دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ ہم کچھ لکھ کر اس تہلکہ میں مزید کیا اضافہ کر سکتے تھے۔

صاحبو! ٹوکیو میں ہم نے بہت آوارہ گردی کی۔ بلکہ آوارہ گردی کے سوائے کچھ بھی نہیں کیا۔ ہر رات ایک دو بجے سے پہلے اپنے ٹھکانے پر واپس نہیں آتے تھے۔ ابتداء میں ڈر ہوتا تھا کہ کسی دن کوئی چور اُچکا ہماری مزاج پرسی نہ کرلے۔ مگر ہمیں کوئی چور اُچکا نہ ملا۔

جاپان وہ واحد ملک ہے جہاں جرائم کی تعداد سب سے کم ہے۔ اگر چہ ہمیں پولیس نظر نہیں آتی تھی مگر پھر بھی ہر طرف امن ہی امن نظر آتا تھا۔ ہماری طرح نہیں کہ پولیس تو جگہ جگہ نظر آتی ہے مگر امن و امان کہیں نظر نہیں آتا۔ سارے جاپان میں مصیبت کے وقت پولیس کو طلب کرنے کا ایک ہی فون نمبر ہے۔ اگر آپ ایک فون کر دیں تو پولیس زیادہ سے زیادہ تین منٹ تیئس سکنڈ کے اندر اندر مقام واردات پر پہنچ جاتی ہے۔ ہماری پولیس کی طرح نہیں کہ فون کرنے کے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد بڑے اطمینان کے ساتھ سیٹیاں بجاتی ہوئی چلی آتی ہے۔ ہماری پولیس امن کم قائم کرتی ہے اور سیٹیاں زیادہ بجاتی ہے۔

سچ بات تو یہ ہے کہ جاپان میں ۳۵ دن گزارنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ جاپان بڑا غریب اور مفلوک الحال ملک ہے۔ جاپانیوں کے پاس نہ وسائل ہیں نہ معدنیات کے ذخائر۔ کوئی خام مال ان کے پاس نہیں ہے۔ زراعت بھی بس ایسی ہے کہ اپنا پیٹ بھر سکیں۔ جاپان کے غریب باشندے سارا خام مال دوسرے ملکوں سے درآمد کرتے ہیں۔ ان کا کمال صرف اتنا ہی ہے کہ اس خام مال سے دنیا جہاں کی چیزیں بناتے ہیں اور دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کو پریشان کرتے ہیں۔ جاپانیوں کے پاس ایک ہی قابل قدر شئے ہے اور وہ ہے اُن کا کردار۔ ہم اکثر سوچتے ہیں کہ یہ جو ہم جاپانی گھڑیوں، ٹرانزسسٹروں، موٹروں، کیمروں اور ٹیلی ویژن سیٹوں کو اپنے ملک میں قانونی اور غیر قانونی طور پر درآمد کرنے میں لگے ہوئے ہیں تو یہ غلط بات ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم کسی طرح جاپانیوں کے کردار کو درآمد کرلیں۔ اس پر اکسائز ڈیوٹی بھی نہیں لگے گی اور کسٹم والوں کے ہاتھوں آپ کو پریشان بھی نہیں ہونا پڑے گا۔ اس مسئلہ پر ذرا سنجیدگی سے غور کرنے کی

ضرورت ہے۔ چونکہ ہم سنجیدگی سے غور کرنے کے عادی نہیں ہیں اس لئے اس مسئلہ کو آپ سے رجوع کررہے ہیں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آپ بھی اس مسئلہ کو کسی اور سے رجوع کردیں گے۔ یہی تو ہمارے کردار کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

اس سفرنامہ میں ہم اُن ساتھی مندوبین کا بھی ذکر نہ کرسکے جن کی مستقل رفاقت میں ہم نے جاپان کے شب وروز گزارے۔ اگرچہ بارہ ممالک کے مندوبین یونیسکو کے اس سمینار میں شریک تھے مگر ان میں سے سری لنکا کے مندوب جیا کوڈی، تھائی لینڈ کی مندوب (بلکہ مندوبہ) مس پر بینیا اور کوریا کے مندوب مسٹر کم Kim کی یاد ہمیں اب بھی اکثر آتی ہے۔ ہم نے جان بوجھ کران کا قصہ نہیں چھیڑا۔ کیونکہ ذکر ان 'پری وشوں' کا ہو اور 'بیان' ہمارا تو اس قصہ کو ختم کرنا مشکل ہو جاتا۔ سری لنکا کے مندوب جیا کوڈی ہمیں انگریزی میں Big Brother یعنی بڑا بھائی کہتے تھے۔ دنیا کے نقشہ میں سری لنکا اور ہندوستان کے محل وقوع اور رقبہ کے پس منظر میں اگر وہ ہمیں بڑا بھائی کہتے تھے تو ٹھیک ہی کہتے تھے مگر کئی معاملوں میں وہ اپنے بڑے بھائی سے بھی آگے نکل جاتے تھے۔ مسخرگی ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بھلا ہمیں کیونکر نہ بھاتے۔ سری لنکا کے بہت بڑے پبلشر ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سری لنکا کے اُس وقت کے وزیر اعظم مسٹر پریم داس کی تصنیف کردہ کتابوں کے پبلشر بھی یہی ہیں۔ (مسٹر پریم داس سری لنکا کے مشہور ادیب ہیں)۔ اپنے وزیر اعظم کی کئی کتابوں کا بوجھ بھی اپنے ساتھ لاد کر جاپان لے آئے تھے۔ جس کسی سے ملاقات ہوتی فوراً اس کی خدمت میں اپنے وزیر اعظم کی کتابوں کا تحفہ پیش کر دیتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے کہ چلو سامان کا کچھ بوجھ تو کم ہوا۔ اکثر کہتے تھے کہ سری لنکا کے وزیر اعظم نے انہیں بطور خاص اس سمینار میں شرکت کے لئے نامزد کیا ہے۔ ہر دم وزیر اعظم سری لنکا سے اپنے گہرے روابط و مراسم کا ذکر کرتے اور ہم سے پوچھتے رہتے کہ ہندوستان کی وزیر اعظم سے ہمارے مراسم کیسے ہیں۔ ہمیں بھی جواباً کہنا پڑتا تھا کہ ہمیں بھی ہندوستان کی وزیر اعظم نے بطور خاص اس سمینار میں شرکت کے لئے بھیجا ہے اور یہ کہ ہم بھی وزیر اعظم ہندوستان کے خاص آدمی ہیں اور ہمارے مشورے کے بغیر حکومت ہند کوئی فیصلہ نہیں کرتی۔ ہم اپنی دانست میں یہ سمجھتے تھے کہ جیا کوڈی چونکہ صرف ڈینگ ہانکتے ہیں اس لئے ہمیں بھی ڈینگ ہانکنے کا حق حاصل ہے۔ مگر انہیں دنوں جب وزیر اعظم سری لنکا جاپان کے سرکاری

دورے پر آئے تو وہ ہمیں اپنے وزیراعظم سے ملانے کے لئے لے گئے۔ ملاقات سے پہلے ہمیں پابند بھی کیا کہ ہم ان کے وزیراعظم کی دو چار کتابیں پڑھ کر چلیں اور ان کے بارے میں رائے بھی دیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وزیراعظم سری لنکا سے جیا کوڈی کے بیچ مچ بہت گہرے اور بے تکلفانہ مراسم ہیں۔ جیا کوڈی یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان اور سری لنکا کے بیچ یہ جو چند نزاعی اُمور ہیں تو ان کے سلجھانے کے لئے ہم اپنے اثرات اور رسوخ کو کام میں لے آئیں۔ کہتے تھے میں اپنے وزیراعظم کو سمجھاتا ہوں تم اپنی وزیراعظم کو سمجھاؤ۔ جیا کوڈی نے ہمیں سری لنکا آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ کہتے تھے کہ تمہارا سرخ قالین والا خیر مقدم کرواؤں گا۔ مگر وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ ان کے سری لنکا اور ہمارے ہندوستان واپس آنے کے چند ہی دنوں بعد مسٹر پریم داس کی حکومت ٹوٹ گئی۔ جس حکومت کے مشیر جیا کوڈی ہوں اس کا یہ حشر تو ہونا ہی تھا۔

ایک دن ہم نے جیا کوڈی سے شکایت کی کہ آپ اپنے وزیراعظم کی کتابیں ہر کس و ناکس کو کیوں پیش کرتے رہتے ہیں۔ بڑی سنجیدگی سے بولے ''سری لنکا میں تو ان کتابوں کو کوئی نہیں پڑھتا''۔ پھر اپنے وزیراعظم کی کتابوں کے انبار کی طرف اشارہ کر کے بولے ''جب تک میں اپنے سامان میں سے ان ناپسندیدہ کتابوں کے بوجھ کو کم نہیں کر دیتا تب تک جاپان سے اپنا پسندیدہ سامان نہیں لے جا سکتا۔'' ہوٹل کے عملہ میں بھی وزیراعظم سری لنکا کی کتابیں خاصی مقبول ہو گئی تھیں۔

جیا کوڈی بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ کبھی ہم لوگ کسی مقام سے دو ٹیکسیاں لے کر اپنے ہوٹل پہنچتے تھے تو وہ بڑے غور سے دونوں ٹیکسیوں کے میٹر کا مطالعہ ضرور کرتے تھے اور اس بات پر گھنٹوں اظہار حیرت کرتے رہتے تھے کہ دونوں ٹیکسیوں کے کرایہ کی رقم یکساں کیوں ہوتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ سری لنکا کی ٹیکسیاں کرایہ کے معاملہ میں کبھی 'ہم خیال' اور 'متفق' نہیں ہوتیں۔ ایک ٹیکسی کا کرایہ دوسری ٹیکسی سے نہیں ملتا۔ انہیں اس بات پر دکھ ہوتا تھا کہ بھلے ہی جاپانی بے ایمانی نہ کریں مگر ان کی مشینوں کو تو تھوڑی بہت بے ایمانی کرنی چاہیئے۔ ہماری مشینوں کو دیکھو کہ ہماری ہی طرح دھوکہ باز ہوتی ہیں۔

اس سال کے اوائل میں جیا کوڈی ہندوستان آئے تھے۔ دہلی پہنچتے ہی ہمیں فون کیا۔ ہم ملنے گئے تو بڑی دیر تک جاپانیوں کی طرح جھک جھک کر ہمارا استقبال کرتے رہے۔ ہم نے بھی

جواباً جھکنا شروع کیا تو جاپان میں قیام کے دنوں کو یاد کر کے زوردار قہقہہ لگایا اور بولے ''مسٹر حسین! یاد کرو ہم بھی کن ایماندار، مہذب اور بااخلاق لوگوں کے بیچ پھنس گئے تھے۔ میرا تو دم گھٹتا تھا۔ میرا بس چلے تو جاپان کو ایشیا سے نکال دوں''۔ جیا کوڈی نے ہمیں بتایا کہ وہ سیر وسیاحت کی غرض سے ہندوستان نہیں آئے ہیں بلکہ صرف ہم سے ملنے آئے ہیں۔ مگر ٹیکسیوں میں گھوم کر انہوں نے جس طرح دہلی کے تاریخی مقامات دیکھے اس سے ہمیں شبہ ہوا کہ ان کے سفر کی اصلی غرض وغایت تو سیر وسیاحت ہی تھی۔ ہم سے ملنے کا تو صرف ایک بہانہ تھا۔ جب ہم دہلی کے ٹیکسی ڈرائیوروں سے کرایہ کے مسئلہ پر لڑتے تھے تو بہت خوش ہوتے تھے۔ کہتے تھے ہندوستان اور سری لنکا کی تہذیب کے کئی عناصر مشترک ہیں۔ جب تک ٹیکسی ڈرائیور سے جھگڑا نہ کرو ٹیکسی میں بیٹھنے کا لطف ہی نہیں آتا۔ ایک دن ہم نے ان کے سابق وزیراعظم کا حال پوچھا تو بولے ''میرے وزیراعظم کو مارو گولی۔ ذرا اپنا حال سناؤ۔ تم تو کہتے تھے کہ تم ہندوستان کی وزیراعظم کے خاص آدمی ہو۔ ہم نے تمہیں اپنے وزیراعظم سے ملایا تھا۔ اب ہم ہندوستان آئے ہیں تو اپنی وزیراعظم سے بھی ملاؤ۔''

ہم نے کہا ''جیا کوڈی! وہ سب جاپان کی باتیں تھیں۔ ہندوستان کی وزیراعظم سے ملنا کوئی آسان کام نہیں۔''

بولے ''بھئی تم تو کہتے تھے کہ تم وزیراعظم کے خاص آدمی ہو۔ کیا یہ بات غلط تھی''۔

ہم نے کہا ''جیا کوڈی! یہ بات غلط نہیں تھی۔ بلاشبہ ہم اپنی وزیراعظم کے خاص آدمی ہیں کیونکہ پچھلے انتخابات میں ہم نے انہیں ووٹ دیا تھا۔ اس اعتبار سے ہمارے خاص آدمی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم ان سے تمہاری ملاقات نہیں کرا سکتے''۔

ہماری بات کو سن کر انہوں نے ہمیں خالص ہندوستانی میں وہ گالی دی جسے انہوں نے ہم سے ہی جاپان میں سیکھا تھا۔ اس گالی کا قصہ کچھ یوں ہے کہ جیا کوڈی نے ایک دن ہم سے پوچھا کہ ہندوستانی میں مہذب اور شایستہ سلام کے لئے کن الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم نے ان سے ''نمستے'' کہنے کے لئے کہا۔

بولے ''نمستے تو میں جانتا ہوں۔ کوئی اور مہذب سلام سکھاؤ''

ہم نے ''آداب عرض'' کا نسخہ تجویز کیا۔

بولے'' یہ بھی نہیں چلے گا۔کوئی ایسا سلام سکھاؤجو بہت ہی مہذب ہو''

ہمیں مذاق سوجھا اور ہم نے انہیں ایک نا قابل اشاعت گالی سکھادی۔ بہت خوش ہوئے اور ہر صبح کو اسی گالی سے ہمارا استقبال کرنے لگے۔ہم بھی جی ہی جی میں خوش ہوتے رہے کہ چلو دیارِ غیر میں کوئی ہمیں گالی دینے والا بھی ہے۔ایک دن ہم لوگ گنزہ کی ایک ہندوستانی ریستوران میں کھانا کھانے گئے۔جیا کوڈی نے اتنی محنت سے ہم سے یہ سلام سیکھا تھا۔اسی نادر موقع کو بھلا کس طرح ہاتھ سے جانے دیتے۔انہوں نے ہندوستانی بیرے کو بلا کر نہایت ادب کے ساتھ اپنی دانست میں ہمارا سکھایا ہوا سلام عرض کر دیا۔ہم چپ چاپ بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے۔ بیرے نے منیجر سے شکایت کی اور جب منیجر ان سے باز پرس کرنے کے لئے آیا تو جیا کوڈی نے جھک کر پھر یہی سلام ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔منیجر سمجھدار آدمی تھا۔اس نے جان لیا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔اس نے الگ لیجا کر جیا کوڈی کو سلام کے معنی ومفہوم سے آگاہ کیا۔جیا کوڈی ٹیبل پر واپس آئے تو نہایت غیر مہذب لہجہ میں یہی سلام ہماری خدمت میں پیش کرتے ہوئے بولے'' تم بہت سنگین مذاق کرتے ہو، وہ تو اچھا ہوا کہ منیجر شریف آدمی تھا اگر کوئی دوسرا ہندوستانی ہوتا تو نہ جانے اس سلام کا جواب مجھے کس طرح دیتا''۔ بعد میں جیا کوڈی نے بہت چاہا کہ ہم بھی سنہالی زبان میں ان سے سلام کرنے کے مہذب اور شائستہ کلمات سیکھ لیں۔مگر ہم نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔غرض جیا کوڈی بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ان کی ذات بے برکات کے باعث جاپان میں جی کھول کر ہنسنے کے بے شمار مواقع ملے۔وہ جہاں بھی رہیں خوش رہیں اور اپنے وزیر اعظم کی کتابیں چھاپتے رہے۔

جنوبی کوریا کے مندوب مسٹر کم نہایت سنجیدہ، متین اور خاموش طبع آدمی تھے۔کوریا کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ہر اعتبار سے جیا کوڈی کی ضد تھے۔ ہمارے سوائے کسی سے بات نہیں کرتے تھے۔ہمیشہ خاموش اور گمبھیر رہنا ان کی عادت تھی۔روزانہ اپنی بیوی کے خط کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔جس دن خط نہیں آتا تھا اپنا غم غلط کرنے کے لئے ہمارے پاس آجاتے تھے اور کوریائی ادب کی نزاکتوں، لطافتوں، تہہ داریوں اور باریکیوں سے ہمیں واقف کراتے تھے۔ جیا کوڈی سے ان کی بالکل نہیں بنتی تھی۔اور وہ جیا کوڈی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔کہتے تھے صرف تمہاری وجہ سے جیا کوڈی کو برداشت کرتا ہوں۔دوسری طرف جیا کوڈی بھی کم کے تعلق

سے یہی جملہ ہم سے بولتے تھے۔ جیا کوڈی کا خیال تھا کہ جو آدمی اپنی بیوی کے خط کے لئے اتنا بے چین رہتا ہو وہ اور تو سب کچھ ہو سکتا ہے افسانہ نگار ہر گز نہیں ہو سکتا۔ مگر، کم کی یہی ادا ہمیں بہت بھاتی تھی۔

دوپہر کے کھانے میں یہ دونوں حضرات ہمارے ساتھ ہوتے تھے۔ مینو کے مسئلہ پر ان دونوں میں کبھی اتفاق رائے نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا ثالث کی حیثیت سے یہ مسئلہ ہم ہی حل کرتے تھے۔

ایک دن، کم نے کہا ''آج دوپہر کا کھانا آپ کے ساتھ نہیں کھاؤں گا؟''

ہم نے پوچھا ''بھوک نہیں لگی ہے کیا؟''

بولے ''نہیں! آج بہت بھوک لگی ہے۔ یہیں قریب میں ایک کوریائی ریستوران ہے۔ آج میں کوریائی کھانا کھاؤں گا؟''

ہم نے کہا ''ایسی بات ہے تو چلو آج ہم بھی کوریائی کھانا کھالیتے ہیں۔ دیکھیں کیسا ہوتا ہے؟''

اس پر جیا کوڈی نے ہمیں کہنی مار کر کہا ''ان سے پوچھو یہ ہمیں کوریائی ریستوران میں کیا کھلائیں گے؟''

کم نے کہا ''میں تو کُتا کھاؤں گا؟''

ہمیں اپنی سماعت پر اعتبار نہ آیا۔ پوچھا ''پھر سے بتاؤ کیا کھاؤ گے؟''

کم نے بآواز بلند کہا ''میں تو کتے کا گوشت کھاؤں گا۔ آپ جو پسند کریں کھائیں''۔

جیا کوڈی نے اُبکائی لیتے ہوئے اور کتے کے بھونکنے کی آواز نکالتے ہوئے کہا ''ہف ہف! کرا! کیا تم کتا کھاؤ گے؟''

کم نے کہا ''تم سری لنکا کے باشندے ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ کوریائی کتا کتنا لذیذ ہوتا ہے۔ کوریا کا پیلے رنگ کا کتا عام کتوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کے گوشت کی لذت دنیا کے کسی جانور کے گوشت میں نہیں ہوتی''

اب کی بار ہم نے اپنی اُبکائی کو روکتے ہوئے، کم سے کہا ''بھائی! تم جیا کوڈی سے بحث میں نہ پڑو۔ جاؤ اور اطمینان سے کتا کھا آؤ''۔

کم چلے گئے تو جیا کوڈی نے اس دن دوپہر کا کھانا بالکل نہیں کھایا۔ ہمارے سامنے

بیٹھے ''ہف ہف ہف'' کرتے رہے۔ ہم نے کھانے کے لئے اصرار کیا تو بولے'' میں بلی کھانا چاہتا ہوں۔ کھلاؤ گے؟ میں چوہا کھانا چاہتا ہوں کھلاؤ گے؟۔ میں گدھا کھانا چاہتا ہوں، کھلاؤ گے؟۔ میں بچھو کھانا چاہتا ہوں، کھلاؤ گے۔ ہف ہف ہف''۔

جیا کوڈی کی باتیں سن کر ہم نے بھی کھانے سے ہاتھ روک لیا۔

سمینار کے دوپہر کے اجلاس میں ِکم کوریائی کتا کھا کر واپس آئے تو بہت خوش تھے۔ جیا کوڈی پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتے رہے۔ ِکم کبھی ہنستے نہیں تھے مگر اس دن ہم سے بہت ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ آخر کو اپنا من پسند کتا جو کھا کر آئے تھے۔

جیا کوڈی نے چپکے سے ہمارے کان میں کہا'' یہ ضرور کتے کی دُم کھا کر آیا ہے۔ تبھی تو تمہاری خوشامد کر رہا ہے اور تمہارے آگے بچھا جا رہا ہے''۔

ہم نے جیا کوڈی کو ٹوکا تو انہوں نے خفیف آواز میں یوں'' ہف ہف'' کہا جیسے کتے کا پلّہ بول رہا ہو۔ اس کے بعد سے ِکم جہاں بھی نظر آتے جیا کوڈی'' ہف ہف'' کرنے لگ جاتے۔

ِکم بہت کم گو تھے۔ دن بھر میں جتنے جملے بولتے تھے اس کا حساب جیا کوڈی رکھتے تھے۔ شام کو یہ حساب ہمارے سامنے پیش ہوتا تھا۔ کبھی ان جملوں کی تعداد پندرہ سے بڑھنے نہیں پائی (جملوں کا ان کا سب سے بڑا اسکور اُس دن تھا جب انہوں نے کتا کھایا تھا)۔ اتنا کم بولنے کے باوجود سمینار کے خاتمہ کے بعد جب وہ جانے لگے تو ہم سے بچھڑتے وقت ان کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ ہمیں یوں لگا جیسے وہ ہم سے بہت کچھ بول گئے ہوں۔

تھائی لینڈ کی مندوب مس پرینیا کی شخصیت کی دلنوازی کا حال ہم کیا بیان کریں۔ بڑی دلاویز اور موہنی سی ہستی ہیں۔ بنکاک میں ایجوکیشن افسر ہیں۔ ہنسنا اور لگاتار ہنسنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ہماری باتوں پر گھنٹوں ہنسا کرتی تھیں۔ ہنسنے سے فرصت ملتی تو پھر انہیں باتوں پر از سرِ نو اور بہ اندازِ دگر ہنسنے لگ جاتی تھیں۔ ان میں ہنسنے کی یہ انوکھی صلاحیت نہ جانے کہاں سے آئی تھی۔ ہم اتنا ہنسیں تو خون تھوکنے لگ جائیں۔ ہماری باتوں پر فریفتہ تھیں اور بہ زبان انگریزی ہم سے کہتی تھیں Mr. Hussain you are a real man۔ ہم نے اپنی ناچیز ہستی کے بارے میں ان کی قیمتی رائے کو انگریزی میں جوں کا توں اس لئے پیش کیا ہے کہ اُردو میں اس جملہ کے ترجمے سے

غیر ضروری اور بے بنیاد شکوک وشبہات کے پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ انگریزی زبان میں جو تہہ داریاں ہیں وہ اُردو میں کہاں۔ غرض مس پر بینیا ہر دم ہنستی رہتی تھیں۔ ہم نے کسی خاتون کو آج تک اس قدر بے تحاشہ اور والہانہ انداز میں ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ سمینار میں سنجیدہ بحث چل رہی ہوتی تو تب بھی ان کی خوش مزاجی کو چین نہیں آتا تھا۔ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزوں پر سمینار کی بحث کے تعلق سے دلچسپ جملے لکھ کر ہماری طرف بڑھادیتی تھیں۔ اور جب ہم ان کے جملوں پر دلچسپ تبصرے لکھ کر بڑھادیتے تو ٹیبل کے نیچے اپنا منہ ڈال کر ہنسنے لگ جاتی تھیں۔ بعض بعض تبصروں پر تو انہیں جی کھول کر ہنسنے کے لئے ٹائلٹ میں جانے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ سمینار کے بعد ہمارے ایسے تبصروں پر اظہار خفگی کرتیں اور فرماتی تھیں۔ You naughty man ! You make me go to toilet to laugh at your funny remarks. ہماری مزاح نگاری پر اُردو میں آج تک کسی ناقد نے ایسا بھر پور تبصرہ نہیں کیا۔

مس پر بینیا کا دوسرا محبوب مشغلہ اپنے منگیتر کو خط لکھنا تھا۔ شام میں کہیں گھومنے کا پروگرام بنتا اور ہم انہیں بلانے کو پہنچتے تو کہتیں ''بس ذرا سا توقف کریں۔ اپنے منگیتر کے نام خط کو مکمل کرلوں۔'' خط لکھتی جاتی تھیں اور ساتھ ساتھ ہنستی بھی جاتی تھیں۔ پتہ نہیں کیا کیا لکھتی تھیں۔ اِدھر ہم منتظر رہتے کہ ان کا خط ختم ہو تو یہاں سے چلیں۔

ہم بے چین ہو کر کہتے ''مس پر بینیا! دیر ہو رہی ہے''

قلم کو اپنے گال پر رکھ کر فرماتیں ''آپ ہی کی وجہ سے دیر ہو رہی ہے۔ اپنے منگیتر کو آپ کی دلچسپ باتیں لکھ رہی ہوں''۔

فرماتیں ''آپ کو پتہ نہیں۔ وہ بہت خوش ہوگا۔ وہ بھی آپ ہی کی طرح Naughty man ہے''۔ بنکاک سے جب ان کے منگیتر کا خط آتا تو اس کے 'قابل اشاعت حصے' ہمیں ترجمہ کے ساتھ پڑھ کر سناتی تھیں۔

شاپنگ کا انہیں بے پناہ شوق تھا۔ ہمیشہ اپنے منگیتر کے لیئے کچھ نہ کچھ خریدتی رہتی تھیں اور اس میں ہماری پسند کو شامل کرلیتی تھیں۔ مس پر بینیا کا شکریہ ہم کس طرح ادا کریں کہ ان کی خوش مذاقی کے باعث ٹوکیو میں ہمارا وقت بہت خوشگوار گذرا۔ سمینار کے خاتمہ کے بعد سارے مندوبین تو چلے گئے مگر ہماری اور مس پر بینیا کی فلائیٹ کچھ ایسی تھی کہ ہم دونوں کو ایک دن اور ٹوکیو

میں رُکنا پڑا۔ آخری دن ہم نے ٹوکیو کے ہر بازار کی خاک چھانی۔ مس پرینا نے اپنے منگیتر کے لئے ڈھیروں سامان خریدا اور حسب معمول ہماری پسند کو معیار بنایا۔

ہم نے کہا ”بی بی! آپ نے اپنے منگیتر کے لئے ہماری پسند سے چیزیں تو خرید لی ہیں۔ اگر آپ کے منگیتر کو پسند نہ آئیں تو؟“

بولیں ”ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ میرا دعویٰ ہے“

ہم بھلا ان کے دعوے کو جھٹلانے والے کون ہوتے تھے۔

واپسی کے سفر میں بنکاک تک وہ ہمارے ساتھ رہیں۔ ہانگ کانگ میں چار گھنٹوں کا جو وقت ملا تو اس میں بھی مس پرینا نے شاپنگ کی۔

ہم سے پوچھا ”آپ کوئی شاپنگ کیوں نہیں کرتے؟“۔

ہم نے کہا ”اس لئے نہیں کرتے کہ ہماری کوئی منگیتر نہیں ہے۔“

اس بات پر حسبِ عادت زوردار قہقہہ لگایا اور بولیں ”مذاق چھوڑیئے۔ سچ! آپ بھی کچھ خریدیئے“۔

ہم نے کہا ”مس پرینیا۔ جی تو ہمارا بھی بہت کچھ خریدنے کو مچلتا ہے۔ لیکن آپ ہمارے کسٹم والوں کو نہیں جانتیں۔ اگر ہماری کوئی منگیتر ہوتی تو تب بھی کچھ نہ خریدتے“۔

تاہم شاپنگ کے لئے مس پرینیا کے بڑھتے ہوئے اصرار کو دیکھ کر ہم نے ڈن ہل سگریٹ کا ایک کارٹن خریدا تو مس پرینیا بے ساختہ بول اٹھیں ”مسٹر حسین! کتنی عجیب بات ہے کہ میرے منگیتر کو بھی ڈن ہل سگریٹ بہت پسند ہیں“۔

ہم نے فوراً کہا ”مگر ہمیں یہ سگریٹ بالکل پسند نہیں ہیں“۔

”پھر آپ نے یہ سگریٹ کس لئے خریدے ہیں؟“۔ مس پرینا نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ کے منگیتر کے لئے“۔ ہم نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

ہم نے سوچا تھا کہ ہمارے اس جواب پر مس پرینیا ضرور ہنسیں گی۔ مگر وہ خلافِ توقع خاموش ہوگئیں۔ ہانگ کانگ سے بنکاک تک وہ سنجیدہ سی بنی بیٹھی رہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ ہم بنکاک میں دو چار دن رُک جائیں۔ بنکاک کا شہر اور ان کے منگیتر دونوں کو دیکھیں۔

ہم نے کہا زندگی باقی رہی تو پھر کبھی دیکھ لیں گے۔ نہ رہے تو ایک حسرت اپنے ساتھ ہی لے جائیں گے۔ آدمی کو اپنے ساتھ کچھ حسرتیں ضرور لے جانا چاہیے تاکہ دوبارہ پیدا ہونے کا کوئی تو بہانہ باقی رہے۔

بنکاک کا ہوائی اڈہ آیا تو مس پرینیا نے اپنا سامان سنبھالا اور گمبھیر لہجہ میں بولیں ''مسٹر حسین! میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ آپ کو اور آپ کی باتوں کو ہمیشہ یاد رکھونگی۔ میں پرُامید زندگی گزارنے کی قائل ہوں۔ زندگی میں کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی طرح آپ سے ضرور ملاقات ہوگی''۔

ہم نے کہا'' مس پرینیا! ہم بھی پرُامید زندگی گزارنے کے قائل ہیں۔ ایسی زندگی گزارنے کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بڑے سلیقہ اور اہتمام سے بیوقوف بناتا ہے۔ اپنی بیوقوفی کو نئے نئے، اچھے اچھے، انوکھے نام دیتا ہے۔ اگر آدمی میں خود اپنے ہاتھوں بیوقوف بننے کی صلاحیت نہ ہوتی تو جینا دوبھر ہو جاتا''۔

ہم نے سوچا تھا کہ مس پرینیا ہمارے اس تبصرہ پر حسبِ معمول زوردار قہقہہ لگائیں گی۔ مگر وہ اپنا سامان اُٹھا کر آگے کو نکل گئیں۔ ہوائی جہاز کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے پلٹ کر ہمیں دیکھا اور ہاتھ ہلا کر جاپانی میں بولیں'' سائیونارا''

پھر ہم نے بھی اپنے ساز و سامان میں جاپان کی یادوں کو جتن سے باندھ لیا اور بنکاک سے اُڑ کر دہلی آ گئے۔ دہلی کے کسٹم والوں نے خوب تلاشی لی مگر انہیں پتہ ہی نہ چل سکا کہ ہم اپنے ساتھ جاپان سے کتنی میٹھی میٹھی اور سوندھی سوندھی یادیں لے کر آئے ہیں۔ انہوں نے صرف ہمارے سامان اور جیبوں کی تلاشی لی، دل کو ٹٹول کر نہیں دیکھا ورنہ پکڑے جاتے۔

('' جاپان چلو، جاپان چلو۔'' ۱۹۸۲)

☆☆☆

دو باتیں

''سفرِ لخت لخت'' اُن سفرناموں کا مجموعہ ہے جو ہم نے اسّی کی دہائی میں مختلف ملکوں کی سیاحت کے بعد لکھے تھے۔ ۱۹۸۰ء میں ہمیں سوا مہینہ کے لئے پہلی بار بیرونی سفر پر جاپان جانے کا موقعہ ملا تھا۔ جاپان پہلا ملک تھا جو اپنے مخصوص کلچر اور مخصوص جغرافیائی حالات کی وجہ سے ہمیں بالکل مختلف اور انوکھا لگا تھا۔ یہ ایشیاء میں ہے اور نہیں بھی ہے۔ سڑکوں اور بازاروں میں دکھائی دینے والا جاپان مغرب کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ دکھائی دیتا ہے لیکن جو جاپان جاپانی گھروں میں نظر آتا ہے وہ ایک خالص ایشیائی ملک ہے۔ دن بھر عصری مشینوں کو کنٹرول کرنے اور جدید کاروباری اداروں میں کام کرنے والے جاپانی جب شام کو اپنے گھروں میں واپس آتے ہیں تو اچانک ان کا حُلیہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ حُلیہ ہی نہیں ان کا مزاج بھی یکسر بدل جاتا ہے۔ مغربی لباس کی جگہ جاپانی لباس ان کے بدن کی زینت بن جاتا ہے۔ ہر کمرہ میں جانے سے پہلے چپل تبدیل کئے جاتے ہیں۔ فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا جاتا ہے اور جاپانی وقفہ وقفہ سے ایک دوسرے کی ایسی تعظیم و تکریم کرتے ہیں کہ ہم جیسے ان کی تقلید کرنے لگیں تو زندگی بھر کمر کے درد سے کراہتے رہ جائیں۔ ان کے کابکی شوز، ان کے کھانے اور کھانے کے انداز، ان کے رقص اور موسیقی اور ان کا رہن سہن سب کچھ ہی مختلف ہوتا ہے۔ تجسس آفرینی اور سحر آفرینی کے معاملہ میں جاپان تب بھی ہمارے لئے منفرد ملک تھا اور کئی ملکوں کی سیاحت کرنے کے بعد آج بھی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہم نے جاپان کا سفرنامہ بڑے اشتیاق اور گہرے تجسس کے ساتھ لکھا تھا۔ سفرنامہ جاپان کا پہلا اُردو ایڈیشن ۱۹۸۳ میں شائع ہوا تھا جس کا سرورق پاکستان کے مشہور آرٹسٹ صادقین نے بنایا تھا۔ ہندی کے مشہور رسالہ 'ساریکا' نے اس سفرنامہ کو قسط وار شائع کیا۔ ہندی میں یہ سفرنامہ ۱۹۸۶ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ بعد میں خود جاپانی زبان میں یہ سفرنامہ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا جس کی مترجم جاپان کی مشہور اُردو اسکالر شاشورے ہیں۔

ہندی کی معرفت اس سفر نامہ کی کئی قسطیں مختلف ہندوستانی زبانوں میں بھی شائع ہوئیں۔اُردو میں اب تک اس سفرنامہ کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۸۴ء میں ہمیں دو مہینوں کے لئے انگلستان، فرانس، امریکہ اور کناڈا جانے کا موقعہ ملا۔اس سفر کا حال بھی تفصیل سے لکھنا چاہتے تھے لیکن انگریزی زبان اور ادب سے واقفیت کی وجہ سے یوروپ اور امریکہ کسی بھی پہلو سے اجنبی نہ لگے۔یوں بھی ان دنوں بے شمار ہندوستانی یوروپ اور امریکہ آنے جانے لگے ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ اکثر ہندوستانی خود ہندوستان کے بارے میں اتنا نہیں جانتے جتنا کہ یوروپ اور امریکہ کے بارے میں جانتے ہیں۔اب ہم ان ملکوں کا حال لکھتے تو کون سا تیر مار لیتے۔ ہمارے ایک دوست پچھلے اٹھارہ برسوں سے لندن میں مقیم ہیں۔ایک دن وہ ہمیں ایک پب Pub میں لے گئے۔پب کا نام سن کر ہم نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا کہ انگریزی کا مایہ ناز ادیب چارلس ڈکنس اس پب میں بیٹھا کرتا تھا۔انہیں یقین نہ آیا۔لیکن ہوٹل کے منیجر سے جب توثیق ہوئی تو بے پناہ خوش ہوئے۔لندن میں ہمارے قیام کے دنوں میں وہ ہمیں اکثر ساتھ رکھتے تھے تاکہ لندن کے بارے میں ان کی معلومات میں اضافہ ہو۔اس سفر نامہ میں لندن کا حال کسی قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے لیکن یہ حال بھی ان لوگوں سے متعلق ہے جن کی مادری زبان اُردو ہے اور جنھوں نے لندن کو مغرب میں اُردو کا ایک اہم مرکز بنا دیا ہے۔سفر نامۂ لندن میں شامل تفصیلات دراصل اُردو کی ایک نئی بستی کی تفصیلات ہیں۔امریکہ میں بھی ہمیں اُردو والوں کی صحبت میں ہی رہنے کا موقعہ ملا۔یہاں بھی اُردو والوں نے ہمیں اتنا مصروف رکھا کہ کسی شریف امریکی سے انگریزی میں بات چیت کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔

اکتوبر ۱۹۸۶ء میں ہم نے مرحوم سوویت یونین کا دورہ کیا۔اس سفر میں ہمیں تاشقند سمرقند، بخارا، ماسکو اور لینن گراڈ (موجود پٹروگریڈ) جانے کا موقعہ ملا۔دورۂ سوویت یونین میں ہم نے ازبکستان کا حال کسی قدر تفصیل سے لکھا۔ماسکو اور لنین گراڈ کا حال اس لئے گول کر گئے کہ ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ سوویت نظام کا اب چل چلاؤ ہے۔گورباچوف نئی نئی 'اصلاحات' کے ذریعہ اس نظام کو کھوکھلا کر رہے تھے۔ہمیں افسوس اس بات کا ہے کہ ہم لنین گراڈ کا حال تفصیل سے نہ لکھ سکے۔دنیا میں ہم نے اب تک جتنے بڑے شہر دیکھے ہیں ان میں ہمیں یہ سب سے خوب صورت شہر نظر آیا۔لیکن اس شہر سے ہمارا جی اس وقت کھٹا ہو گیا جب آدھی رات کو ہمارے ہوٹل

کے کمرہ پر ہلکی سی دستک ہوئی۔(اس ہوٹل میں عام آدمیوں کا داخلہ سخت ممنوع تھا)۔ہم نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ اکیس بائیس برس کی ایک خوب صورت روسی لڑکی اپنے ہونٹوں پر ایک معنیٰ خیز مسکراہٹ سجائے کھڑی ہے۔پھر اس نے انگریزی اور روسی دونوں زبانوں کی ملاوٹ کرتے ہوئے ہم سے پوچھا ''آپ کے پاس ڈالر ہیں؟''

ہم نے کہا ''نہیں ہیں؟''

پوچھا ''اسکاچ وہسکی اور امپورٹڈ سگریٹ ہیں؟''

ہم نے کہا ''یہ بھی نہیں ہیں''

بولی ''کچھ روبل تو ہوں گے ہی''

ہم نے کہا ''وہ بھی نہیں ہیں''۔

قدرے توقف کے بعد بولی ''آپ مسافر ہیں۔تھک گئے ہونگے۔اگر آپ زلفوں کی چھاؤں اور پلکوں کے سایہ میں کچھ دیر گزارنا چاہیں تو بندی حاضر ہے۔کیا میں آپ کے کمرہ میں آسکتی ہوں؟''

ہم نے اپنی انگشت شہادت سے اسے خاموش کراتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا ''آپ اس وقت ہمارے کمرہ میں بالکل نہیں آسکتیں کیونکہ ہمارے کمرہ میں ایک اور روسی لڑکی پہلے ہی سے موجود ہے جسے ہم ڈالر اور امپورٹڈ سگریٹ وغیرہ دینے میں مصروف ہیں۔بی بی آپ نے یہاں آنے میں ذرا دیر کردی۔''

وہ غصہ سے کسی اور کمرہ کی طرف چلی گئی۔بعد میں اس معصوم کو ڈالر ملے یا نہیں یہ ہمیں معلوم نہ ہوسکا۔البتہ ہمیں یہ پتہ ضرور چل گیا تھا کہ سوویت نظام کا دم اب نکلا ہی چاہتا ہے۔ دوسرے دن ہم نے ہند۔روس دوستی کی انجمن کے عہدیداروں سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو کہنے لگے فن لینڈ یہاں بہت قریب ہے اور خلیج فن لینڈ کے راستہ طرح طرح کی اشیائے تعیش یہاں اسمگل ہونے لگی ہیں اور یوں سوویت معاشرہ کو برباد کیا جارہا ہے۔اب ہم اُنھیں کیا سمجھاتے کہ اس میں بیچاری خلیج فن لینڈ کا اتنا قصور نہیں ہے جتنا کہ خود گورباچوف صاحب کا ہے۔کیونکہ خلیج فن لینڈ کے راستہ تو صرف اشیائے تعیش ہی اسمگل ہوتی ہیں جب کہ گورباچوف صاحب تو سالم امریکہ کو سوویت یونین میں اسمگل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔چنانچہ ہوا بھی یہی۔روس سے واپسی کے

کچھ ہی عرصہ بعد سارا سوویت نظام مٹی کے ایک گھروندے کی طرح گر گیا۔

لنین گراڈ میں ہمیں ایک ضروری کام اُس وقت یاد آیا جب لنین گراڈ کو چھوڑنے میں صرف دو گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ ہم نے رات میں نو بجے اپنی مترجم سے کہا ”محترمہ! آپ نے ہرمیتاج Hermitage کی سیر کرائی، دوسری جنگِ عظیم میں ہزاروں کی تعداد میں مرنے والوں کے اجتماعی قبرستان کی بھی زیارت کرائی مگر ہماری ایک چھوٹی سی خواہش رہی جاتی ہے۔ آپ کا مشہور ادیب دوستو یفسکی لنین گراڈ میں ہی کہیں دفن ہے۔ ہم اس کی قبر پر حاضری دینا چاہتے تھے۔ یہ سنتے ہی ہماری مترجم نے ہمارا ہاتھ پکڑ کر فوراً کھڑا کیا اور کہا ”جلدی کیجئے۔ فٹافٹ“۔ دو منٹ بعد ہم بھاگتے بھاگتے ہوٹل کے باب الداخلہ پر پہنچے۔ مترجم نے باہر کچھ جھانک کر دیکھا۔ پھر بولی ”معاف کیجئے۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ جس قبرستان میں دوستو یفسکی دفن ہے اس کا دروازہ ابھی بند ہوا چاہتا ہے۔ وہ دیکھئے چوکیدار قبرستان کا دروازہ بند کر رہا ہے“۔ چار دن ہم لنین گراڈ میں اپنے محبوب ادیب کی آخری آرام گاہ کے بالکل سامنے رہے لیکن کسی نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ دوستو یفسکی یہاں دفن ہے۔ یوں بھی اس دھرتی میں صدیوں سے اتنے لوگ دفن ہوتے آئے ہیں کہ کسے پرواہ کہ کون کہاں دفن ہے، کیوں دفن ہے اور کب تک دفن رہے گا۔ ہماری مترجم نے قبرستان کے اطراف لگی ہوئی سلاخوں میں سے ایک سفید سی قبر کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ رہی دوستو یفسکی کی قبر۔ ہم نے قبرستان کے باہر کھڑے ہو کر اپنے محبوب ادیب کی روح کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور چلے آئے۔ غرض ایسی ہی کئی باتیں ہیں جو اس سفر نامہ میں آنے سے رہ گئی ہیں۔ ہمیں ۱۹۸۸ء میں پاکستان اور ۱۹۸۹ء میں سعودی عرب جانے کی بھی سعادت نصیب ہوئی۔ ملکوں ملکوں کی سیاحت کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ملکوں اور جغرافیائی حالات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اصل اہمیت ان انسانوں کی ہے جو ان ملکوں میں آباد ہیں۔ ہمیں یہ بکھرے سفر نامے اس لئے پسند ہیں کہ ان میں بعض کردار اور شخصیتیں محفوظ ہو گئی ہیں۔ انھیں ملکوں کے حال کے طور پر نہیں بلکہ ان انسانوں کے ذکر کے طور پر پڑھا جائے جو ان ملکوں میں آباد ہیں۔ (سفرِ لخت لخت، مطبوعہ 1995 کا پیش لفظ)

مجتبیٰ حسین

۲۴/جون ۱۹۹۵ء

☆☆
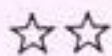
او دیس سے جانے والے بتا

صاحبو! عرصہ تین برس کا بیت گیا جب ہم مشرق میں اُبھرتے سورج کی دھرتی جاپان گئے تھے۔ اب ہم پھر پر تول رہے ہیں اور اب کی بار مغرب میں اس ملک کو جا رہے ہیں جس کی سلطنت پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں سورج کتنا تھک جاتا ہوگا اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔ سفر جاپان کے بعد خواص الناس کا اصرار دن بدن بڑھتا جا رہا تھا کہ ہم کسی اور ملک کا رخ کریں تاکہ یہ جو ہم ہر محفل میں پان کی بجائے جاپان کو پیش کرتے رہتے ہیں تو اس سے انہیں نجات ملے۔ کچھ دوراندیش احباب نہ جانے کب سے احتیاطاً اپنی جیبوں میں امام ضامن ڈالے گھوم رہے تھے کہ ہم ادھر عزم سفر کریں اور وہ اُدھر ہمارے بازو پر امام ضامن باندھ دیں مگر اُنھیں کیا معلوم کہ ہمارا ذوق سفر صرف امام ضامن سے نہیں بڑھتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ٹوکیو میں ان امام ضامنوں کے ہاتھوں کسٹم والوں نے ہمیں خاصا آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ کھوٹی چونیوں والے امام ضامن تک کُھلوا کر دیکھے تھے کہ کہیں ہم ان کے ملک میں چوری سے سونا تو اسمگل نہیں کر رہے ہیں۔ ایک کسٹم والے نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ کیا تمہارے ملک میں ابھی تک منی پرس ایجاد نہیں ہوا ہے جو تم اس طرح رنگ برنگے کپڑوں میں بندھی ریز گاری کو اپنے بازوؤں پر باندھے لے جا رہے ہو۔ ہمارے ہاں ریز گاری پرس میں رکھی جاتی ہے۔ ایک اور کسٹم والے نے تو دفور تفتیش میں ہماری ٹانگوں کے اطراف بھی امام ضامنوں کو ڈھونڈھنے کی سعی لاحاصل کی تھی اور بعد میں خاصا مایوس ہوا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ان امام ضامنوں کا اصل مقصد اگر اپنی دولت کو پوشیدہ رکھنا ہے تو اس دولت پوشیدہ کی صحیح جگہ ٹانگیں ہیں بازو نہیں کیونکہ پتلون کا گھیر قمیص کی آستین کے

گھیر سے نہ صرف بڑا اور محفوظ ہوتا ہے بلکہ سیف ڈپازٹ لاکر کی حیثیت رکھتا ہے۔ جتنے چاہو باندھ لو۔ خیر جو بات بیت گئی اس کا ذکر کیا۔ ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ ہمارا ذوق سفر اس وقت تک نہیں بڑھتا جب تک کہ ہمیں کوئی اذوقۂ سفر نہ دے۔ اُردو کے اکثر ادیبوں اور شاعروں کی طرح ہم بھی اب اعزازی زندگی گزارنے کے اہل ہو گئے ہیں۔ یعنی دوسروں کے خرچ پر سفر کرنے کی عادت ہوگئی ہے بلکہ فرسٹ کلاس کا کرایہ طلب کر کے ماشاء اللہ سیکنڈ کلاس میں بھی سفر کرنے لگے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ منزل مقصود پر ہم فرسٹ کلاس کے ڈبہ سے ہی برآمد ہوتے ہیں۔ تاہم اس معاملہ میں ہم اپنے دوست مائل مرادآبادی کی طرح اتنے اُصول پرست بھی نہیں ہیں کہ موصوف اپنے سگے بھتیجے کی شادیٔ خانہ آبادی میں شرکت کے لئے گئے تو آنے جانے کے کرایہ کے علاوہ سہرا پڑھنے کا وہی معاوضہ لیا جو عموماً مشاعروں میں لیتے ہیں بلکہ سہرے کی طباعت کا فرضی بل اپنے فرمانبردار بھتیجے کی خدمت میں الگ سے پیش کیا۔ اس قدر کٹر اصول پرست بننا اور ادب کی ایسی بے لوث خدمت کرنا ہمیں پسند نہیں۔ دنیا جانتی ہے اور ہمارا دل تو آج تک جانتا ہے کہ اپنی ہمشیرہ کی شادی میں ہم اپنے پلے سے کرایہ دے کر گئے تھے۔ یہ ہمارا آخری سفر فی سبیل اللہ تھا۔

صاحبو! اب یہ جو ہم برطانیہ جا رہے ہیں تو ہمارے ذوق سفر کو اُردو مجلس، برطانیہ نے مہمیز لگائی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اُردو مجلس برطانیہ کے کارپردازان بیرسٹر غلام یزدانی، جناب عباس زیدی اور نقی تنویر (تینوں حیدرآبادی ہیں اور وہاں کے نکالے ہوئے ہیں جہاں کے ہم بھی ہیں۔) کا ایک مشترکہ خط ہمیں وصول ہوا تھا جس میں ادب میں ہمارے صحیح مقام و مرتبے وغیرہ سے خود ہمیں واقف کرانے اور ہماری ذات بے برکات کے بارے میں خاصی معلومات بہم پہنچانے کے بعد ہمیں مطلع کیا گیا تھا کہ برطانیہ کے اُردو والے مخدوم محی الدین کو اکثر یاد کرتے رہتے ہیں۔ اس بار ہم ذرا جم کر مخدوم کو یاد کرنا چاہتے ہیں اور آپ کو بھی لگے ہاتھوں اس یاد میں شریک کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کی معرفت حیدرآباد والوں کو بھی مخدوم کی یاد آئے اور اس طرح

الٰہی ختم نہ ہو یارِ غم گسار کی بات

اُردو مجلس والوں نے آنے جانے کا ٹکٹ بھیجنے کے علاوہ ایک اضافی لالچ یہ بھی دیا کہ میاں یہاں آؤ تو ''یاد مخدوم'' کے جلسے کی صدارت بھی تمہیں سونپتے ہیں۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ وطن میں بھلا کون اب مخدوم کو یاد کرتا ہے اور کون ہم سے جلسوں کی صدارت کراتا ہے۔ سو

اب ہم کسی حد تک مخدوم کو یاد کرنے اور بڑی حد تک ایک جلسے کی صدارت کرنے کے لئے برطانیہ جا رہے ہیں۔

اب آپ سے کیا چھپانا کہ ماضی میں برطانیہ جانے کے کئی مواقع ہمارے ہاتھ آئے تھے مگر ہم نہیں گئے۔ دو چار مواقع تو ان گول میز کانفرنسوں کے تھے جن کا انعقاد آزادیٔ وطن سے پہلے ہوا تھا اور جن میں ہم صرف اس تجسس کی خاطر شرکت کرنا چاہتے تھے کہ دیکھیں گول میز کانفرنس کو صرف اس کی میز کی گولائی کی وجہ سے گول میز کانفرنس کہا جاتا ہے یا آزادی کو گول کرنے کے سبب سے اسے گول میز کانفرنس کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہم ان گول میز کانفرنسوں میں اس لئے نہیں گئے کہ اس وقت تک ہم نے پاؤں پاؤں چلنا بھی نہیں سیکھا تھا ورنہ ضرور چلے جاتے۔ انگریزوں کی بے جا عجلت پسندی پر اب بھی دکھ ہوتا ہے کہ اگر وہ کچھ دن اور ہماری خاطر برِ صغیر میں ٹک جاتے تو گاندھی جی کی آواز پر ہم بھی لبیک کہہ کر تعلیم ترک کرتے اور اس طرح آج ہمارا شمار بھی بربنائے جہالت اکابرین میں ہوتا اور یوں ہم آج اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے جوتیاں چٹخاتے نہ پھرتے۔ برطانیہ جانے کا دوسرا موقعہ ہمیں اس وقت ملا تھا جب پرنس چارلس کی شادی ہونے والی تھی۔ ہم بہت دنوں تک دعوت نامہ کا انتظار کرتے رہے، وہ نہیں ملا۔ تب یقین آیا کہ برطانیہ میں بھی ڈاک کا انتظام، ڈاک کے ہمارے انتظام سے کچھ بہتر نہیں ہے۔ ایسا کیونکر نہ ہو جب کہ ہمارے دوست شمس الرحمٰن فاروقی ہندوستانی ڈاک سے وابستہ ہیں اور برطانیہ کے محکمۂ ڈاک میں ہمارے بچپن کے دوست نقی تنویر کام کرتے ہیں۔

صاحبو! ایک زمانہ تھا جب اختر شیرانی دیس سے آنے والے ہر آدمی سے یارانِ وطن کا حال پوچھا کرتے تھے۔ اب دیس سے جانے والا یارانِ وطن کا حال سناتا ہے۔ کیونکہ اکثر یارانِ وطن نے اب وطن سے دور اپنی بستیاں بسا رکھی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے بچپن کے سارے دوست برطانیہ میں اور نوجوانی کے دوست امریکہ میں خیریت سے ہیں، ان سے ذرا پختہ عمر کے دوست مشرق وسطیٰ کے ممالک میں عربوں کے تیل اور اپنی زندگی کے تیل کے خاتمے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس طرح ہمارا بچپن برطانیہ میں مچل رہا ہے، ہماری نوجوانی امریکہ میں مہک رہی ہے اور ہمارا ادھیڑ پا مشرق وسطیٰ میں اونگھ رہا ہے۔ وطن میں تو اب ہمیں اپنے بڑھاپے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ گویا ہم برطانیہ نہیں جا رہے ہیں بلکہ اپنے بچپن کی طرف جا رہے ہیں۔

آیا یارانِ رفتہ آیا آیا

اس بچکانہ استدلال سے قطع نظر ہمارے دیر سے برطانیہ جانے کی کچھ اور معقول وجوہات بھی ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہم اُردو گزیدہ ہیں۔ ہر کام اُردو کے حوالے سے کرتے ہیں۔ کسی کو دھوکہ بھی دینا ہو تو اسی شیریں زبان میں دیتے ہیں۔ یوں بھی دھوکہ دینے کے لئے اس سے بہتر زبان کوئی اور نہیں ہے۔ ہم اس انتظار میں تھے کہ برطانیہ کا اُردو ماحول ہمارے معیار تک رسائی حاصل کر لے اور جب وطنِ عزیز میں اُردو کے ختم ہونے کا گمان اور برطانیہ میں اس زبان کے پھلنے پھولنے کا یقین پختہ ہو جائے تو تب ہم سرزمینِ فرنگ پر قدم رنجہ فرمائیں۔ ماشاء اللہ برطانیہ میں تو اب اُردو اور اُردو کلچر کا خاصا بول بالا ہے۔ پچھلے دنوں برطانیہ کے ایک صاحب دہلی کی جامع مسجد کے سامنے ملے۔ کہنے لگے ''میاں! دہلی میں اب صرف جامع مسجد رہ گئی ہے۔ اس کی سیڑھیاں تو اب لندن میں پائی جاتی ہیں یہاں کی نہاری اب بریڈفورڈ میں ملتی ہے۔ یہاں کی کرخنداری اب برمنگھم میں سنائی دیتی ہے۔'' برطانیہ میں مقیم ایک حیدرآبادی دوست نے ہمیں کچھ عرصہ پہلے لکھا تھا۔ ''میاں! حیدرآبادی بریانی اور حیدرآبادی نہاری کھانی ہو تو لندن آؤ۔ اس بریانی کی تلاش میں پتھر گٹی اور مچھلی کمان کے چکر کیوں لگاتے ہو۔ مچھلی کمان تو اب لندن میں آ گئی ہے''۔ ہمیں انگریزوں پر غصہ بھی آتا ہے کہ اوّل تو ہمارا کوہِ نور ہمیں واپس نہیں کرتے اوپر سے جامع مسجد کی سیڑھیاں بھی وہیں منگوالیں۔ کوہِ نور تو خیر ہمیں واپس کر دیں البتہ جامع مسجد کی سیڑھیوں کو وہیں رہنے دیں کہ یہ وہاں زیادہ محفوظ ہیں۔

سنا ہے کہ لندن میں اب آل انگلینڈ مشاعرے بھی منعقد ہوتے ہیں۔ مقامی شاعروں اور بیرونی شاعروں کا چکر بھی وہاں چلتا ہے۔ اب انگلستان کے شاعروں کا 'موازنۂ انیس و دبیر' اور 'معرکۂ انشاء و مصحفی' بھی ہونے لگا ہے۔ یہ بڑی خوشی آئند بات ہے۔ اُردو ادب میں پنپنے کی یہی تو باتیں ہیں۔ پچھلے دنوں دہلی میں ہماری ملاقات برطانیہ کے ایک اُردو شاعر ریاض برمنگھموی سے ہوئی تھی۔ دو گھنٹوں تک اپنا کلامِ ولایت نظام ہمارے گوش گذار کرنے کے بعد اپنے دو برطانوی شاعر دوستوں فیض بریڈفورڈوی اور آتش لیک ڈسٹرکٹوی کے مجموعہ ہائے کلام کے اعزازی نسخے بھی ہمیں سونپے اور خواہش کی ہے کہ ہم اپنی زرین رائے سے انھیں مطلع فرمائیں۔

خوب یاد آیا۔ ہمارے دوست خلیق انجم نے کہ جو انجمن ترقی اُردو ہند کے جنرل

مشتاق احمد یوسفی کے گھر پر منعقدہ تقریب میں (دائیں سے) افتخار عارف، معین الدین شاہ، مشتاق احمد یوسفی، مغنی تبسم، مجتبیٰ حسین، نقی تنویر اور ضیاء الدین شکیب

سکریٹری ہیں اور ابھی انگلستان سے واپس ہوئے ہیں ایک محفل میں یہ مژدہ جانفزا بھی سنایا تھا کہ برطانیہ کے آٹھ ہزار اسکولوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اگر برطانیہ کے آٹھ ہزار اسکولوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہے تو انگریز بچوں کو انگریزی پڑھانے کے لئے اسکول کہاں سے فراہم کیے جاتے ہیں۔ جب سے یہ سنا ہے ہمیں انگریزی زبان سے ہمدردی ہوگئی ہے۔ خلیق انجم جنھیں ہم انجمن ترقی اُردو کی رعایت سے 'خلیق انجمن' بھی کہتے ہیں اُردو کے تعلق سے بڑا رجائی تصور رکھتے ہیں اور ہندوستان کے باہر اس کے مستقبل سے خاصے پُر اُمید ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے اُردو کی صورتِ حال کو مزید پُر امید ثابت کرنے کے لئے برطانیہ کے اُردو اسکولوں کی صحیح تعداد بتانے میں تھوڑے بہت مبالغہ سے کام لیا ہو۔ لیکن اتنا اعتبار تو ہم ان کے دعویٰ پر کر ہی سکتے ہیں کہ بھلے ہی برطانیہ کے آٹھ ہزار اسکولوں میں اُردو نہ پڑھائی جاتی ہو آٹھ اسکولوں میں تو ضرور پڑھائی جاتی ہوگی۔ کبھی کبھی تقریر میں بھی تو 'کتابت کی غلطی' ہو جاتی ہے۔

اُردو سے قطع نظر برطانیہ جانے کی اور بھی کئی وجوہات ہیں۔ ہمیں لندن کی ان تاریخی عمارتوں کو دیکھنے کی تمنا ہے جہاں بیٹھ کر انگریزوں نے اپنی تاریخ تو بنائی مگر دوسروں کا جغرافیہ بگاڑا۔ ہمیں ان عمارتوں کے علاوہ اُردو مزاح نگاری کے قطب مینار کو بھی دیکھنا ہے جو ان دنوں لندن میں واقع ہے۔ ہماری مراد حضرت مشتاق احمد یوسفی سے ہے۔ اس عمارت کا موجودہ حال بھی آپ کو لکھ بھیجیں گے۔ بیرسٹر غلام یزدانی اور عباس زیدی تو خیر ہمارے میزبان ہیں ہی جن کی 'اُردو مجلس' کا حال آپ اکثر پڑھتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ لندن میں ہمارے بچپن کے کئی احباب رہتے ہیں۔ نقی تنویر ہیں جو ہمارے ہمراز اور کبھی ہم اُن کے ہمراز ہوا کرتے تھے۔ پچھلے بائیس برس سے لندن میں مقیم ہیں لیکن ہر دم رگِ جاں سے قریب رہتے ہیں۔ وقار لطیف ہندوستان سے انگریزوں کے چلے جانے کے باوجود انگریزوں کی طرح رہتے تھے۔ انگریزی ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ انگریزی بولتے تھے تو لگتا تھا کہ بی بی سی سے خبریں نشر کر رہے ہیں۔ آدمی گالیاں عموماً اپنی مادری زبان میں دیتا ہے۔ یہ گالیاں تک انگریزی میں دیتے تھے، جن کا بعد میں ہمیں کسی سے ترجمہ کروانا پڑتا تھا۔ انگریزی کی بہت سی گالیاں ہم نے انھیں سے سیکھیں۔ خاصی بے ضرر گالیاں ہیں جن سے اس زبان کا جس میں کہ یہ دی جارہی ہوں اور اُس شخص کا جس کو یہ دی جارہی ہوں کچھ بھی نہیں بگڑتا۔

ہمارے دوست حسن عسکری ہیں جن کے جانے سے ہندوستان میں ٹیکسی ڈرائیوروں کا کاروبار خاصا متاثر ہوا ہے۔ مشہور تھا کہ وہ اپنے ڈرائنگ روم سے اپنے ہی گھر کے باتھ روم میں بھی ٹیکسی میں بیٹھ کر جاتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اپنی باتوں سے علم کا دریا کچھ اس زور سے بہاتے تھے کہ ہم تنکے کی طرح بہہ جاتے تھے۔

ڈاکٹر یوسف علی خان بھی اب خیر سے لندن میں ہیں جنہوں نے اُردو ذریعہ تعلیم میں طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ مریض اگر اپنے مرض کی کیفیت شائستہ اور بامحاورہ اُردو میں بتانے سے قاصر رہتا تو اس کا علاج نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے جب حیدرآباد میں اپنا مطب کھولا تو بشمول ہمارے تین چار اور دوستوں کو اس کام پر مامور کیا تھا کہ ہم ان کے مطب میں بطور مریض بیٹھا کریں تاکہ عوام الناس کو پتہ چلے کہ ان کے ہاں خاصے مریض آتے ہیں۔ بطور مریض ہماری مستقل موجودگی سے اگرچہ ان کے مطب کی رونق میں خاصا اضافہ ہو جاتا تھا مگر بعد میں لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اس ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا نہیں ہے کیونکہ پچھلے چار مہینوں سے چار مریض ہر روز پابندی سے ان کے مطب پر آتے ہیں لیکن اتنے لمبے علاج کے باوجود ان کے صحت یاب ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کے بعد یوسف نے ہمیں مریض کے عہدہ سے برطرف کر دیا تھا۔

حبیب حیدرآبادی بھی عرصہ سے لندن میں مقیم ہیں۔ انھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو آج سے انیس برس پہلے ہم ان کی سوڈا لیمن کی دکان پر لیمن پینے اور انھیں دیکھنے جایا کرتے تھے۔ وہ دکان اپنی بڑھا گئے تو ہم نے بھی لیمن پینا ترک کر دیا۔

اکبر حیدرآبادی بھی آکسفورڈ میں بیٹھ کر شعر کہتے ہیں اور اتنے لمبے فاصلے کے باوجود اپنے شعروں سے دہلی میں ہمارا سر دھنواتے ہیں۔ مشہور محقق اور ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب بھی اکثر یاد آتے ہیں جنہوں نے غالب کو 'حیدرآبادیانے' کے لئے اقبال اور گوئٹے کی طرز پر ایک باضابطہ کتاب 'غالب اور حیدرآباد' لکھی تھی۔ جب سے وہ ہندوستان سے گئے ہیں آثارِ قدیمہ میں ہماری دلچسپی ختم ہو گئی ہے۔

ان حیدرآبادی احباب کے علاوہ کچھ پیارے غیر حیدرآبادی دوست بھی ہیں جن سے ملنے کو دل مچلتا ہے۔ ایک تو ہمارے کرم فرما ساقی فاروقی ہیں جن سے دس سال پہلے دہلی میں

ملاقات ہوئی تھی۔ اس قدر ٹوٹ کر ملتے ہیں کہ ملنے والا ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔ ان کی شاعری ہمیں بہت پسند ہے کیونکہ ان کی شاعری کو پڑھنے کے بعد آدمی کو چڑیا گھر جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اپنے کئی احباب کی زبانی ان کے پھوؤں اور بلّیوں کی بھی بہت شہرت سنی ہے۔ اب ان کا دیدار بھی کریں گے۔ ان کے کئی مینڈک دہلی میں آباد ہیں۔ ہم بھی انہیں میں سے ایک ہیں۔ ساقی فاروقی دو تین برسوں کے وقفہ سے ایک بار اپنی جڑوں کی تلاش میں ہندوستان آتے ہیں۔ انھیں جڑیں ملتی ہیں یا نہیں یہ ہم نہیں جانتے البتہ ہندوستان میں ان کے ساتھ کچھ جڑی بوٹیوں کو ہم نے ضرور دیکھا ہے۔

افتخار عارف سے پچھلے سال دہلی میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس محبت سے ملے کہ اس کی گرمی سے اب تک ہمارا دل پگھلتا ہے۔ اُردو مرکز برطانیہ کے سکریٹری ہیں۔ خوب صورت شعر کہتے ہیں اور ہمیں پیارے پیارے خط لکھتے ہیں۔ احمد فراز، سحاب قزلباش، زہرہ نگاہ، رضا علی عابدی، چاند کرن، سوہن راہی، راج کھیتی، دھرم پال، مجیب صدیقی اور شمس الدین آغا ان سب سے ہم جلد ہی ملیں گے۔ اس ذہنی پس منظر کے ساتھ ہم برطانیہ جارہے ہیں۔ اس کے بعد ہم اور ہمارے دل پر جو کچھ گزرتی رہے گی اسے رقم کر کے بھیجتے رہیں گے۔

(''سفرِ لخت لخت۔'' ۱۹۸۴)

سفر کرنا ہمارا مردانہ ہوائی جہاز میں

قارئین کرام! ہم دہلی سے اُڑ کر خلا میں آ گئے ہیں اور ہر ہوائی سفر کی طرح اس بار بھی ہمیں کھڑکی کے برابر والی نشست ملی ہے۔ کچھ دیر تانک جھانک کرتے رہے کہ اس کی پرانی عادت ہے جو عادت کے جاتے جاتے یا ہمارے جاتے جاتے جائے گی۔ پالم کا ہوائی اڈہ اب دو گھنٹے پیچھے رہ گیا ہے۔ ہم اب شاید وطنِ عزیز کی دھرتی سے بھی باہر نکل آئے ہیں۔ نیچے نہ جانے کون سا ملک ہے جس کی فضاؤں میں ہم اُڑ رہے ہیں۔ کاش کہ ہم کوئی اہم شخصیت ہوتے اور اس ملک کی فضاؤں میں سے گزرتے ہوئے یہاں کے باسیوں کے لئے خیر سگالی، محبت اور عالمی امن وغیرہ کے پیغام روانہ کرتے۔ بھلے ہی کسی کو ہمارے جذبۂ خیر سگالی کی ضرورت نہ ہو لیکن یہی تو وہ واحد جذبہ ہے جو حضرت جگر مراد آبادی کے بعد ہمارے پاس وافر مقدار میں موجود ہے۔

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

آدمی ایک بار بیرونی سفر پر ہو آئے تو پھر ہوشیار ہو جاتا ہے۔ ہمارا تین سال پرانا تجربہ بالآخر ہمارے کام آ رہا ہے۔ چنانچہ اس بار دہلی کے ہوائی اڈے پر صرف تین چہروں نے ہمیں وداع کیا۔ ہمارے حیدر آبادی دوست بشارت اللہ حسینی تھے جنھیں ہمیں نہ صرف ہوائی جہازوں پر بلکہ ٹرینوں اور بسوں پر بھی وداع کرنے کا خاصا تجربہ ہو گیا ہے۔ اس وسیع تجربہ کے بعد وہ بھلا ہمیں خوشی خوشی وداع کرنے کیونکر نہ آتے۔ ہمارے نوجوان دوست عزیزی نجی حسین صدیقی بھی ہمیں رخصت کرنے کم آئے تھے اور ہم سے یہ وعدہ لینے زیادہ آئے تھے کہ ہم دورۂ یوروپ وامریکہ سے فارغ ہونے کے بعد ان کے وطنِ مالوف امروہہ کا دورہ کریں گے۔

اگر چہ ہم نے ہاں کر دی ہے مگر انھیں کیا بتائیں کہ امروہہ کا دورہ کرنے سے پہلے ہمیں مغرب کے کئی اور فالتو ملکوں کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازنا ہے۔ ہماری نصف بہتر بھی اس بار ہمیں بادیدۂ نم وداع کرنے کے لئے آئی تھیں۔ اس بار ان کی آنکھوں میں ہماری 'انگریزی دانی' کے باعث کچھ زیادہ ہی آنسو تھے۔ کہہ رہی تھیں کہ جب تم جاپان گئے تھے تو مجھے یہ اطمینانِ قلب تھا کہ تمہیں جاپانی نہیں آتی۔ فساد کی اصل جڑ تو زبان دانی ہی ہوتی ہے۔ زبانِ یار ترکی ہو اور تم ترکی نہ جانو تو بیل منڈوے نہیں چڑھتی۔ لیکن اب کی بار میرا سکونِ قلب اس لیے متزلزل ہے کہ تم جن ملکوں میں جارہے ہو وہاں انگریزی بولی اور سمجھی جاتی ہے اور تم انگریزی نہ صرف بولتے ہو بلکہ سمجھتے بھی ہو۔ ہائے اللہ میں کیا کروں۔

اب ہم انھیں کس طرح سمجھائیں اور کس زبان میں سمجھائیں کہ انگریزی جاننے کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی کہ انگریزی بولنے والوں کے لہجے کو سمجھنے کی اہمیت ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت ہم جس ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہیں اس میں بڑی دیر سے کچھ اعلانات ہو رہے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ چونکہ سیرین عرب ایئر لائینس کا ہوائی جہاز ہے اسی لیے عربی میں اعلانات ہو رہے ہوں گے۔ ہم نے عربوں کی اپنی زبان سے محبت کی تعریف اپنے ساتھی مسافر سے کی تو اس نے کہا'' بندہ نواز! آپ کو خوش فہمی ہوئی ہے۔ یہ اعلانات انگریزی میں ہی ہو رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس انگریزی پر عربی لہجہ کا کلف چڑھایا جارہا ہے۔ اس کلف کو ہٹائیے تو آپ کو انگریزی سنائی دے گی۔'' ہم نے بڑی دیر تک عربی لہجہ کے کلف کو ہٹانے کی سنجیدگی سے کوشش بھی کی مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک لفظ البتہ ہماری سمجھ میں آیا اور وہ ہے 'شارجہ'۔ قیاس اغلب ہے کہ ہمارا ہوائی جہاز شارجہ کی سمت جارہا ہے۔ کہیں بھی جائے ہمیں ایک نہ ایک دن لندن ضرور پہنچادے۔ بس یہی دعا ہے۔

صاحبو! سیرین عرب ایئر لائینس کے ہوائی جہاز میں ہم پہلی بار سفر کر رہے ہیں۔ اس کی جو کچھ بھی شہرت سنی تھی طیارے میں بیٹھنے کے بعد درست ثابت ہو رہی ہے۔ ماشاء اللہ خاصا شرعی طیارہ ہے۔ زیادہ تر ہدایتیں عربی زبان میں ہی درج ہیں۔ ہماری نشست کے سامنے ایک عبارت عربی میں درج ہے۔ 'قمیض النجات تحت المقعد'۔ خاصا وقت اس عبارت کا مطلب سمجھنے میں ضائع ہو گیا۔ چونکہ اُردو کی معرفت تھوڑے بہت عربی الفاظ بھی جانتے ہیں اس لئے جیسے

تیسے اس عبارت کا مطلب نکال لیا ہے۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس چار لفظی عبارت میں جو چار الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ سب کے سب اُردو میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں مگر ساری گڑ بڑ عربی کے ''ال'' کی وجہ سے ہوگئی۔ اس عبارت کا اردو میں لفظی ترجمہ تو شاید مناسب نہ ہوگا۔ تاہم آپ کی سہولت کے لئے یہ بتاتے چلیں کہ انگریزی میں اس کا ترجمہ "Life jacket under your seat" ہوگا۔ اس ترجمہ کو پڑھ کر آپ عربوں کی راست گوئی کے قائل ہو جائیں گے۔ ایک اور خصوصیت ہمیں اس ہوائی جہاز کی یہ نظر آئی کہ خاصا مردانہ ہوائی جہاز ہے کیونکہ اس میں ایئر ہوسٹس قسم کی مخلوق ذرا کم ہی پائی جاتی ہے۔ خطرے کے وقت ہوائی جہاز سے باہر کودنے اور آکسیجن کی مدد سے تنفس کو برقرار رکھنے کا عملی مظاہرہ بھی مردوں نے ہی انجام دیا۔ ہوائی حسینائیں جب بھی اس طرح کے عملی مظاہرے کرتی ہیں تو تب بھی ہمیں خطرہ کی صورت میں ہوائی جہاز سے باہر نکلنے کا طریقہ سمجھ میں نہیں آتا۔ تاہم یہ عملی مظاہرہ آنکھوں کو بہت بھلا لگتا ہے۔ ان کی جگہ سیرین عرب ایئر لائنس کے پہلوان نما اسٹیورڈس نے یہ عملی مظاہرہ کیا۔ کھانا بھی ان ہی لوگوں نے اپنے کرخت ہاتھوں سے کھلایا۔ دو تین خواتین ہوائی جہاز میں ضرور نظر آئیں مگر وہ گھر یلو بیبیوں کی طرح اپنا زیادہ وقت باورچی خانہ میں گذارتی نظر آئیں۔ مسکراہٹ بھی ان کے چہروں پر بالکل دکھائی نہ دی۔ غالباً عربی میں مسکرا رہی تھیں۔ اے کاش ہم بھی عربی جانتے تو ان کی مسکراہٹ کو سمجھتے۔

اس بار یوروپ کا سفر ہم خاصے اطمینان کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ اس سفر میں ہمارے ساتھ دوستوں کی فرمائشوں کی لمبی فہرستیں نہیں ہیں۔ تین سال پہلے ٹوکیو میں ہمارے حالات تو خیر اچھے رہے مگر حالت کچھ ایسی رہی کہ کسی بھی دوست کی فرمائش کی تکمیل نہ کر سکے۔ اُس وقت تو ہمیں اور ہمارے احباب دونوں کو خاصا ذہنی صدمہ پہنچا مگر اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس بار کسی دوست نے فرمایشوں کی فہرست نہیں دی۔ ہم نے مروتاً اپنے دوست بلراج ورما سے پوچھا بھی کہ بتائیے اس بار آپ کے لیے یوروپ سے کیا لے آئیں۔ بولے ''میں نے تمہیں جو دو گرم سوٹ دیئے ہیں، انھیں واپس لیتے آنا۔ بھولنا مت۔ بڑا احسان ہوگا۔'' ہمارے بزرگ دوست بنارسی لال شرما کہ ہمارے کرم فرماؤں میں سے ہیں، ہمیں وداع کرنے کے لئے آئے تو ہم نے ان سے بھی یہی سوال پوچھا۔ بڑی متانت کے ساتھ بولے'' کیوں تکلف میں پڑتے ہو۔

پھر بھی تمہارا اصرار ہے تو میری ایک فرمائش یہ ہے کہ میں نے تمہیں جو سوٹ کیس دیا ہے اُسے بحفاظت تمام واپس لیتے آنا۔'' بہر حال اس بار دوستوں کے سامان سفر سے لدے پھندے ہم پوری بے فکری کے ساتھ یوروپ جا رہے ہیں۔ اگر یہ سامان چوری بھی ہو جائے تو ہمیں کوئی فکر نہیں کہ یہ ہمارا ذاتی سامان نہیں ہے۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتے ہیں رہزن کو

لیجئے صاحب! ہمارا قیاس بالکل صحیح نکلا اور ہم سچ مچ شارجہ کے ہوائی اڈہ پر اترنے والے ہیں۔ آسمان کی بلندیوں سے نیچے جھانکتے ہیں تو ہر طرف صحرا ہی صحرا دکھائی دیتا ہے۔ اس صحرا میں شارجہ نہ جانے کیا کر رہا ہے مگر ہمیں شارجہ سے کیا لینا دینا ہے۔ مسافر ہیں، دو گھڑی رُک کر آگے کو نکل جائیں گے۔ ہم نے ہمت کر کے ایک شامی اسٹیورڈ کو بلایا۔ اس کی انگریزی پر سے عربی کے کلف کو اُتارا۔ جتنا کلف اُترا اس سے یہی پتہ چلا کہ ہم شارجہ میں کچھ دیر ٹھیکی لے کر دمشق جائیں گے۔ دمشق میں ذرا لمبی ٹھیکی لیں گے۔ پھر 'معاہدہ میونخ' والے میونخ سے ذرا سی چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے لندن جا اتریں گے۔

شارجہ کا ہوائی اڈہ آ چکا ہے۔ دور سے اس کی بناوٹ کچھ ایسی نظر آتی ہے کہ اس پر ہمارے ہاں کے کسی بزرگ کی درگاہ کا گمان ہوتا ہے۔ بڑی بڑی پر شکوہ گنبدیں اور اونچے اونچے جلیل القدر مینار۔ ہم تو خیر تاڑ گئے تھے کہ یہ ہوائی اڈہ ہے مگر ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے ایک باریش ہندوستانی بزرگ نے فوراً اپنے سر پر رومال رکھ لیا اور لگے فاتحہ پڑھنے۔ ان کے بیٹے نے کہ خاصا جہاندیدہ نظر آتا ہے، انھیں منع کرنے کی کوشش بھی کی مگر اس کے منع کرتے کرتے بھی بڑے میاں، اپنے جوشِ ایمانی کے زیر اثر، ہوائی اڈہ پر فاتحہ پڑھے بغیر نہ رہ سکے۔

صاحبو! اب اگلا حال لندن پہنچ کر ہی لکھیں گے۔

(''سفرِ لخت لخت۔''۱۹۸۴)

☆☆

لندن میں ہمیں دفن کرنے کی تیاریاں

صاحبو! کون کہتا ہے کہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ یہ سب جھوٹ ہے فریب ہے۔ تین سال پہلے ٹوکیو جاتے وقت ہماری زندگی کے تقریباً چار گھنٹے ہمارے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ رات کے تین بجے دہلی سے چلے تھے تو ایک گھنٹہ بعد مرغ کی بانگ تو نہیں سنائی دی تھی البتہ سورج سمندر میں سے نکل آیا تھا۔ ہماری گھڑی میں ہندوستان میں دن کا ڈیڑھ بجا تھا تو ٹوکیو پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو گیا تھا۔ اس وقت سے ہمیں اپنی عمر عزیز کے چار قیمتی گھنٹوں کے ضائع ہونے کا قلق تھا۔ اب تین سال بعد لندن گئے تو ہمیں اپنا یہ کھویا ہوا قیمتی وقت واپس مل گیا۔ ہم صبح میں نو بجے دہلی سے چلے تھے۔ شارجہ میں کچھ دیر رک کر دمشق پہنچے تو سورج تب بھی سوا نیزے پر تھا۔ دمشق سے میونخ کی جانب روانہ ہوئے تو تب بھی سورج آن بان کے ساتھ چمک رہا تھا بلکہ میونخ کے آتے آتے تو عجب سماں تھا۔ بیچارا سورج غروب ہونے کے لئے بے چین تھا اور ہمارا ہوائی جہاز اسے 'شرف غروبیت' عطا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بڑی دیر تک سورج اور ہوائی جہاز میں آنکھ مچولی جاری رہی۔ مگر سورج بالآخر سورج ہے۔ ہمارا ہوائی جہاز میونخ کے ہوائی اڈے پر اُترا تو سورج نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور غڑاپ سے غروب ہو گیا۔ پھر جب ہم میونخ سے چل کر لندن کے ہوائی اڈے پر اترے تو ہماری گھڑی میں ہندوستانی وقت کے مطابق رات کا ڈیڑھ بجا تھا اور لندن کی گھڑیوں کو ابھی رات کے نو (9) بجانے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ تین سال بعد ہمیں اپنا کھویا ہوا وقت نہ صرف واپس مل گیا بلکہ نفع میں ایک فاضل گھنٹہ بھی مل گیا۔ اب ہم ان پانچ فالتو گھنٹوں میں اُردو کی کچھ اور بھی خدمت کریں گے۔ اُردو والے ہوشیار ہو جائیں۔

لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ پر اُترنے سے پہلے ہم پر یوں بھی کچھ عجیب سی ہیبت طاری تھی کیونکہ ہم اُس ملک میں قدیم رنجہ فرما رہے تھے جہاں کے شیکسپیر، ورڈ سورتھ، بائیرن، شیلے، کیٹس، ڈکنس، برنارڈ شا اور بہت سے دوسرے ادیب، جن کے نام ہمیں فی الحال یاد نہیں آ رہے ہیں، کی دھاک ہم پر بچپن سے بیٹھی ہوئی ہے۔ شخصیتیں جب کسی ملک سے بڑی ہو جاتی ہیں تو ملک بھی خواہ مخواہ بڑا نظر آنے لگتا ہے۔ ہیتھرو کے صاف ستھرے ایئر پورٹ پر اتر کر ہم امیگریشن کی لائن میں جا کھڑے ہوئے۔ ہم سے اگلے مسافروں سے طرح طرح کے سوالات پوچھے جا رہے تھے کہ لندن کیوں آ رہے ہو؟ کسی اور جگہ کیوں نہیں گئے؟۔ کب تک قیام کا ارادہ ہے؟۔ لندن میں قیام کے اخراجات کون بیوقوف برداشت کر رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ امیگریشن کے کئی عہدیدار تھے اسی لئے ہم یہ سوچتے ہوئے اپنی باری کا انتظار کرتے رہے کہ دیکھیں کونسا امیگریشن عہدیدار ہمیں بھگتتا ہے۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ ہمارے حصہ میں آنے والا امیگریشن عہدیدار خود بھی مزاح نگار ہوگا۔ اس نے ہمارا پاسپورٹ دیکھنے کے بعد ہم سے لندن آنے کی غرض و غایت پوچھی۔ ہم نے کہا ''اُردو مجلس (برطانیہ) کی دعوت پر لندن آئے ہیں۔ جلسوں وغیرہ کی صدارت کریں گے۔ کچھ اپنی سنائیں گے کچھ آپ کی سنیں گے اور اپنے ملک کو واپس چلے جائیں گے۔ یہ رہا اُردو مجلس کا دعوت نامہ۔'' اس نے دعوت نامے کو غور سے دیکھ کر کہا ''یہ اُردو مجلس کیا ہے؟''

کہا ''لندن کے اُردو بولنے والوں کی ایک تنظیم ہے۔''

پوچھا ''اُردو سے آپ کا کیا تعلق ہے؟''

ہم نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا ''تعلق کی بھی خوب رہی۔ بھیا! اس زبان کے مایہ ناز ادیب ہیں اور ساری زندگی اس زبان کی خدمت کرتے آئے ہیں۔ اب آپ کے ملک میں بھی اُردو کی تھوڑی سی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔''

پوچھا ''آپ اِدھر ہمارے ملک میں آئیں گے تو اُدھر آپ کے ملک میں اُردو کی خدمت کون انجام دے گا؟''

ہم نے کہا ''آپ اس کی فکر نہ کریں۔ دو سو برس تک آپ ہماری فکر کر کے دبلے ہوتے رہے۔ یوں بھی ہمارے ملک میں دس بارہ ہزار افسانہ نگار اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ شاعر پہلے ہی سے اس زبان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم ادھر آ جائیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔''

اس نے حیرت سے ہماری طرف دیکھ کر پوچھا'' یہ بتایئے آپ کتنے عرصے تک لندن میں اُردو کی خدمت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

ہم نے کہا'' یہی کوئی ایک مہینے تک آپ کے ملک میں اُردو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں''۔

پوچھا'' ایک مہینہ تک آپ لندن میں اس زبان کی خدمت انجام دیں گے تو کیا اتنی خدمت اس زبان کے لئے کافی ہوگی۔لگتا ہے آپ بہت زیادہ خدمت انجام دیتے ہیں''۔

ہم نے کہا'' ذرّہ نوازی کا شکریہ! لیکن ہمیں لندن میں بہت زیادہ خدمت انجام دینے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آپ کے ملک میں بھی کم از کم ہزار ڈیڑھ ہزار افسانہ نگار اور پانچ چھ ہزار شاعر اس زبان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔''

اس نے ہنس کر کہا'' جب اس زبان کے اتنے سارے خدمت گذار خود برطانیہ میں موجود ہیں تو آپ نے یہاں آنے کا تکلف کیوں کیا؟''

اس کے اس اچانک اور غیر متوقع سوال پر ہمیں تشویش ہونے لگی۔ہمیں لگا کہ اس کی نیت اچھی نہیں ہے اور ہمیں اپنے ملک میں آنے کی اجازت نہیں دینا چاہتا۔لہٰذا ہم نے آخری حربے کے طور پر اپنے دوست نقی تنویر کا وہ حلفیہ بیان پیش کر دیا جس کے بارے میں نقی تنویر نے ہمیں لکھا تھا کہ اگر اُردو مجلس کے دعوت نامے کی بنیاد پر امیگریشن والے تمہیں ویزا دینے میں ٹال مٹول کریں تو میرا یہ حلف نامہ ان کی خدمت میں پیش کر دینا۔اس حلف نامے کی رُو سے لندن میں تمہارے قیام اور تمہاری ذات سے متعلق سارے اخراجات کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ہم اپنے دوستوں کے بیان پر چاہے وہ غیر حلفیہ ہی کیوں نہ ہو ضرورت سے زیادہ بھروسہ کر لیتے ہیں۔چنانچہ خود ہم نے اس بیان کو پہلے سے نہیں پڑھا تھا۔عہدیدار مذکور اس حلف نامے کو پہلے تو غور سے پڑھتا رہا۔پھر بولا'' آپ بھی عجیب آدمی ہیں اور لوگ تو لندن میں آباد ہونے کے ارادے سے آتے ہیں اور آپ یہاں بہ نفسِ نفیس آ کر دفن ہونا چاہتے ہیں۔کیا آپ کے ملک میں دفن ہونے کی سہولت بھی نہیں ہے۔''

ہم نے آنکھیں پھاڑ کر کہا'' نعوذ باللہ! ہم آپ کے ملک میں کیوں دفن ہونے چلیں۔دفن ہونے کے لئے ہمارے ملک سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ہے۔آپ نے ہمارے

عالیشان مقبرے نہیں دیکھے کہ کس اہتمام سے مردے کو دفن کیا جاتا ہے۔تبھی تو ایسی بات کررہے ہیں۔ویسے یہ کفن دفن والا آپ کا سوال ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔"

اس نے نقی تنویر کا حلف نامہ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا" آپ نے اپنے دوست کا حلف نامہ غالباً نہیں پڑھا ہے۔اگر پڑھ لیتے تو لندن نہ آتے۔آپ خود پڑھ کر دیکھ لیجئے تب ہمارا سوال آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔"

اب جو ہم نے حلف نامہ کو پڑھنا شروع کیا تو ہماری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔نقی تنویر کے حلف نامے کا متن کچھ اس طرح تھا" میں نقی تنویر بہ قائمی ہوش وحواس اپنا یہ حلفیہ بیان قلم بند کراتا ہوں کہ میرے دوست مجتبیٰ حسین کے لندن میں قیام کے سارے اخراجات کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوگی۔ میں مزید یہ اعلان کرتا ہوں کہ اگر لندن میں مجتبیٰ حسین کا انتقال ہوجائے تو میں یا تو ان کی نعش کو ہندوستان روانہ کرنے کا بندوبست کرونگا یا پھر برطانیہ میں ہی کسی موزوں جگہ پر ان کی تدفین کا انتظام کرونگا۔اور یہ سارے اخراجات میں خود برداشت کروں گا۔"

امیگریشن عہدیدار نے ہمارے چہرے پر خوف اور پریشانی کے آثار کو بھانپ کر کہا "مسٹر حسین! آپ کے دوست کی نیت اچھی نہیں ہے۔کیا آپ اب بھی لندن شہر میں جانے کی اجازت لینا چاہیں گے یا واپسی کا ارادہ ہے۔"

ہم نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا" آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ان دنوں دوست اور دشمن میں تمیز کرنا بہت دشوار ہے۔یہ ذات شریف میرے بچپن کے دوست ہیں اور ذرا دیکھئے کہ میرے تعلق سے ان کے ارادے کتنے خطرناک ہیں۔ویسے اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ مجھے ویزا دیں یا نہ دیں۔" امیگریشن عہدیدار نے ہنس کر کہا" اب تو آپ کو ویزا ضرور دونگا۔یہ میری مجبوری ہے کیونکہ آپ تو مر کر بھی برطانیہ کا کچھ بگاڑنا نہیں چاہتے۔" اس نے دھڑ سے ہمارے پاسپورٹ پر ویزا کی مہر لگادی پھر آنکھ مار کر بولا" مسٹر حسین! ایک بات یاد رکھئے۔اگر آپ کا دوست کسی کو دفن کرنا ہی چاہتا ہے تو میری یہ خواہش ہے کہ وہ آپ کو دفن نہ کرے بلکہ اُردو کو دفن کردے کیونکہ اُردو کو دفن کرنے یا اس کی نعش کو ہندوستان روانہ کرنے میں اتنے اخراجات نہیں آئیں گے جتنے کہ آپ کو یہاں دفن کرنے میں آئیں گے۔ میں تو

آپ اور آپ کے دوست کے فائدے کی بات کر رہا ہوں۔‘‘

ہم اپنا پاسپورٹ لے کر بوجھل قدموں سے وہاں سے نکل گئے۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہم اپنے کندھوں پر خود اپنی ہی نعش کو اٹھائے جا رہے ہیں۔ سامان واپس دینے والے بیلٹ پر جا کر اپنا سامان اٹھایا۔ پھر خود کار راستے پر سامان سمیت اپنی میت کو جتن سے کھڑا کیا اور آگے کو نکل گئے۔ دو ایک جگہ ہیتھرو ایئرپورٹ پر اُردو میں بھی مسافروں کے لئے ضروری ہدایات نظر آئیں جیسے ایئرپورٹ کو صاف ستھرا رکھئے یعنی سگریٹ کے ٹکڑے نہ پھینکو، مونگ پھلی کے چھلکے نہ بکھراؤ، براہ کرم اپنا تھوک اپنے مُنہ ہی میں رکھو وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہماری ذہنی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ ہیتھرو ایئرپورٹ پر اُردو عبارت کو پڑھ کر وہ والہانہ مسرت حاصل نہ ہوئی جو عام طور پر خود ہندوستان میں کبھی اُردو عبارت کے نظر آ جانے پر حاصل ہوتی ہے۔ یوں بھی صفائی سے متعلق اُردو میں اس عبارت کو درج کرنے کا مقصد اُردو کی اہمیت کو تسلیم کرنا نہیں تھا بلکہ اس طرح صفائی کے تعلق سے اُردو والوں کی شہرہ آفاق عادات و اطوار کو دنیا والوں پر اُجاگر کرنا تھا۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ اس غیر ضروری ہدایت کو چھوڑ کر بقیہ ساری ضروری ہدایتیں اُردو میں درج نہیں ہیں۔

ہیتھرو ایئرپورٹ پر ہدایات اتنی واضح ہوتی ہیں کہ کوئی مسافر راستہ بھٹکنا چاہے تو تب بھی بھٹک نہیں سکتا۔ یہاں بھٹکنے کے لئے بہت محنت اور جستجو کرنا پڑتی ہے۔ یوں بھی ہمیں پتہ تھا کہ یہ سارے راستے ہمیں مقتل کی طرف لیجا رہے ہیں۔ تبھی تو یہ اہتمام ہے۔ ہم ٹرالی پر اپنا سامان رکھے کسٹم کے حلقہ سے باہر نکل آئے تو دیکھا کہ نقی تنویر ریلنگ سے لگے کھڑے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی خوشی سے ان کی باچھیں کھل اٹھیں اور ہم نے دل میں سوچا کہ ذرا دیکھو تو ظالم کو ہمیں دفن کرنے کی کتنی مسرت ہے۔ ہم باہر آئے تو نقی ہم سے بغلگیر ہونے کے لئے جتنا آگے بڑھتے تھے اتنا ہی ہم پیچھے ہٹتے جاتے تھے۔ ہم اصل میں یہ اطمینان کر لینا چاہتے تھے کہ کہیں نقی کے ہاتھ میں چھری چاقو تو نہیں ہے۔ بارے بغلگیری کا مرحلہ طئے ہوا تو نقی نے کہا ’’بہت اُداس اور نڈھال دکھائی دیتے ہو۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟‘‘

ہم نے کہا ’’ ویسے تو سارے سفر میں چاق و چوبند رہے۔ ابھی ابھی تمہارے ہیتھرو ایئرپورٹ پر اُترنے اور امیگریشن عہدیدار سے بات کرنے کے بعد ہماری یہ حالت

ہوگئی ہے۔''

نقی نے کہا'' امیگریشن والوں نے تمہیں تنگ تو نہیں کیا؟''

ہم نے کہا'' امیگریشن عہدیدار تو بہت بھلا آدمی تھا۔تم جانتے ہو کہ ہمیں شکایت تو ہمیشہ اپنوں ہی سے ہوتی ہے۔خیر اس مسئلہ پر بعد میں بات کریں گے۔''

نقی نے کہا'' آخر بات کیا ہوئی۔یہ تو بتاؤ؟''

ہم نے کہا'' ہمیں فوراً اس جگہ لے چلو جہاں تم نے ہمارے قیام کا بندوبست کیا ہے۔اس وقت ہماری جذباتی اور نفسیاتی حالت کچھ اچھی نہیں ہے۔تنہائی میں کچھ دیر غور کرنا چاہتے ہیں۔یوں بھی سولہ گھنٹے کا سفر کر چکے ہیں۔''

نقی نے کہا'' فوراً چلنا تو ناممکن ہے کیونکہ تمہارا ہوائی جہاز مقررہ وقت سے پچیس منٹ پہلے ہی لندن پہنچ گیا ہے اور ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بھی تمہیں ریسیو کرنے کے لئے آئیں گے۔وہ ماہر آثار قدیمہ ہیں۔اپنے وقت پر آئیں گے اِن کا انتظار کرنا ضروری ہے۔''

ہم نے دل میں سوچا نقی کتنا خطرناک آدمی ہے۔ایک ماہر آثار قدیمہ کو بھی شریک جرم کرنا چاہتا ہے۔

اتنے میں ڈاکٹر شکیب آ گئے تو ہم نے انھیں جیسے تیسے ریسیو کیا۔ڈاکٹر شکیب اُن ماہرین آثارِ قدیمہ میں سے ہیں جو دوسروں کو آثارِ قدیمہ میں تبدیل ہوتے دیکھ کر تو بہت خوش ہوتے ہیں لیکن اپنے آپ کو ہمیشہ جوان رکھتے ہیں۔چنانچہ ہمارے بالوں میں پھیلتی سفیدی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بولے'' اب تمہاری شخصیت معتبر ہوتی جارہی ہے۔''

ہم نے کہا '' زندگی کی آخری گھڑیوں میں آدمی میں اتنی معتبری تو آ ہی جاتی ہے۔''نقی اور شکیب دونوں کو یہ فکر تھی کہ ہم ایرپورٹ سے باہر نکل آئیں تو ہم لندن کی سردی کو کس طرح قبول کریں گے۔ہم نے کہا آپ حضرات ہماری فکر نہ کریں۔دوستوں کی سرد مہری اور دلی کی سردی سے ہماری پرانی شناسائی ہے۔ہم دانتوں کو بجاتے ہوئے نقی کی کار میں بیٹھ گئے تو نقی نے اچانک ہمارے اطراف ایک بیلٹ کو باندھنا شروع کردیا۔جب ہم سیٹ سے اچھی طرح جکڑ دیئے گئے تو ہمیں اچانک یہ خیال آیا کہ یہ سب ہمیں ہلاک کرنے اور بعد میں

دفن کرنے کی تیاریاں ہیں ورنہ کون اپنے جگری دوست کو اس طرح باندھتا ہے۔ہم سے رہا نہ گیا۔بولے ''یار نقی! تم ہمارے دوست ہو۔تمہارے لئے جان حاضر ہے۔ہم بیلٹ میں جکڑے بغیر ہی جان دے سکتے ہیں بلکہ اپنی جان خود اپنی ہتھیلی پر رکھ کر تمہیں پیش کرنے کو تیار ہیں۔ہمیں معلوم ہے کہ تم ہمیں لندن میں دفن کرنے کا خطرناک ارادہ رکھتے ہو۔مگر جان من پہلے لندن کو دیکھ لینے تو دو۔ایسی بھی کیا جلدی ہے۔'' نقی نے زوردار قہقہہ لگا کر کہا ''اب سمجھ میں آیا کہ تم میرے حلف نامے سے خوفزدہ ہو۔یار میں نے تمہیں دفن کرنے کی بات صرف امیگریشن والوں کو مطمئن کرنے کے لئے لکھی تھی۔بچپن کے دوست ہو۔میری قسم پر بھروسہ کرتے شرم نہیں آئی۔ساری زندگی جھوٹی قسمیں کھاتے گذری۔رہی کار میں تمہیں بیلٹ سے باندھنے کی بات تو بھیا یہ یہاں کا دستور ہے۔بیلٹ نہ باندھو تو پچاس پونڈ جرمانہ ہو جاتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ جرمانہ بیلٹ نہ باندھنے والے سے ہی وصول کیا جاتا ہے۔تم ابھی ابھی لندن آئے ہو۔تمہار پاس جرمانہ ادا کرنے کے لئے پچاس پونڈ کہاں سے آئیں گے۔''

نقی کی بات کو سن کر دل کو کچھ اطمینان آیا۔تاہم حفظِ ماتقدم کے طور پر ہم نے ڈاکٹر شکیب کو گواہ بنا کر نقی سے یہ وعدہ لیا کہ خدانخواستہ اگر ہمیں کچھ ہو گیا تو وہ ہمیں لندن میں دفن نہیں کریں گے بلکہ ہماری نعش وطن عزیز کو روانہ کر دیں گے تاکہ وطن والے ہمارا ایک اچھا اور رواجی سا مقبرہ بنائیں۔سال کے سال دھوم دھام سے ہمارا عرس وغیرہ منائیں۔اس وعدہ کے بعد نقی کی کار لندن کی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

(''سفرِ لخت لخت۔'' ۱۹۸۴)

☆☆

قیام الدین کے گھر ہمارا قیام

صاحبو! وطن عزیز میں آج تک ہمیں کوئی اچھا پڑوسی نہ مل سکا اسی لئے جب بھی ملک سے باہر جاتے ہیں تو ایک اچھے پڑوسی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ٹوکیو میں ہمیں شہنشاہ جاپان کا پڑوسی بننے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ ماشاء اللہ بہت اچھے پڑوسی ثابت ہوئے۔ کبھی ہماری خیریت نہیں پوچھی اور نہ ہی کبھی شکر یا چائے کی پتی وغیرہ ہم سے منگوائی۔ لندن پہنچتے ہی ہمارے دوست نقی تنویر نے ہمیں بتایا کہ تین گھروں کے دروازے لندن میں ہمارے لئے کھلے ہیں جہاں مناسب سمجھو وہاں قیام کرنا۔ ہم نے کہا ''پہلے یہ بتاؤ کہ ہمارے تعلق سے تمہارے اپنے گھر کے دروازوں کا کیا رویہ ہے۔؟''

بولے'' تمہارے لئے تو میرے گھر کے دروازے اگر بند بھی ہوں تو توڑے جاسکتے ہیں۔ مگر میں خود بوجوہ ان دنوں اپنے ایک حیدرآبادی دوست قیام الدین کے ہاں مقیم ہوں۔ چاہو تو تم بھی وہیں قیام کر لینا۔''

ہم نے کہا'' یار نقی تم قیام الدین کے ہاں قیام کرو یا طعام الدین کے ہاں۔ آج کی رات تو ہمارا قیام وطعام وہیں رہے گا جہاں تم قیام کر رہے ہو۔ چاہے یہ گھر قیام الدین کا ہی کیوں نہ ہو۔ بس شرط یہ ہے کہ اڑوس پڑوس اچھا ہونا چاہیئے۔''

بولے'' قیام الدین ہیمپسٹیڈ میں رہتے ہیں اور تنہا رہتے ہیں۔ ہیمپسٹیڈ لندن کا مشہور علاقہ ہے۔ ویسے تو لندن (700) مربع میل پر پھیلا ہوا ہے لیکن سیاحوں کا لندن یعنی اصل تاریخی لندن جنوب میں چیلسی سے ہیمپسٹیڈ تک 5 میل کے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔ ہیمپسٹیڈ لندن کا ایک

قدیم اور تاریخی علاقہ ہے۔ اس کے چپہ چپہ پر برطانیہ کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ یہاں شرفا اور مہذب لوگ رہتے ہیں۔ انگریزی کا مشہور شاعر کیٹس یہیں رہتا تھا۔ برطانوی مفکر ہیرولڈ لاسکی بھی یہیں رہتے تھے۔ رابندر ناتھ ٹیگور لندن آئے تھے تو اسی علاقے میں فروکش ہوئے تھے۔''

ہم نے کہا'' یہ تو تم ماضی کے پڑوسیوں کا ذکر کر رہے ہو۔ حالیہ پڑوسیوں کے بارے میں بھی کچھ بتاؤ۔'' بولے'' مشہور لیبر لیڈر مائیکل فٹ ہماری گلی کے نکڑ پر رہتے ہیں۔ روز صبح کو یہیں دوڑ لگاتے ہیں۔ چاہو تو تم بھی ان کے ساتھ دوڑ لگانا اور ہاں ایک بات اور بتاتا چلوں کہ ہیمپسٹیڈ میں جس قسم کا حسن دکھائی دیتا ہے وہ لندن کے کسی علاقے میں دکھائی نہیں دیتا۔''

ہم نے کہا'' حسن کا ہمارے سامنے ذکر نہ کرو۔ دیسی حسن نے دل پر جو گھاؤ لگائے ہیں وہی کیا کم ہیں کہ اب ہم بدیسی حسن کے گھاؤ سے اپنا سینہ چھلنی کراتے پھریں۔'' سو ہم اچھے اور حسین پڑوسیوں کے ساتھ ہیمپسٹیڈ میں اپنے حیدر آبادی دوست قیام الدین کے گھر مقیم ہو گئے۔ قیام الدین سے اگرچہ ہماری ملاقات لندن میں ہوئی لیکن یوں لگتا ہے جیسے وہ ہمیں اور ہم اُنھیں جنم جنم سے جانتے ہوں۔ وجہ اس کی غالباً یہ ہے کہ انھوں نے اپنی جوانی جن گلیوں میں کھوئی ہے وہیں کہیں ہم نے بھی اپنی جوانی کسی قدر تاخیر سے کھوئی ہے بلکہ اب بھی موقع ملتا ہے تو اپنی بچی کھچی جوانی یہیں کھوتے ہیں۔ قیام الدین پچھلے بائیس برسوں سے لندن میں مقیم ہیں۔ لندن کے کسی سرکاری دفتر میں کام کرتے ہیں۔ ہمارے لندن پہنچنے سے پہلے ریٹائر ہو چکے ہیں بلکہ تقی تنویر کا بیان ہے کہ ہماری آمد کے پیشِ نظر ہی ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ ہمیں بھی لندن میں ایک ایسے ریٹائرڈ آدمی کی ضرورت تھی جس کی معیت میں ہم لندن کی گلیوں کی خاک وغیرہ چھان سکیں۔ تیسری منزل پر ان کا یہ خوبصورت فلیٹ ہے جس میں ہم مقیم ہیں۔ ایک ہی طرز پر بنے ہوئے یہ تین منزلہ فلیٹ بہت خوبصورت لگتے ہیں۔

ہم نے قیام الدین سے کہا'' آپ کو لندن کی تاریخ سے خاصی دلچسپی معلوم ہوتی ہے تبھی تو آپ نے ایک تاریخی محلہ میں مکان لے رکھا ہے۔''

ہمارے اس سوال کے جواب میں قیام الدین نے اپنے ڈرائینگ روم کی کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور پوچھا'' اس منظر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

ہم نے دیکھا دور دور تک چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں جن پر چھوٹے چھوٹے

خوبصورت مکان بنے ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ انواع واقسام کے درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے ہیں۔ ہم اس منظر کی دلفریبی میں کھونے والے ہی تھے کہ قیام الدین نے پھر پوچھا ''آپ نے بتایا نہیں کہ اس منظر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

ہم نے منظر میں مزید ڈوبتے ہوئے کہا ''بہت اچھی رائے ہے۔''

بولے ''میں آپ کی اچھی یا بُری رائے جاننا نہیں چاہتا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ایسا منظر آپ نے اس سے پہلے کہیں دیکھا ہے؟''

ہم نے بے خیالی میں کہہ دیا ''ہاں جاپان میں دیکھا ہے۔''

بولے ''جاپان کو ماریئے گولی۔ کیا آپ کو یہ منظر ہمارے بنجارہ ہلز کی طرح دکھائی نہیں دیتا۔'' ہم نے ان کا دل رکھنے کے لئے ہاں میں ہاں ملائی تو بہت خوش ہوئے۔ پھر ہمیں اپنے باورچی خانے میں لے گئے۔ باورچی خانہ کی کھڑکی کھولی تو ہمیں سامنے ہی ایک بڑا سا درخت نظر آیا۔ درخت کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ''بتایئے یہ کونسا درخت ہے؟''

ہم کوئی ماہر نباتیات تو ہیں نہیں بلکہ ہمیں تو آم کے پیڑ اور امرود کے پیڑ میں بھی کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ کسی پیڑ کو اس وقت تک پہچان نہیں سکتے جب تک کہ اس پر پھل نہ لگ جائے۔ ہم نے سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا ''ضرور کوئی حیدرآبادی درخت لگتا ہے، غالباً املی کا درخت معلوم ہوتا ہے۔''

بولے ''بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ اگرچہ یہ املی کا درخت نہیں ہے لیکن ہو بہو املی کے درخت جیسا لگتا ہے۔ املی میں اتوار کے اتوار ساؤتھال سے لاتا ہوں۔ اس درخت کو دیکھ کر سالن میں املی ڈالتا ہوں تو املی کی کھٹاس میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور حیدرآباد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

املی، املی کے پیڑ اور املی کی کھٹائی کی معرفت حیدرآباد سے قیام الدین کی جذباتی وابستگی کا اندازہ لگانے کے بعد ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ہم لندن آنے کے باوجود حیدرآباد ہی میں مقیم ہیں۔ اگرچہ ہم نے لندن کی گلی گلی کی خاک چھانی ہے لیکن اس کے باوجود اگر آپ کو یہ محسوس ہو کہ ہم نے لندن کو اس طرح نہیں دیکھا جس طرح کہ ہمیں دیکھنا چاہیئے تھا تو اس میں قصور ہمارا نہیں قیام الدین کا ہے۔ ہم دن میں زیادہ تر ان ہی کے ساتھ لندن کی سیر کو نکلتے ہیں۔ رات

کی سیر میں البتہ اُنہیں ساتھ نہیں رکھتے کیونکہ اسی میں اُن کی بھلائی کے علاوہ ہماری اپنی بربادی بھی مقصود ہے۔ وہ ہر لمحہ حیدرآباد کو نہ صرف یاد کرتے ہیں بلکہ ہم پر مثالوں کے ذریعہ یہ واضح کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ حیدرآباد، لندن سے زیادہ خوبصورت شہر ہے۔ ہم چونکہ ان کے مہمان ہیں اسی لئے ان کی بات مان لیتے ہیں۔

ہم نے لندن کا پہلا دن انہی کے ساتھ گذارا۔ ہمیں لندن کی سردی سے بچنے کے لئے فوراً ایک اوورکوٹ خریدنا تھا۔ قیام الدین نے کہا "آکسفورڈ اسٹریٹ پر مارک اینڈ اسپنسر کے ڈپارٹمنٹل اسٹور سے خرید لیتے ہیں۔ اچھا اور سستا ملے گا۔"

نقی نے بات کو کاٹتے ہوئے کہا "وہ یہودیوں کا ڈپارٹمنٹل اسٹور ہے وہاں سے ہرگز نہ خریدو۔ تمہارے اوورکوٹ خریدنے سے کہیں وہ اور بھی مالدار نہ ہو جائیں"۔

قیام الدین نے کہا "یہودیوں کا ڈپارٹمنٹل اسٹور ہے تو کیا ہوا۔ یہ ایک ایسی سڑک پر واقع ہے جسے دیکھ کر ایک حیدرآبادی سڑک کی یاد آجاتی ہے۔"

ہم انھیں کے ساتھ پہلے پہل لندن کی زیرزمین ٹرین 'ٹیوب' میں بیٹھے۔ ہیمپسٹیڈ سے پکاڈلی سرکس کا فاصلہ بمشکل بیس منٹ میں طئے ہوتا ہے البتہ بوسٹن کے اسٹیشن پر ہمیں پکاڈلی جانے کے لئے سدرن لائن کو چھوڑ کر پکاڈلی لائن کی گاڑی پکڑنی پڑتی تھی۔ قیام الدین نے ہمیں بتایا کہ ہم ہمیشہ بوسٹن پر گاڑی بدل کر پکاڈلی لائن لیا کریں۔ یہ ہمارا پہلا دن تھا لہٰذا ہم نے کہا "آج تو ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ جب اکیلے لندن کی سیر کو نکلیں گے تو بوسٹن کا خیال رکھیں گے۔" ہم نے تب تک برطانیہ کے رائج الوقت سکوں کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ لہٰذا قیام الدین نے ہی ہمارا ٹکٹ خریدا۔ ہم بوسٹن کے اسٹیشن پر پکاڈلی کا ٹکٹ لینے کے لئے قیام الدین کے پیچھے پیچھے چلے جارہے تھے کہ ایک منزل پر قیام الدین نے تیزی سے دوڑنا شروع کر دیا۔ ہم بھی انکے تعاقب میں بھاگنے لگے۔ ایک مرحلہ پر انھوں نے بڑی عجلت کے ساتھ ایک کاؤنٹر سے ٹکٹ خریدا اور ٹکٹ چیکر کو دکھا کر پھرتی سے دوسری طرف کو نکل گئے۔ ہم بھی ان کے پیچھے جانے لگے تو ٹکٹ چیکر نے ہمیں روک لیا اور ہم سے ٹکٹ دکھانے کا مطالبہ کرنے لگا۔ ہم نے کہا ابھی جو صاحب تیزی سے اُدھر گئے ہیں انہوں نے ہمارا ٹکٹ آپ کو دیا ہوگا کیونکہ ہم تو انہی کے ساتھ ہیں۔

ٹکٹ چیکر نے ہم سے کہا "معاف کیجئے! جو صاحب ابھی گئے ہیں انہوں نے آپ کا

کوئی ٹکٹ نہیں دیا۔ میں مجبور ہوں۔ آپ کو اس طرف جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

یہ سن کر ہمارے پیروں تلے سے بوسٹن کا اسٹیشن نکل گیا۔ ہماری جیب میں ایک پنس بھی نہیں تھی۔ سوچا اب یہیں رُکے رہنے میں عافیت ہے کیونکہ مارک اینڈ اسپنسر کے ڈپارٹمنٹل اسٹور پر پہنچنے کے بعد جب قیام الدین ہمیں اپنے پیچھے نہیں پائیں گے تو وہ ضرور ہماری تلاش میں پھر بوسٹن اسٹیشن پر آئیں گے اور ہم انہیں کھڑے ہوئے مل جائیں گے۔ ہم نے نقی کا فون نمبر بھی اپنے ساتھ نہیں رکھا تھا کہ اسے فون پر اپنی بپتا سناتے۔ مگر فون کرنے کے لئے بھی تو دس پنس کی ضرورت تھی۔ چار و ناچار ایک کونے میں کھڑے سوچتے رہے کہ اب قیام الدین پکاڈلی کی گاڑی میں بیٹھے جا رہے ہوں گے اور اب انہیں پتہ چلا ہوگا کہ ہم ان سے بچھڑ گئے ہیں۔ لیکن ابھی پانچ منٹ بھی نہیں گذرے تھے کہ قیام الدین اپنی پتلون کی زِپ کو ٹھیک کرتے ہوئے ہماری طرف آتے دکھائی دیئے۔ ٹکٹ چیکر کو پار کر کے ہماری طرف آئے تو ہم نے کہا'' آپ غالباً عجلت میں ہمارا ٹکٹ لینا بھول گئے تھے۔ ٹکٹ چیکر نے ہمیں اندر آنے نہیں دیا۔''

قیام الدین نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا'' کیا آپ کو بھی آ رہا ہے۔''

ہم نے کہا'' آپ کی بات کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ ہمیں کیا آئے گا؟''

بولے'' بھئی! کیا آپ کو بھی پیشاب آ رہا ہے؟''

ہم نے نفی میں جواب دیا تو بولے'' میں تو پیشاب کرنے گیا تھا۔ جو ٹکٹ خریدا تھا وہ پیشاب کرنے کا تھا۔ آپ نے بتایا نہیں ورنہ میں آپ کا ٹکٹ بھی لے لیتا۔''

ہم نے پوچھا'' کتنے کا ٹکٹ ہے؟''

بولے۔'' بیس پنس کا''

ہم نے بیس پنس کو ہندوستانی سکہ میں تبدیل کیا تو جواب آیا تین روپے۔ (پندرہ روپے کا ایک پونڈ ہوتا ہے اور ایک پونڈ میں سو پنس ہوتے ہیں)۔

ہم نے کہا'' قیام الدین صاحب ہمارا پیشاب اتنا قیمتی نہیں ہے بلکہ ہمارا تو کُجا بھائی مرار جی دیسائی کا پیشاب بھی اتنا قیمتی نہیں ہوگا کہ ایک پیشاب پر تین روپے خرچ کریں۔ ہمارے ہاں تو اتنے روپیوں میں اتنی ہی مقدار کا کوئی اچھا سا مشروب مل جاتا ہے۔''

ہنس کر بولے۔'' اصل میں گھر سے نکلتے وقت میں پیشاب کرنا بھول گیا تھا اسی لئے

عجلت میں جانا پڑا ورنہ میں ایسی فضول خرچی نہیں کرتا۔''

ہم نے کہا۔'' یہ اچھا ہی ہوا۔ اگر آپ نہ بھولتے تو ہمیں یہاں کے آٹے دال کا بھاؤ کیونکر معلوم ہوتا۔''

بولے '' آپ بھی دلچسپ آدمی ہیں۔ اس میں آٹا کہاں ہے اور دال کہاں ہے۔ لندن میں ہمیں پیشاب کرنے کے معاملے میں وہ سہولت حاصل نہیں ہے جو اپنے حیدرآباد میں حاصل ہے۔ جب ذرا گردن جھکائی کر دیا۔''

وہ بات کے موضوع کو پھر حیدرآباد کی طرف لیجانے لگے تو ہم انھیں پکڑ کر پکاڈلی لائن کی طرف لے گئے۔ پکاڈلی سرکس کی پہلی سیر ہم نے قیام الدین کے ساتھ ہی کی۔ قیام الدین بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ صبح کو لمبی دوڑ لگا کر آتے ہیں۔ دوپہر میں پیراکی کرنے جاتے ہیں۔ شام کو ٹینس کھیلنے جاتے ہیں۔ اتنی جسمانی ورزش کے بعد اتنا تھک جاتے ہیں کہ شام ہوتے ہی سو جاتے ہیں۔ ہمارے لندن پہنچنے کے بعد انھوں نے سخت جسمانی ورزش کم کر دی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تیسری منزل کے فلیٹ میں رہتے ہیں اور ان فلیٹوں کا صدر دروازہ کسی کے اندر آتے ہی خود بخود بند ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص تیسری منزل پر رہنے والے سے ملنے آئے تو تیسری منزل پر رہنے والے کو اس شخص کے لئے دروازہ کھولنے کی خاطر کئی سیڑھیاں اتر کر نیچے جانا پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ پھر یہ اوپر بھی آتا ہوگا۔ ہم سے ملنے کے لئے اتنے لوگ آتے تھے کہ ہر گھنٹی کی آواز پر قیام الدین کو دروازہ کھولنے کے لئے کئی سیڑھیاں نیچے اتر کر جانا اور پھر اوپر آنا پڑتا تھا۔ دو چار دنوں تک تو ان کی دوڑ، پیراکی، ٹینس اور سیڑھی چڑھائی ساتھ ساتھ جاری رہی۔ بعد میں ماشاءاللہ اتنی سیڑھیاں اترنے اور چڑھنے لگے کہ پہلے صبح کی دوڑ سے ہاتھ دھو بیٹھے، بعد میں ٹینس کو خیرباد کہا اور پھر پیراکی کو بھی تہہ کر کے رکھ دیا۔ ان کا ایک اور محبوب مشغلہ دوستوں کی دعوتیں کرنا اور حیدرآبادی کھانا پکانا ہے۔ جتنے اچھے اور لذیذ حیدرآبادی کھانے ہم نے قیام الدین کے ہاں کھائے کبھی خود حیدرآباد میں نہیں کھا سکے۔ حیدرآبادی بریانی، بگھارے بیگن، دہی کی چٹنی، کھچڑی، نہاری اور ٹماٹر کا کٹ وغیرہ تو بناتے ہی تھے مگر بعض اوقات بڑے دلچسپ کھانے بھی بنا دیتے تھے۔ ایک دن قطب شاہی قورمہ بنایا۔ بہت پسند آیا۔ ہم نے اپنی معلومات میں اضافہ کی خاطر پوچھا یہ قورمہ محمد قلی قطب شاہ کے دور کی پیداوار ہے یا عبداللہ قطب شاہ کے دور کی دین

ہے۔ بولے ''قطب شاہوں کو لندن آنا ہی کب نصیب ہوا تھا کہ وہ یہ قورمہ کھاتے یا ایجاد کرتے۔ یہ قورمہ تو ایجاد بندہ ہے۔ وطن سے محبت کی خاطر اس قورمہ سے قطب شاہوں کی نسبت جوڑ دی۔'' ایک دن 'آصفجاہی کوفتے' بھی بنائے تھے۔ بہت لذیذ تھے۔ ایک بار ہم عجلت میں کہیں جا رہے تھے۔ قیام الدین نے پوچھا '' آج رات کیا کھانا چلے گا؟۔'' ہم نے انھیں ٹالنے کے لئے کہا ''امباڑے کی بھاجی کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔''

ہم نے سوچا تھا کہ امباڑے کی بھاجی کی فرمائش کے بعد قیام الدین کے دانت کھٹے ہو جائیں گے۔ رات واپس ہوئے تو سچ مچ امباڑے کی بھاجی تیار تھی۔ ہم نے پوچھا '' ہمیں دہلی میں امباڑے کی بھاجی نہیں ملتی آپ کو یہ جنس گراں مایہ لندن میں کہاں سے مل گئی؟۔'' نظریں نیچی کر کے بولے '' اپنے دیس سے محبت ہو تو پردیس میں بھی دیسی شئے مل جاتی ہے۔'' ہم نے اُن سے مزید یہ نہیں پوچھا کہ انھیں امباڑے کی بھاجی کہاں سے مل گئی کیونکہ جو شخص دیار غیر میں رہ کر بھی دکن میں رہتا ہو اُس سے ایسا بے تکا سوال پوچھنا بیکار تھا۔ قیام الدین دوستوں کے رسیا ہیں۔ لندن میں بائیس برس تک رہنے کے باوجود انہوں نے حیدرآبادی خلوص و محبت کو جس جتن سے محفوظ رکھا ہے اُسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اس قدر ٹوٹ کر چاہنے والے ہم نے بہت کم دیکھے ہیں۔ ہمارے دوست ضیاء الدین شکیب نے قیام الدین کے بارے میں ایک شعر بھی کہا ہے۔ آپ بھی سن لیجئے۔

شکیبؔ اپنی طبیعت جب بھی گھبراتی ہے لندن میں
تو دل کہتا ہے چل اے جاں قیام الدین کے گھر چل

(''سفرِ لخت لخت۔'' ۱۹۸۴)

☆☆

برطانیہ میں دھوم ہماری زباں کی ہے

پچھلے چار پانچ برسوں میں یہ جو ہم نے ملکوں ملکوں کی خاک چھانی ہے اس کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ ان ملکوں کی سیر وسیاحت مقصود تھی۔ بھیا ہم تو ان ملکوں میں اُردو کو تلاش کرنے گئے تھے۔ خدا کے فضل سے جاپان جیسے کاروباری ملک میں، جہاں اُردو تو اُردو انگریزی تک کو کوئی نہیں پوچھتا، وہاں بھی ہم نے اُردو کو ڈھونڈ ہ نکالا تھا اور اہلِ وطن کو یہ مژدہ سنایا تھا کہ جاپان میں اُردو خیریت سے ہے اور اُسے آپ کی نیک خیریت مطلوب ہے۔ جہاں تک برطانیہ کا معاملہ ہے وہاں ہم گئے ہی اُردو کے چکر میں تھے۔ اُردو مجلس (برطانیہ) کے مہمان تھے۔ آنے جانے کا کرایہ، کھانے، کپڑے اور پان بیڑی کے خرچ پر اُن سے ہمارے دورۂ برطانیہ کا معاہدہ طئے ہوا تھا۔ اندرون ملک بھی ہم کم وبیش انہی شرائط پر اُردو تنظیموں کے جلسوں میں شرکت کرتے ہیں۔ البتہ کپڑا دینے کی شرط نہیں لگاتے۔ برطانیہ میں اس لئے لگانی پڑی کہ ہمارے ہاں ایسے کپڑے نہیں تھے جو وہاں کی سردی اور وہاں کی اُردو کو موافق آسکیں۔

اُردو مجلس، برطانیہ کی اہم اُردو تنظیموں میں سے ایک ہے۔ اسی انجمن نے ۱۹۸۰ء میں ایک یادگار اور تاریخی آل انگلینڈ اُردو کانفرنس منعقد کی تھی۔ اس انجمن کے معتمد ہمارے دوست عباس زیدی ہیں جو عثمانیہ یونیورسٹی میں ہمارے ہم عصر رہ چکے ہیں۔ چونکہ بے حد جذباتی آدمی ہیں اسی لے اُردو کی خدمت کے لئے نہایت موزوں ہستی ہیں۔ اُردو کے لئے ہمیشہ سر سے کفن باندھے رہتے ہیں اور اسی لئے یا تو یہ دوستوں سے ناراض رہتے ہیں یا دوست اُن سے ناراض رہتے ہیں۔ ہم سے اپنی شدید محبت کے باعث لندن یونیورسٹی کے ہمارے پہلے جلسہ میں اتنے

جذباتی ہوگئے اور ہمارے تعارف میں کچھ اتنا غلو کر گئے کہ ہمیں ان کے تعارف کو صحیح ثابت کرنے کے لئے بہت زور لگانا پڑا۔ مگر شکر خدا کا کہ لندن والے بھی عباس زیدی کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اسی لئے ہماری جان بچ گئی اور انھوں نے ہم سے اتنی ہی توقع رکھی جس کے ہم اہل تھے۔ بیرسٹر غلام یزدانی اُردو مجلس کے صدر ہیں۔ یہ بھی یونیورسٹی میں ہمارے ہم عصر رہ چکے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ان کی شہرت کھلاڑی کی حیثیت سے تھی۔ ہمیشہ کسی نہ کسی درونِ خانہ یا بیرون خانہ کھیل میں مصروف نظر آتے تھے۔ اب لندن میں بیرسٹری کرتے ہیں اور لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں۔ کسی کو جیل بھجوانا یا کسی کو پھانسی کے تختہ سے واپس بلوانا ان کے بائیں ہی نہیں دائیں ہاتھ کا کھیل بھی ہے بلکہ اب تو یہ کھیل اُن کا پیشہ بن گیا ہے۔ لندن میں کروڑ پتیوں کے محلہ سے قریب رہتے ہیں اور لکھ پتیوں کی سی زندگی گزارتے ہیں۔ اُردو مجلس تو خیر ہماری میزبان تھی ہی لیکن اس کے علاوہ ہمیں لندن کی کئی اُردو تقاریب میں بھی شرکت کرنے کا موقع ملا۔ ہمارے زیادہ تر جلسے لندن یونیورسٹی میں ہی ہوئے جس میں شرکت کے لئے لوگ نہ جانے کہاں کہاں سے آتے تھے۔ ہمارے دوست ڈاکٹر یوسف علی خاں تو تین سو میل کی مسافت طئے کر کے کولچسٹر سے آتے تھے۔ جس کسی سے پوچھئے معلوم ہوتا کہ کم از کم پچاس میل کی مسافت طئے کر کے آیا ہے۔

اُردو کے لئے یہ ذوق وشوق صرف لندن ہی میں دیکھا۔ یہاں کی طرح نہیں کہ اُردو کی کوئی محفل ہمارے گھر سے چار کلومیٹر سے زیادہ کے فاصلے پر منعقد ہو تو ہم اس میں شرکت کرنے کو ایک غیر شرعی حرکت سمجھتے ہیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ برطانیہ میں ایک اندازے کے مطابق دس لاکھ اُردو بولنے والے موجود ہیں اور کم از کم پانچ سو اُردو تنظیمیں ہیں۔

ہم نے کہا "دس لاکھ اُردو بولنے والوں کے لئے صرف پانچ سو تنظیمیں نہایت ناکافی ہیں۔ ہمارے حساب سے دس لاکھ اُردو بولنے والوں کی کم از کم بیس لاکھ اُردو تنظیمیں تو ہونی ہی چاہئیں۔ ہماری ہی مثال لیجئے کہ اوّل تو ہم خود اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں، اس کے علاوہ ایک انجمن کے جنرل سکریٹری ہیں، دوسری انجمن میں ہم نائب صدر کے عہدہ پر فائز ہیں، تیسری انجمن سرپرست کی حیثیت سے ہماری بیش بہا خدمات سے استفادہ کرتی ہے، چوتھی انجمن میں ہم صدر کی حیثیت سے جلوہ گر ہیں، پانچویں انجمن کے ہم مشیر ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی انجمنیں ہیں
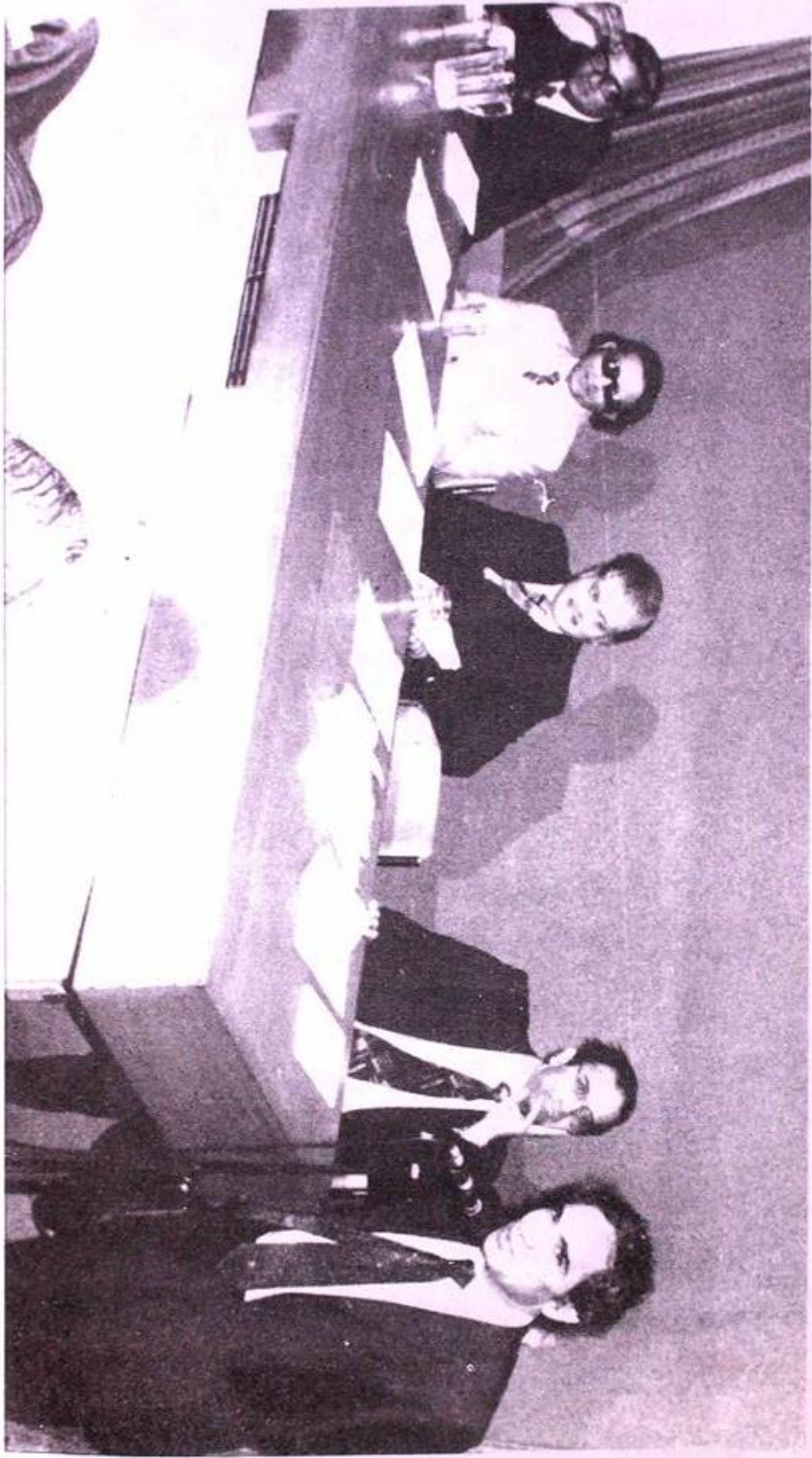
''شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں'' کی رسمِ اجرا کے موقع پر نقی تنویر محفل سے مخاطب ہیں۔ عباس زیدی، بیرسٹر غلام یزدانی، ڈاکٹر مغنی تبسم اور مجتبیٰ حسین کو دیکھا جا سکتا ہے۔
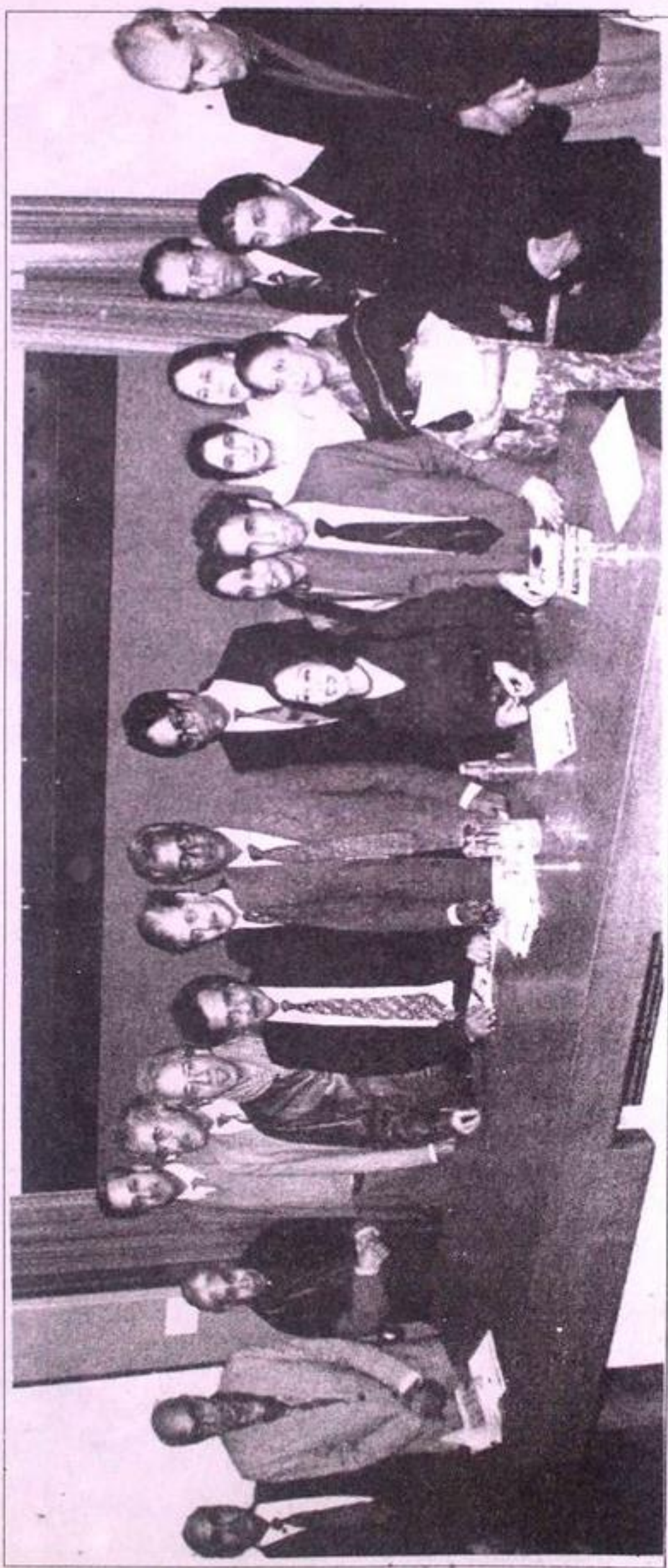
لندن یونیورسٹی کے خیر مقدمی جلسے میں لندن کے ادب دوستوں کے ہمراہ (بائیں سے) نواب یسین علی خاں، زبیدہ یسین، ضیاء الدین شکیب، رضا علی عابدی، ساقی فاروقی، وقار لطیف
بیرسٹر یزدانی، مجتبیٰ حسین، افتخار عارف، چاند کرن، نقی تنویر، عباس زیدی اور حسن عسکری وغیرہ وغیرہ

جو ہم سے رہنمائی، سرپرستی اور روشنی وغیرہ حاصل کرتی رہتی ہیں۔ غرض انجمن سازی اور خانہ بربادی اردو کلچر کی بنیادی خصوصیات ہیں۔

برطانیہ اور ہندوستان کے اُردو شاعروں اور ادیبوں میں کئی مماثلتوں کے باوجود ایک واضح فرق ہمیں یہ نظر آیا کہ برطانیہ کے اُردو شاعر ہمارے شاعروں کی طرح 'ہمہ وقتی شاعر' نہیں ہیں بلکہ ہفتہ کے پانچ دن سچ مچ کام بھی کرتے ہیں۔ البتہ جمعہ کی شام سے اتوار کی رات تک ''عرض کیا ہے'' اور ''ذرّہ نوازی کا شکریہ'' وغیرہ میں لگے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں خدانخواستہ کسی شاعر کا کلام اچھا ہو تو وہ مشاعرہ میں شرکت کے لئے رکشا کا کرایہ بھی مانگ لیتا ہے۔ برطانیہ کا اُردو شاعر رکشا کا کرایہ نہیں مانگتا بلکہ خود اپنی موٹر میں جاتا ہے (چاہے اس کا کلام اچھا ہی کیوں نہ ہو۔) برطانیہ کے مختلف شہروں میں آئے دن آل انگلینڈ مشاعرے بھی منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ برطانیہ کے اُردو شاعروں اور ادیبوں کو دیکھ کر ہمیں یہ خوشی ہوئی کہ برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں رہنے کے باوجود انھوں نے اپنے اندر حسد، رقابت، غیبت اور معاصرانہ چشمک جیسے ضروری جذبوں کو اپنے سینوں سے لگا رکھا ہے۔ یوں بھی ان ضروری جذبوں کے بغیر اُردو تہذیب کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ لندن کی کسی اُردو محفل سے ہم جلدی اٹھنا اس لئے پسند نہیں کرتے تھے کہ ہمارے جاتے ہی لوگ کہیں ہماری غیبت نہ شروع کردیں۔

برطانیہ میں یہ جو اُردو ماحول ہمیں میسر آیا تو جی خوش ہوگیا۔ مگر ہماری یہ خوشی پندرہ دنوں میں کافور ہوگئی۔ وجہ اس کی یہ ہوئی کہ اگر لگاتار پندرہ دنوں تک ہم انگریزی نہ بولیں تو ہماری طبیعت ناساز ہوجاتی ہے۔ زبان پر ورم آجاتا ہے۔ ماشاء اللہ اپنے دفتر میں ہر روز اتنی انگریزی بول اور لکھ لیتے ہیں کہ انگریز بھی ہمیں دیکھے تو رشک کرنے لگے جائے۔ ہم نے ابتداء میں لندن میں اپنے احباب سے انگریزی میں بات کرنے کی کوشش بھی کی مگر وہ ہم سے انگریزی میں بات کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ انگلستان میں ہی رہتے ہیں۔ اگر ہم سے بھی انگریزی میں بات کرنا پڑے تو ہمیں برطانیہ بلانے کا کیا فائدہ۔ یہ سراسر ان کی خودغرضی تھی۔ لہٰذا پندرہ دنوں بعد ہم مسلسل اُردو بولنے کی وجہ سے پریشان سے رہنے لگے۔ ایک دن لیمتھ برج پر ایک انگریز نے ہم سے سگریٹ مانگا تو ہم نے سگریٹ دینے سے پہلے اس سے انگریزی میں اس کی خیریت پوچھنے کے علاوہ یہ بھی پوچھا کہ میاں کیا کرتے ہو۔ گھر میں بال بچے وغیرہ تو خیریت

سے ہیں نا۔ اس نے ہمارے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ صرف سگریٹ لے کر 'تھینک یو' کہا اور آگے کو نکل گیا۔ تب ہمیں یقین آیا کہ انگریز کسی تعارف کے بغیر کسی اجنبی سے سگریٹ تو مانگ سکتا ہے لیکن اس سے بات نہیں کرسکتا۔ ایک دن آکسفورڈ اسٹریٹ پر ایک بڑھیا نے ہم سے ایک پونڈ مانگا۔ ہم نے سوچا کہ ضرورت مند بڑھیا ہے۔ اس کی مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر انگریزی میں بات کرنے کا نادر موقع ہے۔ ہم نے پوچھا "بڑی بی کیا کرتی ہو؟ کہاں رہتی ہو؟ تمہیں ایک پونڈ کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ ۱۹۴۷ء میں ہمارے ملک کو آزاد کرنے کے بعد تمہاری یہ حالت ہو جائے گی تو بخدا جدوجہد آزادی کی مخالفت کرتے۔" مگر بڑھیا نے ہمارے اتنے سارے سوالوں کے جواب میں صرف اتنا بتایا کہ وہ فرانسیسی ہے اور انگریزی نہیں جانتی۔ خیر ہند۔ فرانس دوستی کے نام پر اُسے ایک پونڈ دیا اور آگے کو نکل گئے۔

غرض انگریزی کی شدید قلت اور بحران کے پس منظر میں ایک دن ہم بی بی سی میں اپنا انٹرویو ریکارڈ کرانے گئے تو ہمارے دوست اور بی بی سی کے پروڈیوسر مجیب صدیقی نے ہمارا تعارف بی بی سی کے ایک انگریز عہدیدار سے کرایا۔ ہم نے سوچا یہ انگریزی بولنے کا بہترین موقع ہے۔ لہٰذا ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ان پر اپنی انگریزی کا حملہ کر دیا اور لگے طرح طرح کے سوالات پوچھنے۔ "یہ بش ہاؤس، جس میں بی بی سی کا دفتر ہے، اتنا معمولی اور سیدھا سادا سا کیوں ہے؟ اگر چہ آپ کی ملکہ بھی ایک سیدھے سادے محل میں رہتی ہیں اور برطانیہ کی وزیراعظم کا گھر بھی یونہی سا ہے۔ لیکن بی بی سی جس کی خبریں سنے بغیر نہ تو ہمارا کھانا ہضم ہوتا ہے اور نہ ہی آپ کو کھانا ملتا ہے، اس کا دفتر تو کم از کم کسی عالیشان عمارت میں ہونا چاہئے تھا۔ اور ہاں! یہ اچھا ہوا کہ آپ مل گئے۔ ہم تو آپ کے ملک میں انگریزی بولنے کے لئے ترس گئے تھے۔ سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم، بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے۔ اور سنایئے کیا حال ہیں؟"

ہم نے سوچا تھا کہ ہماری اتنی ساری انگریزی کے جواب میں بی بی سی کے انگریز عہدیدار موصوف ضرور اپنے مخصوص لہجہ میں انگریزی بولیں گے اور اس کے جواب میں ہم پھر انگریزی بولیں گے اور یوں ہمارا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ لیکن ان انگریز عہدیدار نے اچانک نہایت فصیح اُردو میں ہم سے کہا "حضور والا! آپ کھڑے کیوں ہیں؟۔ تشریف رکھئے۔ یہ باتیں تو بیٹھ کر بھی کی جاسکتی ہیں۔" یہ انگریز عہدیدار تھے مسٹر ڈیوڈ پیج جو بی بی سی کے اُردو شعبہ کے سربراہ

ہیں۔ اگر چہ انھیں معلوم تھا کہ ہم دہلی سے لندن آئے ہیں لیکن وہ ہم سے حیدرآباد کا حال پوچھتے رہے (اس وقت یقین آیا کہ بی بی سی کی عام معلومات کتنی اچھی ہیں)۔ بعض حیدرآبادی احباب کے بارے میں پوچھا۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر 'سیاست' کی خیریت پوچھی، ہم سے روزنامہ 'سیاست' کی تعداد اشاعت کے بارے میں پوچھا۔ ہم نے اپنے قیاس کے مطابق تعداد اشاعت بتائی تو بولے "جی نہیں! یہ سرکیولیشن تو دو برس پہلے کی ہے۔ اب تو اس سرکیولیشن میں غالباً مزید چار پانچ ہزار کا اضافہ ہوگیا ہے۔"

ہم نے ہار مانتے ہوئے کہا "بہت دنوں سے بی بی سی کو سننے کا موقع نہیں ملا اسی لئے 'سیاست' کی موجودہ سرکیولیشن کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔ آپ کی اطلاع یقیناً مصدقہ ہوگی۔" صاحبو! اس سانحہ کے بعد ہم نے پھر کبھی انگلستان میں انگریزی میں بات کرنے کی جرات نہیں کی۔ سارا دن اُردو شاعروں اور ادیبوں کی صحبت میں بیت جاتا تھا۔ اُردو مرکز اور اس کے سکریٹری افتخار عارف کا ذکر پھر کبھی تفصیل سے کریں گے۔ یہاں اتنا بتادینا ضروری سمجھتے ہیں کہ پکاڈلی سرکس جب بھی جاتے تھے تو اُردو مرکز میں ٹھکی ضرور لیتے تھے۔ کیونکہ یہاں احمد فراز، شہرت بخاری، فارغ بخاری اور کئی ادیبوں کے علاوہ اُردو کے کئی رسالوں اور اخبارات سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ ان کے علاوہ لندن میں جن ادبی شخصیتوں سے ملاقاتیں ہوئیں ان میں پروفیسر ڈیوڈ میتھیوز، سحاب قزلباش، اکبر حیدرآبادی، یاور عباس، رضا علی عابدی، وقار لطیف، حسن عسکری، حبیب حیدرآبادی، صدیقہ شبنم، عامر موسوی، دھرم پال جی، سوہن راہی، راج کھیتی، عدیل صدیقی، ایوب اولیا، باقر نقوی، معین الدین شاہ، چاند کرن، شمس الدین آغا، فردوس، عزیز الدین احمد، مصطفٰے شہاب، مریم کاظمی اور کرشن گولڈ قابل ذکر ہیں۔ ان احباب کی عنایتوں اور محبتوں سے ہمیں یہ احساس ہوا کہ ہم اپنے گھر میں نہیں ہیں اسی لئے زیادہ خوش وخرم اور آرام سے ہیں۔

یوں تو انگلستان سے کئی اُردو ہفتہ وار اور ماہنامے نکلتے ہیں لیکن لندن سے دو اُردو روزنامے 'جنگ' اور 'وطن' بھی نکلتے ہیں۔ ہمیں افتخار عارف کے ساتھ روزنامہ 'جنگ' کے دفتر جانے کا موقع ملا۔ 'جنگ' لندن کے ایڈیٹر اشرف قاضی نہ صرف بہت تپاک سے ملے بلکہ نیوز ایڈیٹر قیصر امام، اسٹنٹ ایڈیٹر زیڈ۔ یو۔ خان اور چیف رپورٹر ظہور نیازی سے ہمارا تعارف بھی

کرایا۔ ہم نے ان کا پریس بھی دیکھا۔ ان دنوں حلال گوشت کے مسئلے پر بریڈفورڈ میں خاصے احتجاجی مظاہرے ہو رہے تھے۔ 'جنگ' میں ان مظاہروں کی خبروں کو نمایاں طور پر شائع کیا گیا تھا۔ جنگ میں چھپے ہوئے بعض اشتہارات کو دیکھ کر ہمیں احساس ہوا کہ اُردو کا اخبار چاہے لندن سے نکلے یا مالیگاؤں سے وہ اپنے مزاج اور کردار کو برقرار رکھتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک 'ملاپ' بھی لندن سے نکلتا تھا مگر اب نہیں نکلتا۔ ساوتھال میں ہندوستان اور پاکستان کے سارے ادبی، نیم ادبی اور غیر ادبی رسالے مل جاتے ہیں۔

ہم نے لندن میں ایک بات بطور خاص محسوس کی کہ بنگالی ادیبوں کا جلسہ ہوتا ہے تو صرف بنگالی اس میں شرکت کرتے ہیں۔ اسی طرح ہر زبان کے جلسہ میں عموماً اسی زبان کے بولنے والے شریک ہوتے ہیں لیکن جب اُردو کا کوئی جلسہ ہوتا ہے تو اس میں نہ صرف بنگالی، پنجابی، سندھی اور دیگر زبانیں بولنے والے شریک ہوتے ہیں بلکہ برصغیر کے تین بڑے ممالک ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش سے متعلق باشندے بلالحاظ مذہب، زبان وتمدن شرکت کرتے ہیں۔ اُردو زبان کو جو کردار برصغیر میں ادا کرنا چاہیئے تھا اُسے وہ غیر محسوس طور پر لندن میں ادا کر رہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جو تارکانِ وطن اُردو کی محبت کے ساتھ انگلستان میں آباد ہو گئے ہیں ان کی نئی نسل اس زبان کو کس حد تک اپنے سینہ سے لگائے رکھتی ہے۔ لندن کے بعض اُردو شاعروں اور ادیبوں کی اولاد جو انگلستان میں پیدا ہوئی ہے اسے یہ نہیں معلوم کہ "مکرر ارشاد" کس کو کہتے ہیں۔ اور "عرض کیا ہے" کا حربہ شاعر کب استعمال کرتا ہے۔ اب وقت ہی فیصلہ کرے گا کہ انگلستان کے اُردو شاعروں اور ادیبوں کی 'اولادِ حقیقی' ناخلف ہے یا ان کی 'اولادِ معنوی' ناخلف ہے۔

("سفرِ لخت لخت۔" ۱۹۸۴)

☆☆

کچھ ذکرِ خیر و شر ساقی فاروقی کا

لندن میں ہماری وہ پہلی شام تھی۔ دن بھر پکاڈلی سرکس کی رونق کا حصہ بننے، اُردو مرکز میں احمد فراز اور افتخار عارف کو اور ٹرافلگار اسکوائر کے کبوتروں کو سر آنکھوں پر بٹھانے، برطانوی پارلیمنٹ کے آگے کھڑے سرونسٹن چرچل کے مجسمے پر بیٹھے ہوئے کبوتروں کو اُڑانے، ویسٹ منسٹر ایبے میں کچھ دیر جھانکنے، ہاؤس آف کامنس کے پیچھے بہتے ہوئے دریائے ٹیمز میں جلتے ہوئے سگریٹوں کے دو ٹکڑے پھینکنے کے بعد جب ہم گھر پہنچے تو پتہ چلا کہ کئی دوستوں کے فون آئے تھے۔ تھکن اتنی تھی کہ کسی کو فون کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر نہ جانے کیوں ہم نے ساقی فاروقی کو فون ملا لیا۔ ساقی فاروقی اپنی پاٹ دار آواز کے ساتھ فون پر سنائی دیئے تو ہم نے کہا ''السلام علیکم''۔ علیک سلیک کے بعد پوچھا ''یہ کون سلام کر رہا ہے؟''

ہم نے کہا ''بوجھو تو جانیں۔''

تھوڑے سے وقفہ کے بعد فون پر اچانک ایک ناقابل سماعت و اشاعت گالی سنائی دی۔ پھر بولے ''ارے مجتبیٰ! تم بدمعاش! کب آئے؟ تمہاری تو...... آنے کی صحیح صحیح اطلاع تک نہ دی۔ سالے تم تو...... کہاں ٹھہرے ہو؟''

ہم نے کہا ''ہیمپسٹیڈ میں۔''

بولے ''ارے تم تو میرے گھر سے بالکل قریب ہو۔ مگر تم جیسے لفنگے کو ہیمپسٹیڈ جیسے شریفوں کے محلّہ میں کس نے ٹھہرایا...... تم تو...... واقعی...... اور ہاں...... وہ تو......''

ہم نے کہا ''یار ساقی! فون انگریز کا ہے۔ اُردو کی گالیاں اور وہ بھی تمہارے منہ سے

سننے کا متحمل نہ ہو سکے گا۔''

بولے'' اچھا تو یہ بات ہے۔فون پر گالیاں سننا نہیں چاہتے۔میں اور گنڈی ابھی تمہارے پاس آ رہے ہیں۔گالیاں سننے کے لئے تیار رہو۔تمہاری تو......''

پچھلے آٹھ برسوں میں ساقی فاروقی جب جب دہلی آئے ہیں ان سے ملاقاتیں ہوئی ہیں۔دو سال پہلے وہ اپنی جرمن بیوی گنڈی کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔(مسز ساقی فاروقی کا نام ہی کچھ ایسا ہے کہ ہم 'گنڈی' پکارنے جاتے ہیں تو منہ سے 'غنڈی' ادا ہو جاتا ہے) مسز گنڈی نہایت خلیق، ملنسار اور خوش طبع خاتون ہیں (جرمن خواتین بہت کم ایسی ہوتی ہیں۔یوں بھی ہم دو تین جرمن خواتین کو ہی جانتے ہیں۔)

دہلی کی ایک ادبی محفل میں جب ساقی فاروقی کے اُردو کلام پر داد کا بے پناہ شور بلند ہو رہا تھا تو ایسے میں مسز گنڈی نے بڑی حیرت کے ساتھ ہم سے انگریزی میں کہا تھا'' مجھے معلوم نہیں تھا کہ ساقی اتنے بڑے شاعر ہیں۔''

اور ہم نے کہا تھا'' آپ کے اُردو نہ جاننے کا یہی فائدہ تو ساقی فاروقی کو پہنچ رہا ہے۔''

ہم ساقی فاروقی کی دوستی اور شاعری دونوں کے قائل ہیں۔چونکہ ہمارے بڑے بھائی ابراہیم جلیس مرحوم کے قریبی دوست رہے ہیں اسی لیے ان کی گالیاں بھی مزید ارلگتی ہیں۔ ن۔م۔راشد کے رفیق خاص رہے ہیں بلکہ ان کی نزاعی آخری رسومات کے واحد عینی شاہد بھی یہی ہیں۔ساقی کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ان کا کلام بلکہ مجموعہ کلام سننے میں جو لطف آتا ہے اسے بیان کرنے کی مہارت اور طہارت ہم میں کہاں؟۔بقول ان کے گلے میں خضاب لگا کر کلام پڑھتے ہیں۔جب شعر پڑھتے ہیں تو شعر ان کے روم روم سے ادا ہونے لگتا ہے۔ایسے خوش طبع اور شگفتہ مزاج کہ جس محفل میں بیٹھیں لوگوں کو ہنسا ہنسا کر رُلا دیں۔کُھلے دل، کُھلے دماغ، کُھلے ہاتھ کُھلے گریباں اور کُھلے منہ (منہ کچھ زیادہ ہی کُھلا ہوا ہے) کے آدمی ہیں۔ہمارے پسندیدہ شعراء کو وہ سخت ناپسند کرتے ہیں۔ہمارے محبوب افسانہ نگاروں کے ذکر پر ناک بھوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ چڑھاتے ہیں بشمول قمیض کی آستینوں کے۔لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں وہ ہمیں اتنے اچھے لگتے ہیں۔ابھی ساقی کی باتیں یاد کر ہی رہے تھے کہ سیاہ پتلون اور سیاہ قمیض میں ملبوس، گلے میں سیاہ منکوں کی لمبی مالا ڈالے ساقی فاروقی، گنڈی کے ہمراہ ڈرائینگ روم

میں بھونچال کی طرح داخل ہوئے۔ پہلے ایک عدد گالی دی اور بے ساختہ ہم سے لپٹ گئے۔ جب ہم بیگم فاروقی سے ہاتھ ملانے لگے تو بولے'' تم ہمارے خاص دوست ہو۔ تم گنڈی کو پیار کرو گے۔ ہاتھ نہیں ملاؤ گے۔'' پھر گنڈی سے کہا'' مجتبیٰ! ہمارا یار ہے۔ تم اسے کِس کرو گی۔''

جب ہم مغربی آداب کے مطابق گنڈی کو پیار کرنے کے لئے آگے بڑھے تو گنڈی کے جس گال پر ہم پیار کرنے والے تھے اُس جانب دوڑ کر آتے ہوئے ساقی نے کہا'' ذرا دیکھوں تو تم کس طرح گنڈی کو پیار کرتے ہو۔'' پھر ایک فلک شگاف قہقہہ مار کر بولے'' ابھی کچھ عرصہ پہلے وہ سالا...... (ایک مشہور پاکستانی نقاد) آیا تھا۔ وہ بھی ہمارا خاص یار ہے۔ ہم نے اس سے گنڈی کو پیار کرنے کے لئے کہا تو ہمیں یاد ہی نہیں رہا کہ وہ تین چار زردوں اور ایک خطرناک بو والے قوام کا پان کھاتا ہے۔ پھر اس ...... نے گنڈی کے گال پر پیار کرنے کی بجائے گنڈی کے ہونٹوں پر زردے اور قوام کا لیپ لگا دیا۔ سالے اردو کے شاعر ادیب اور نقاد کو پیار کرنا تو آتا ہی نہیں۔ ان کی تو......'' ساقی نے پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر بولے'' تم نے پیار کرنے کے مغربی آداب کہاں سے سیکھ لیے۔ تمہارے اُردو ادیب ہونے پر شبہ ہو رہا ہے۔''

ساقی کی باتوں نے لندن کی ہماری اس پہلی شام کو قہقہوں سے اس طرح آراستہ کر دیا تھا کہ رات کے ایک بجنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ ساقی نے ان دنوں کا ذکر چھیڑا جب لندن میں اتنے پاکستانی اور ہندوستانی آباد نہیں تھے۔ اُن دنوں ساوتھال بھی ویران تھا۔ کھانے پینے کی ہندوستانی چیزیں بھی نہیں ملتی تھیں۔ مشہور شاعرہ سحاب قزلباش کے حوالے سے کہنے لگے۔'' ایک دن میں سحاب قزلباش کے گھر گیا تو دیکھا کہ وہ ایک اسٹول پر چڑھی ہوئیں ایک اونچی میز پر اپنے دونوں ہاتھ آگے اور پیچھے کو ہلا رہی ہیں۔ قریب جا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ چغتائی کے مصور دیوانِ غالب پر کوکا کولا کی بوتل کی مدد سے پراٹھے بیل رہی ہیں۔ ان پراٹھوں کو کھانے کے بعد ہی غالب کا کلام میری سمجھ میں آسکا۔ لوگ کھانے پکا کر ان کا کئی کئی دن کا اسٹاک ڈیپ فریز میں محفوظ رکھتے تھے۔ سحاب قزلباش نے پراٹھے بنانے کے بعد اپنا ڈیپ فریز کھولا اور مجھ سے پوچھا'' بتاؤ کیا کھاؤ گے؟'' اب جو میں نے ڈیپ فریز میں جھانکا تو دیکھا کہ اس میں انواع واقسام کے کھانے محفوظ ہیں۔ سالن اور کھانے کی ہر شے کے برتن پر اس کا نام، اس کے پکائے جانے کی تاریخ اور سن اشاعت درج تھی۔ میں کچھ دیر تک تو کھانوں، ان کی تاریخوں اور سنین کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر

بولا'' میں تو ۱۹۶۰ء کا قیمہ کھاؤں گا۔'' اس کے جواب میں سحاب قزلباش نے کہا'' تم نے دیر کردی۔ ۱۹۶۰ء کا قیمہ کل ہی ایک صاحب کھا گئے۔ تم چاہو تو تمہیں ۱۹۵۸ء کے کوفتے کھلا سکتی ہوں۔''

ساقی فاروقی کی صحبت ایسی ہی باتوں اور ایسے ہی لطیفوں سے بجی سجائی رہتی ہے۔ چونکہ ہمارے دل اور لندن میں ہمارے گھر سے قریب رہتے تھے اسی لیے ان سے تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی تھی اور ہم ان کے لطیفوں کے علاوہ ان کے کلام بلاغت نظام اور بلوغت نظام دونوں سے فیض یاب ہوتے تھے۔ ساقی جب اُردو میں بڑی روانی اور سلاست کے ساتھ گالیاں دینے لگتے تو گنڈی ہم سے پوچھا کرتی تھیں کہ ساقی اُردو میں کیا کہہ رہے ہیں؟۔ اس پر ساقی قہقہہ لگا کر ہم سے کہتے تھے۔'' مجتبیٰ! اُردو کی گالیوں میں اتنی تجرید ہوتی ہے اور ایسی انفرادیت ہوتی ہے کہ تم تو تم اگر مولوی عبدالحق بھی ہوتے تو ان کا انگریزی میں ترجمہ نہ کر پاتے۔''

ساقی کے ساتھ کئی محفلیں سجیں۔ ایک دن کہنے لگے'' یہ کیا تم لندن کے تاریخی مقامات کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ میرے ساتھ چلو۔ تمہیں ادبی لندن دکھاؤں۔ کیٹس کا گھر تمہارے گھر سے قریب ہے مگر تم اب تک وہاں نہیں گئے۔'' سو ایک دن ہم ساقی فاروقی کے ساتھ ادبی لندن کو دیکھنے دو موٹروں میں نکلے۔ ساقی کی موٹر میں مغنی تبسم، حمایت اللہ اور ہم تھے۔ دوسری موٹر مشہور افسانہ نگار محسن شمسی کی تھی جن کا قہقہہ ان کی موٹر کے ہارن سے زیادہ بلند اور پر شور ہوتا ہے۔ اس میں نقی تنویر سوار ہو گئے۔ ہم سب سے پہلے کیٹس کے گھر کی طرف چلے تو ہیمپسٹیڈ ہیتھ سے گذرے۔ ہیمپسٹیڈ کا یہ جنگل اتنا خوبصورت ہے کہ اس کے برابر سے گذرتے ہوئے ہم نے بھی اپنے اندر شاعری کو کروٹ لیتے، مچلتے اور مہکتے ہوئے محسوس کیا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں پورے پونے دو سو برس پہلے انگریزی کا مشہور شاعر کیٹس رہتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری چار پانچ برس اسی جنگل کے گرد و نواح میں گذارے تھے۔ بچپن میں پڑھی ہوئی کیٹس کی نظمیں ہم یاد کر ہی رہے تھے کہ ساقی نے ایک جگہ اپنی موٹر کو روکتے ہوئے کہا'' پاکستان کے ایک مشہور اُردو محقق کو ہیمپسٹیڈ ہیتھ کی سیر کرانے کے لئے میں یہاں لے آیا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں ان سے کہا یہ جو گھنے درخت آپ دیکھ رہے ہیں ان ہی میں کسی درخت سے وہ بلبل اڑا ہو گا جسے دیکھ کر کیٹس نے اپنی مشہور نظم 'Ode to a nightingale' لکھی تھی۔ جانتے ہو اُردو کے محقق نے کیا کہا مجھ سے فوراً

پوچھا 'بتاؤ کون سے درخت سے بلبل اڑا تھا۔ کون سے درخت سے؟ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں،
اس پر میں نے اسے نہ صرف وہ درخت دکھا دیا تھا بلکہ وہ بلبل بھی دکھا دیا جسے دیکھ کر کیٹس نے اپنی
شہرہ آفاق نظم لکھی تھی۔ سالے اُردو کے محقق کہیں کے۔'' ابھی قہقہوں کا زور نہیں تھما تھا کہ ہم کٹیس
کے گھر پر موجود تھے۔ سیدھا سادہ سا دومنزلہ مکان ہے۔ اسی مکان میں کیٹس نے اپنی زندگی کی
بہترین نظمیں لکھیں۔ اسی گھر سے متصل اسی طرح کا ایک اور گھر بھی ہے جس میں کیٹس کی محبوبہ
فینی بران رہتی تھی۔ ان کی شادی ہونے ہی والی تھی کہ ۱۸۲۱ء میں کٹیس کا نوجوانی میں انتقال
ہوگیا۔ کیٹس، نے اسی گھر کے سامنے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر 'Ode to a nightingale' لکھی
تھی۔ ہم نے بھی کچھ دیر اس پیڑ کے نیچے بیٹھ کر کیٹس کو خراج عقیدت پیش کیا۔ کیٹس کے بیٹھنے
کے کمرہ کو جوں کا توں محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس کی کتابیں، اس کے خطوط قرینے سے رکھے ہوئے
ہیں۔ ہر کمرہ میں کیٹس کے کٹے ہوئے بال بھی رکھے ہوئے ہیں۔ حمایت اللہ نے مختلف کمروں
میں رکھے ہوئے کیٹس کے بالوں کا بغور جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ یہ بال کیٹس
کے نہیں ہیں کیونکہ ایک کمرہ میں رکھے ہوئے بالوں کا رنگ دوسرے کمرہ میں رکھے ہوئے بالوں
سے مختلف ہے۔ ہم نے کہا'' ہوسکتا ہے بچپن میں کیٹس کے بالوں کا رنگ مختلف ہو اور نوجوانی میں
ان کا رنگ بدل گیا ہو۔'' حمایت اللہ بار بار اپنی چندیا پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے اور کہتے تھے نہیں
یہ بال کیٹس کے نہیں ہیں۔ جتنا ہم انھیں کیٹس کی شاعری کی طرف لانا چاہتے تھے اتنا ہی وہ کیٹس
کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوتے جاتے تھے۔

پھر ساقی ہمیں اسی علاقہ میں ویل آف ہیلتھ لے گئے۔ جہاں ۱۹۱۲ء میں رابندر ناتھ
ٹیگور نے قیام کیا تھا۔ یہیں پاس میں ایک مکان بھی نظر آیا جس میں ۱۹۱۵ء میں ڈی۔ ایچ۔ لارنس
مقیم ہوئے تھے۔ ان مکانوں پر ان ادبی شخصیتوں کے نام اور اُن کے قیام کا زمانہ لکھا ہوا ہے۔

پھر ساقی ہمیں ہیمپسٹیڈ سے قریب ہی ایک پب PUB میں لے گئے جس کے بارے
میں بتایا کہ چارلس ڈِکنس کا پسندیدہ پب PUB تھا۔ وہ اکثر یہاں بیٹھا کرتا تھا۔

ہم نے کہا'' ساقی! ہمیں لندن آئے ہوئے پندرہ دن ہوگئے۔ ہمیں آج تک کوئی ایسا
پب نہیں ملا جس میں ہم بیٹھ سکیں۔ ہر پب کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس میں تو فلاں ادیب
بیٹھا کرتا تھا۔ چارلس ڈِکنس نے تو پبوں میں بیٹھنے کی انتہا کر دی۔ جس کسی پب میں جاؤ، پتہ چلتا

ہے کہ یہاں چارلس ڈِکنس صاحب بیٹھ چکے ہیں۔ سلون اسکوائر میں برنارڈ شا کا پب بھی دیکھا۔ سارے پب کو برنارڈ شا کی تصویروں کے ذریعے ڈراونا بنادیا گیا ہے۔ ہم تو تھوڑی دیر بھی وہاں نہ بیٹھ سکے۔ وہاں سے اٹھ کر مارلبرو آرمس کے پب میں گئے تو پتہ چلا کہ وہاں چارلس ڈکنس کے علاوہ ورجینا وولف اور کارل مارکس وغیرہ بھی بیٹھا کرتے تھے۔

ساقی نے کہا'' اب تم تھک گئے ہو کچھ دیر چارلس ڈِکنس کے پب میں بیٹھو۔ اداس نہ ہونا۔ ہم تمہارے لئے ایک الگ پب بنا دیں گے۔''

چارلس ڈِکنس کے پب سے نکل کر ہم کین وڈ گارڈنس میں گئے۔ بڑی پرفضا جگہ ہے۔ ایک خوبصورت جھیل بھی اس باغ میں ہے جس کے کنارے گرمیوں کے موسم میں موسیقی کی بڑی محفلیں آراستہ کی جاتی ہیں۔ باغ کے ایک گوشہ میں ڈاکٹر جانسن (ڈکشنری والے) کا Summer House 'گرمائی گھر' بھی موجود ہے۔ بالکل واہیات سی جگہ ہے۔ لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ دور سے جھونپڑی کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ قریب جا کے دیکھا تو یہ اتنا چھوٹا نظر آیا کہ ڈاکٹر جانسن کی ڈکشنریوں کے اگر سو نسخے اس میں رکھ دیئے جائیں تو ڈاکٹر جانسن کو اندر داخل ہونے کی جگہ نہ ملے۔ باسویل بھی ڈاکٹر جانسن سے ملنے اس 'گرمائی گھر' میں آتا ہوگا تو باہر ہی سے بات کر کے چلا جاتا ہوگا۔ ہوسکتا ہے اس زمانے میں ڈکشنری مرتب کرنے کے لئے ایسے ہی گھر میں رہنا ضروری ہوتا ہو۔ ہم ڈاکٹر جانسن کے گھر سے مایوس ہوئے تو ساقی نے کہا'' فکر نہ کرو، اب میں تمہیں لندن کے ایک مشہور شاعر کے گھر لے چلتا ہوں''۔ اور کچھ دیر بعد ہم ساقی فاروقی کے گھر میں تھے۔ ساقی کہنے لگے'' یہاں اُردو کا ایک مشہور شاعر رہتا تھا ساقی فاروقی۔ کئی سو برس پہلے پاکستان سے لندن آیا تھا۔ اس نے یہیں 'پیاس کا صحرا' لکھا۔ یہیں اس نے 'رادار' اور 'رازوں سے بھرا بستہ' لکھا۔'' حمایت اللہ نے بات کو کاٹتے ہوئے اور اپنی چندیا پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''ہمیں پہلے ساقی فاروقی کے کٹے ہوئے بال دکھایئے جو ضرور کسی ڈبیا میں محفوظ رکھے گئے ہوں گے۔''

اس پر ہم نے کہا'' بالوں کو ماریئے گولی۔ ہم نے سنا ہے کہ ساقی فاروقی نے نہ صرف اپنی شاعری میں بلکہ اپنے گھر میں بھی کتے، بلّیاں، کچھوے، مینڈک اور طوطے پال رکھے ہیں۔ ان کا بہت شہرہ سن رکھا ہے۔ ان کی بھی کچھ نشانیاں دکھاؤ''

ساقی نے ایک لمبی آہ بھر کر کہا" یار مجتبیٰ! یہ تم نے کیا یاد دلا دیا۔ میں نے جتنے پالتو جانور اور پرندے پال رکھے تھے وہ سب مر کھپ گئے۔ طوطے کو بلّی نے کھالیا، کچھوے کو کتا کھا گیا، پھر کتا طبعی موت مر گیا۔" پھر ایک بلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے" ساری بلّیاں مر گئیں۔ اب یہ ایک بلّی رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے۔"

ڈاکٹر مغنی تبسم کو ساقی کی بلّی کی تنہائی پر رحم آ گیا تو وہ سیٹی بجاتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگنے لگے اور ہم نے مغنی تبسم کو سمجھایا" مغنی صاحب! یہ انگریز بلّی ہے۔ آپ اُردو میں سیٹی بجائیں گے تو اس کی سمجھ میں کیا خاک آئے گا۔"

ساقی بدستور اپنے مرحوم کچھوے کی یاد میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ بولے" میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے۔ اب میں اس گھر کے آگے ایک تختی لگاؤں گا جس پر لکھا ہوگا، یہی وہ گھر ہے جس میں فلاں سنہ میں ایک کچھوا رہتا تھا۔ نام تھا اس کا............"

اور ہم نے کہا" اور انگریز سچ مچ اس مکان کو دیکھنے دور دور سے آیا کریں گے"
اس پر ساقی نے ایک اور زوردار قہقہہ لگایا۔

(" سفرِ لخت لخت۔" ۱۹۸۴)

کچھ نقی تنویر کے بارے میں

تیس سال پہلے میں اور نقی تنویر چادر گھاٹ پل سے قریب موسیٰ ندی کے کنارے ایک ریستوران میں بیٹھا کرتے تھے اور تین دن پہلے میں اور نقی تنویر ویسٹ منسٹر سے قریب دریائے ٹیمز کے کنارے ایک جہازی ریستوران میں بیٹھے لندن کی جگمگاتی روشنیوں سے پرے کچھ دیکھنے، کچھ سمجھنے، کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان تیس برسوں میں ویسٹ منسٹر کے پل کے نیچے دریائے ٹیمز میں نہ جانے کتنا پانی بہہ گیا۔ انگریزی محاورے سے کچھ زیادہ ہی بہہ گیا ہوگا۔ اور ادھر موسیٰ ندی چونکہ انگریزی نہیں جانتی اس لیے بہتی کم ہے اور بہنے کی اداکاری زیادہ کرتی ہے۔ چادر گھاٹ کے پل کے نیچے موسیٰ ندی نہ جانے کب سے رُکی کھڑی ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔

ٹھہرا ہوا دریا ہوں بڑی دیر سے چُپ ہوں

میں نے اس ٹھہرے ہوئے دریا کی سطح پر یادوں کی کنکری پھینکتے ہوئے کہا۔ ''یار نقی! کتنی عجیب بات ہے۔ تیس برس پہلے جب ہم چادر گھاٹ پل کے اُس ریستوران میں بیٹھا کرتے تھے تو یہ سوچا بھی نہ تھا کہ ایک دن ہم ہزاروں میل دور دریائے ٹیمز کے کنارے اپنی پیٹھوں پر تیس برس کے بیتے ہوئے وقت کی گٹھری لادے آن بیٹھیں گے تاکہ تم اپنے وقت کا حساب بتاؤ اور میں اپنے وقت کا حساب بتاؤں، پھر ہم دونوں مل کر دنیا کو بتائیں۔

دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

اس شام نقی خاموش سا رہا کیونکہ یہ اس کی پُرانی عادت ہے۔ میں اسے پچھلے تیس برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ بھی موسیٰ ندی کی طرح ٹھہرا ہوا دریا ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ اس
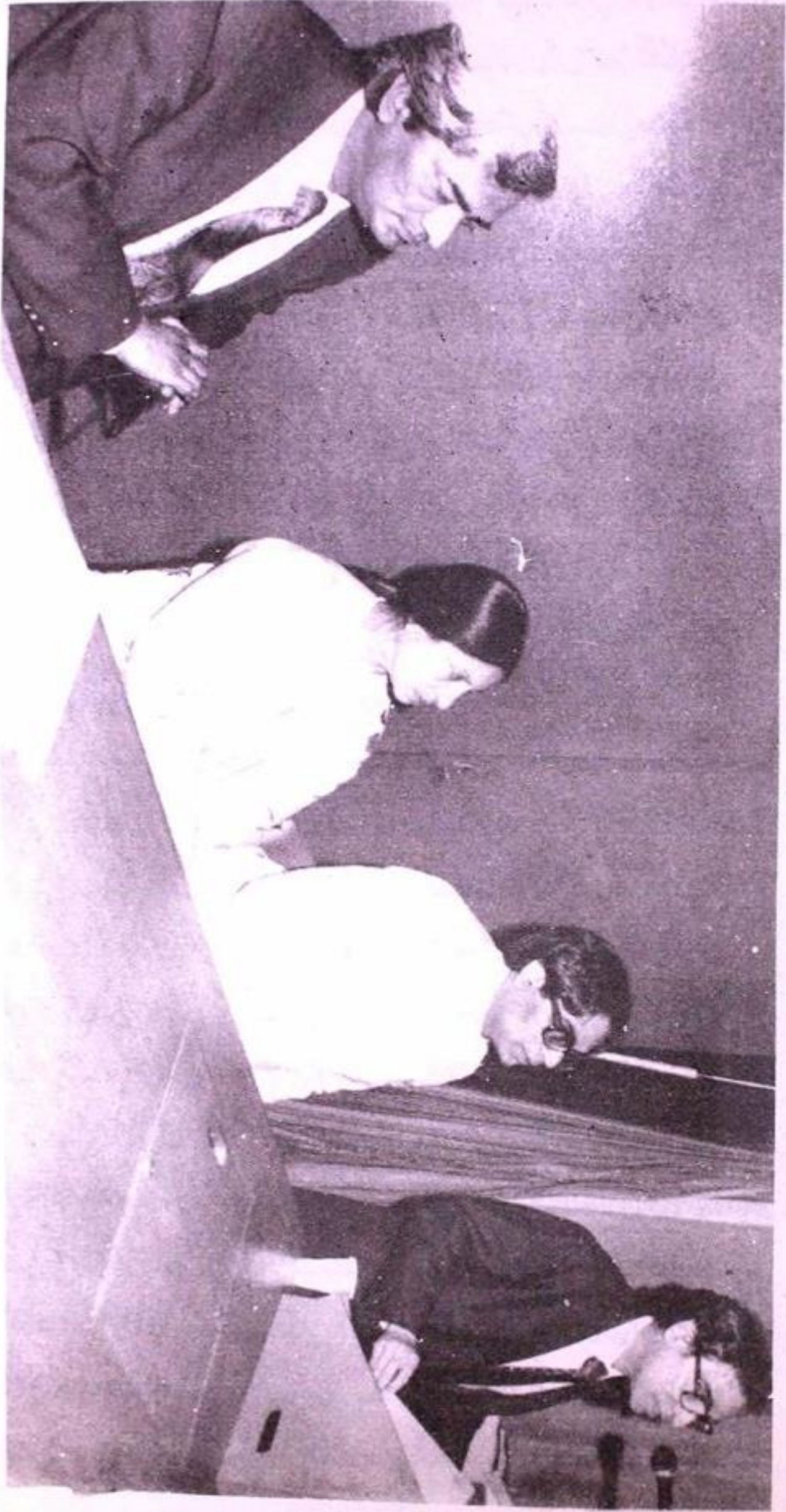
لندن کے مشہور افسانہ نگار نقی تنویر، مجتبیٰ حسین کی شخصیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے۔ تصویر میں افتخار عارف، صدیقہ شبنم اور مجتبیٰ حسین بھی دیکھے جا سکتے ہیں

کی جھولی میں زندگی کے تجربات مجھ سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔

میں نے کہا "یار نقی! دیکھو تو ویسٹ منسٹر کے اس پل سے لندن کس طرح جگمگاتا نظر آرہا ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے تیس برس پہلے کی موسی ندی اپنے حافظہ میں ٹیمز سے زیادہ بڑی نظر آتی ہے۔ حیدرآباد لندن سے بڑا شہر دکھائی دیتا ہے۔ اُس کی روشنیاں جن کا اصل میں کوئی وجود ہی نہیں تھا، لندن کی روشنیوں سے زیادہ روشن نظر آتی ہیں۔ حافظہ میں یہ ساری گڑبڑ نہ جانے کس طرح ہو رہی ہے۔ اصل میں نوجوانی چیز ہی ایسی ہوتی ہے۔ ہم اپنی نوجوانی کے پھیلے ہوئے پاٹ کو موسیٰ ندی کے پاٹ سے جوڑ دیتے تھے۔ اپنے دلوں میں جھلمل جھلمل کرنے والی روشنیوں کو موسیٰ ندی کے کنارے پر سجا دیتے تھے۔ روشنی ہمارے اندر تھی شہر میں نہیں۔ وسعت شہر میں نہیں ہمارے وجود میں تھی۔ میری اس بات پر نقی پھر بھی خاموش رہا کیونکہ پچھلے بائیس برسوں میں اس نے ٹیمز کے ساتھ گزارا کرنے کی عادت ڈال لی ہے۔ وہ دو دریاؤں کے بیچ اب ایک خاموش جزیرہ بن گیا ہے۔

مجھے اس وقت ایک لطیفہ یاد آرہا ہے کہ ایک خاتون اپنے بچوں کو اپنے البم سے پرانی تصویریں دکھا رہی تھیں۔ ایک مرحلہ پر انھوں نے ایک خوبرو اور وجیہہ وشکیل نوجوان کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "انھیں دیکھو یہ تمہارے ڈیڈی ہیں"۔ اس پر سب سے چھوٹے بیٹے نے بڑے غور سے اس تصویر کو دیکھا اور بولا "ممی! اگر یہ ہمارے ڈیڈی ہیں تو پھر وہ گنجا اور کھوسٹ کون ہے جو ہر دم گھر میں کھانستا رہتا ہے اور جسے ہم لوگ ان دنوں ڈیڈی کہتے ہیں۔"

تو صاحبو! آج میں اسی نقی تنویر کا حال بیان کرنے چلا ہوں جو آج سے تیس برس پہلے مجھے ملا تھا۔ دھان پان تو خیر وہ آج بھی ہے مگر ان دنوں کچھ زیادہ ہی دھان پان تھا۔ جون ۱۹۵۳ء میں جب میں گلبرگہ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کر کے عثمانیہ یونیورسٹی کے آرٹس کالج میں داخلہ حاصل کرنے کی غرض سے حیدرآباد آیا تو دو چار دنوں میں ہی نقی سے ملاقات ہوگئی۔ وہ مجھ سے ایک سال سینئر تھا اور ابتداء ہی سے حیدرآباد میں مقیم تھا۔ ان دنوں جو طلباء اضلاع سے حیدرآباد آتے تھے ان کا سینئر طلبا اکثر مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ ابتداء میں نقی مجھے بھی Rural Talent سمجھا کرتا تھا مگر بہت جلد ہم دونوں نے مل کر دو چار ایسے Rural Talents کو تلاش کر لیا جن کے سہارے یونیورسٹی کے دن نہ جانے کس طرح بیت گئے۔ ان دنوں عثمانیہ یونیورسٹی اُردو ماحول میں کمر کمر ڈوبی ہوئی تھی۔ ہر دوسرا طالب علم شعر کہتا تھا اور چوتھا طالب علم افسانے لکھا کرتا تھا۔ اس

اعتبار سے نقی تنویر چوتھا طالب علم تھا یعنی افسانے لکھا کرتا تھا۔ بلکہ انھیں دنوں عالمی امن کے موضوع پر اُس کے ایک افسانے کو بین الاقوامی انعام بھی ملا تھا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے ادبی محفلوں میں ہوٹنگ کے ذریعہ ادب سے اپنا رشتہ بنائے رکھا تھا۔

گلبرگہ کے زمانہ طالب علمی سے ہی میں آل حیدر آباد اسٹوڈینٹس یونین کی سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتا تھا، جو بائیں بازو کے خیالات کے حامل طلباء کی انجمن تھی۔ نقی سے ملا تو پتہ چلا کہ وہ نہ صرف اس انجمن کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہے بلکہ بہت سی ان طالبات کی زلف ہائے گرہ گیر کا اسیر ہے جن کا میں بھی اپنے آپ کو اسیر سمجھتا تھا۔ بعد میں 'زلفوں' کے معاملے میں ہم نے پرامن بقائے باہم کا معاہدہ کر لیا تھا اور کبھی ہم دونوں کے درمیان اس معاملہ میں تصادم کی نوبت نہیں آئی۔ آل حیدر آباد اسٹوڈینٹس یونین کی سرگرمیوں میں ہی ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے تھے۔ نقی یونین کے کاموں میں بہت سنجیدگی سے حصہ لیتا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کے دفتر بھی اس کا آنا جانا بہت ہوتا تھا۔ ہڑتال ہو یا بھوک ہڑتال، مظاہرے ہوں یا مباحثے، نقی سب میں پیش پیش رہتا تھا۔ ہمارے ایک دوست تھے اسد۔ اب اللہ کو پیارے ہوگئے۔ خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آل حیدر آباد اسٹوڈینٹس یونین کے جنرل سکریٹری تھے۔ ہمیشہ پیلے رنگ کا بش شرٹ پہنا کرتے تھے۔ مرحوم کا سارا وقت نعرے لگانے میں گذرتا تھا۔ اس کے گھر والوں کا کہنا تھا کہ موصوف نیند میں بھی انقلابی نعرے لگاتے تھے۔ جس کسی کالج کے سامنے یہ پیلا بش شرٹ نظر آتا تھا طلباء خود بخود کلاسوں سے غائب ہو جاتے تھے کہ "چلو پیلا بش شرٹ آ گیا ہے۔ کالج کی چھٹی"۔

نقی جتنا سنجیدہ نظر آتا تھا اندر سے اتنا ہی شریر اور چلبلا تھا۔ یہ صفت تو اس میں آج بھی ہے۔ نقی اگرچہ افسانے لکھتا تھا مگر کبھی کسی کو سناتا نہیں تھا۔ میں نے تو کالج سے نکلنے کے کئی برس بعد لکھنا شروع کیا۔ لہٰذا نقی نے بڑی ہوشیاری سے کالج کے دو چار ایسے افسانہ نگاروں اور شاعروں کو ڈھونڈ نکالا تھا جنھیں اپنی تخلیقات سنانے کا جنون تھا۔ نقی ان کے جنون کی قیمت وصول کرنا خوب جانتا تھا۔

میں اس افسانہ نگار کا نام نہیں لوں گا۔ اب بھی ہندوستان میں حیات ہیں اور افسانے لکھ رہے ہیں۔ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ دو برسوں تک ہماری ہوٹلنگ کا سارا خرچ افسانہ نگار

موصوف ہی برداشت کرتے تھے۔ دبیر پورہ میں ایک خاص ہوٹل تھا جہاں افسانہ نگار موصوف ہر شام افسانہ بہ دست آتے اور اور ہم دونوں فاقہ بہ شکم وہاں پہنچتے۔ افسانہ سنانے سے پہلے نقی افسانہ نگار سے پوچھ لیتا تھا کہ افسانے کے انجام پر ہیروئن زندہ رہے گی یا مرجائے گی۔ افسانہ نگار ہیروئن کی متوقع وفات حسرت آیات کا مژدہ سناتا تو نقی کہتا۔ ''یار تمہارے افسانے میں ہیروئن اس قدر کرب سے مرتی ہے کہ بھوکے پیٹ اس کرب کو برداشت کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ پہلے کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ ہم میں صبر جمیل کا مادہ پیدا کرو۔ پھر ہیروئن کو شوق سے ہلاک کرنا۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

بیچارا افسانہ نگار کھانے پینے کی چیزیں منگاتا۔ وہ افسانہ سناتا تو ہم افسانہ کم سنتے تھے اور ہیروئن کے مرنے کا انتظار زیادہ کرتے تھے۔ وہ ہر روز ایک مہلک افسانہ لے کر آتا اور ہمیں نئی زندگی عطا کر جاتا۔ اس کی ہیروئن کی موت کے ساتھ ہم کچھ اور بھی زندہ ہو جاتے تھے۔ یوں بھی ہمیں افسانہ سننے میں کچھ زیادہ زحمت نہیں اٹھانی پڑتی تھی کیونکہ ہمارے افسانہ نگار دوست لفظوں

مجتبیٰ حسین لندن میں اپنے خیر مقدمی جلسے میں مضمون سناتے ہوئے،
ساتھ میں عباس زیدی اور بیرسٹر یزدانی بھی دیکھے جاسکتے ہیں.

کی مدد سے نہیں بلکہ ڈیشوں Dashes کی مدد سے افسانہ لکھتے تھے جیسا کہ اس زمانے میں افسانہ

لکھنے کا رواج تھا۔ وہ افسانہ سناتے اور نقی سنتے سنتے بیچ میں ڈیش Dash لگا تا جاتا تھا۔ کبھی کبھی میں نقی کا ہاتھ بٹانے کے لئے افسانہ نگار موصوف کے افسانے میں ڈیش Dash لگانے کی کوشش کرتا تو افسانہ نگار موصوف مجھے ٹوک دیتے تھے کہ ''یار! تم ہمیشہ غلط جگہ ڈیش لگاتے ہو۔ تم افسانہ سنو۔ نقی ڈیش لگاتا رہے گا۔''

ڈیڑھ دو برس بعد افسانہ نگار نے جب محسوس کیا کہ افسانہ میں ہیروئینوں کی ہلاکت اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے تو ایک دن وہ زندہ ہیروئن کا افسانہ لے کر آ گیا۔ بولا ''آج میں ایک زندہ ہیروئن کا افسانہ لے کر آیا ہوں۔''

نقی نے کہا ''یار! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ ہمیں تو اسے سیلبریٹ Celebrate کرنا چاہیے۔ اسی بات پر منگاو بریانی اور ڈبل کا میٹھا افسانہ سنانے سے پہلے۔'' اور افسانہ نگار کو نقی کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔

جب افسانہ نگار موصوف نے دیکھا کہ ہیروئن چاہے زندہ رہے یا مر جائے ان کی جیب پر کوئی خاص فرق نہیں پڑ رہا ہے تو اُنھوں نے ہماری اجازت کے بغیر ہیروئنوں کو ہلاک کرنا شروع کر دیا اور اب تک بڑے اہتمام سے ہلاک کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کے بعد نقی نے 'پاکٹ منی' کے طور پر ایک اور افسانہ نگار کو پھانس لیا تھا۔

افسانہ نگار اور شاعر ہم سے خائف رہنے لگے تو ہم دونوں اپنا پیشہ بدل کر معاملاتِ حسن وعشق کے خصوصی مشیر بن گئے۔ جو کوئی بھی عشق میں مبتلا ہوتا یا ہونا چاہتا تھا تو وہ ہم سے معاملاتِ دل کے اسرار و رموز جاننے کے لئے آتا۔ نقی کو شاید یاد ہوگا کہ اس نے کئی دوستوں کی جانب سے ان کی محبوباؤں کے نام محبت ناموں کے مسودے تیار کیے۔ دوستوں کی محبوباؤں کے جواب آتے تو وہ ان جوابات کی روشنی میں نئے نئے محبت نامے رقم کرتا تھا۔ ان میں سے کئی محبتیں کامیاب بھی ہوئیں اور اب خیر سے صاحب اولاد بھی ہیں۔ میں اس سلسلے میں ہمارے مشترکہ دوست رام چندر راؤ کلکرنی کی مثال دینا چاہوں گا کہ موصوف ایسے نکمے واقع ہوئے تھے کہ محبت کرنے کے لئے کسی مناسب لڑکی کا انتخاب تک نہ کر سکتے تھے۔ ہم لوگ ہر روز ٹرین سے یونیورسٹی جایا کرتے تھے۔ ایک دن کلکرنی نے کہا۔ ''یار! تم لوگ الگ الگ محبت کرتے ہو، میرا کوئی خیال نہیں کرتے۔ آخر میں بھی تو محبت کرنا چاہتا ہوں۔'' نقی نے کہا ''تم پہلے کسی لڑکی کا انتخاب کرو۔ پھر ہم تمہاری

محبت کے لئے زور لگاتے ہیں۔'' بولا'' یہی تو نہیں کر سکتا۔ یہ کام بھی تم دونوں کو کرنا ہوگا۔ آخر دوست کس کام آئیں گے۔'' دو دن بعد میں نے اور نقی نے اس کے لئے ایک لڑکی کا انتخاب کیا جو اسی ٹرین سے سکندر آباد جایا کرتی تھی۔ کلکرنی نے لڑکی کو دیکھا تو بولا۔'' یہ تو بہت خوبصورت ہے مجھ سے کیونکر محبت کرے گی؟۔'' ہم نے کہا'' تم ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہو۔ انشاء اللہ گوہر مقصود مل جائے گا۔''

اس کے بعد ہر شام کلکرنی کو محبت کا درس دیا جانے لگا جسے وہ دوسرے دن صبح تک بھول جاتا تھا۔ وہ ہم سے سیکھ کر تو بہت کچھ جاتا تھا مگر اس بتِ ناز کے سامنے پہنچتا تو حرفِ مدعا اس کی زبان پر نہ آتا تھا۔ جب وہ ہماری تربیت پر عمل کرنے سے قاصر رہنے لگا تو نقی نے ایک دن اسے دھمکی دی کہ'' اگر تم اس لڑکی کے سامنے اظہار محبت نہیں کر سکتے تو پھر اس لڑکی سے دست بردار ہو جاؤ تاکہ ہم اس سے محبت کریں۔ بلا وجہ ایک خوبصورت لڑکی کو ضائع کرنے کا کیا فائدہ''۔ کلکرنی پر اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ طے پایا کہ کلکرنی کی طرف سے ایک محبت نامہ اس لڑکی کے نام تیار کیا جائے جسے وہ دوسرے دن اس لڑکی کو تھما دے گا۔ نقی نے محبت نامے کا ایک زوردار مسودہ تیار کیا جس میں کلکرنی نے اپنی بزدلی کے مطابق کچھ ترمیم کرنی چاہی مگر نقی راضی نہ ہوا۔ کلکرنی سے کہا گیا کہ وہ اس مسودہ کو فیر یعنی صاف کر کے لے آئے۔ مسودہ فیر ہو کر آیا تو دیکھا کہ اس میں جا بجا املا کی غلطیاں ہیں۔ نقی نے اسے ڈانٹا کہ تم محبت نامہ کو صحیح طور پر نقل تک نہیں کر سکتے۔ محبت کیا خاک کرو گے۔ بالآخر نقی کی ہینڈ رائیٹنگ میں محبت نامہ تیار ہوا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ کلکرنی اس محبت نامہ کو اس لڑکی کے حوالے کرنے کے بعد چلتی ٹرین سے کود گیا تھا۔ لڑکی کو یا تو کلکرنی بھا گیا یا اس کی یہ ادا بھا گئی کہ یہ سلسلہ یہاں سے جو آگے بڑھا تو وہ ڈرپوک اور بزدل کلکرنی جس کی زبان اظہار محبت کرتے ہوئے لڑکھڑا جاتی تھی، ایک دن اتنا نڈر بن گیا کہ اس لڑکی کو اپنے ساتھ بھگا لے گیا۔ کلکرنی برہمن تھا اور وہ لڑکی اچھوت۔ کلکرنی اور اس لڑکی کے ارکان خاندان ہمارے پیچھے پڑ گئے کہ بتاؤ یہ دونوں کہاں ہیں۔ ہم دونوں کو پتہ تھا کہ کلکرنی کہاں ہے مگر نہ تو نقی نے اتا پتہ بتایا اور نہ ہی میں نے۔ بعد میں کلکرنی نے جس کی بزدلی کا دور دور تک شہرہ تھا اپنی بیوی کے لیے سماج سے وہ جنگ کی کہ ہم سب دیکھتے رہ گئے۔ اگر نقی نے مذاق مذاق میں اسے نڈر نہ بنایا ہوتا تو وہ آج اتنی خوش حال زندگی کیوں کر گزارتا۔ کلکرنی اور مسز کلکرنی اب بھی کبھی ملتے

ہیں تو نقی کو ضرور یاد کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ نقی کے تحریر کردہ محبت ناموں نے کئی زندگیاں سنواریں مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ نقی کے بعض محبت نامے خود اس کے کام نہ آ سکے۔

سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے۔

کالج سے نکلنے کے بعد ہم لوگ اپنے اپنے راستوں پر چل پڑے۔ مگر حیدرآباد کا 'اورینٹ ہوٹل' وہ جگہ تھی جہاں ہم لوگ ہر شام ملا کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی کا صحیح ادراک ہمیں اسی ہوٹل میں حاصل ہوا اور یہیں ہم نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ہوٹل کیا تھا ایک ایسا گھاٹ تھا، جس پر ادیب، شاعر، مصور، سیاست داں، فلسفی سب ایک ساتھ چائے پیتے تھے۔ دنیا کے بہترین ادب سے ہم یہیں روشناس ہوئے اور زندگی کے تعلق سے ایک سنجیدہ اور معتبر رویہ اپنایا۔ ڈاکٹر یوسف اور وقار لطیف سے یہیں ملاقات ہوئی۔ نقی نے ایک سرکاری دفتر میں ملازمت اختیار کر لی تھی اور میں صحافی کی حیثیت سے حیدرآباد کے روزنامہ 'سیاست' سے وابستہ ہو گیا تھا۔

ان دنوں ہم لوگوں کے مزاج میں ایک عجیب سا اضمحلال پیدا ہو گیا تھا، جو زندگی کے تضادات کے ادراک سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ہم لوگوں کی بنیادی شوخی و شرارت برقرار تھی۔ نقی کی ایک خوبی مجھے ہمیشہ سے پسند رہی کہ جاگیردارانہ گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود اس نے زندگی کے لئے ہمیشہ ایک صحت مند اور ترقی پسند رویہ اپنایا۔ کالج سے نکلنے کے بعد نقی نے چھ برس حیدرآباد میں گزارے۔ اس کی افسانہ نگاری کا شوق بھی ساتھ ساتھ جاری رہا۔

پھر ۱۹۶۱ء میں ایک دن نقی انگلستان کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ اس کے خطوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ وہاں کن مشکلات سے دوچار ہے۔ ہر خط میں اورینٹ ہوٹل کا حال یوں پوچھتا تھا جیسے یہ اس کا رشتہ دار ہو۔ ۱۹۶۵ء میں جب یہ ہوٹل ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا تو اس نے مجھے ایک درد بھرا پُرسے کا خط لکھا۔

۱۹۶۱ء کے بعد نقی سے بس چند ہی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ پچھلے سال وہ بین الاقوامی فلمی میلہ میں شرکت کے لئے دہلی آیا تھا۔ دس بارہ دن خوب ملاقاتیں رہیں۔ نقی نے برطانیہ آکر انگریزی صحافت میں جو مقام حاصل کیا ہے اُسے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ دہلی کی تفصیلی ملاقاتوں میں میں نے اندازہ لگایا کہ آج سے پچیس تیس برس پہلے ہم دونوں نے زندگی کو دیکھنے اور پرکھنے اور برتنے کے لئے جو زاویہ نگاہ اپنایا تھا وہ اب بھی ہم دونوں کے پاس محفوظ ہے۔ مجھے حیرت ہوتی

ہے کہ لندن جیسے شہر میں اتنے برس گزارنے کے باوجود اس کا زاویہ نگاہ گرد آلود نہیں ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی گزارنے کے لئے زندگی کی نہیں بلکہ ایک زاویہ نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی زاویہ نگاہ سے میں موسیٰ ندی کو دیکھتا ہوں اور اسی زاویہ نگاہ سے نقی ٹیمز کو دیکھتا ہے۔ اور اب تو میں نے بھی ٹیمز کو دیکھ لیا ہے۔ ۱۹۶۱ء سے پہلے لندن میرے لئے دیگر شہروں کی طرح ایک شہر تھا۔ مگر جب سے نقی اس شہر میں آباد ہوا ہے، میں لندن کی ہر تبدیلی کا نقی کے پس منظر میں جائزہ لیتا ہوں۔ مارگریٹ تھیچر پھر سے برسر اقتدار آتی ہیں تو یہ سوچتا ہوں کہ اس سے نقی کا بھلا ہوگا یا نہیں۔ شہر عمارتوں سے نہیں بنتا اُس شخص سے بنتا ہے جو اس میں آباد ہوتا ہے۔ پھر اس شہر میں میرا سب سے پیارا دوست رہتا ہے۔ اس کے حوالے سے اب ٹیمز بھی اپنی لگتی ہے۔ ٹرافلگار اسکوائر بھی اپنا لگتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بکنگھم پیلس بھی اپنا ہی لگتا ہے۔ یہی میرا زاویہ نگاہ ہے اور یہی زاویہ نگاہ نقی کا بھی ہے۔

(''سفرِ لخت لخت۔'' ۱۹۸۴)

پیرس میں مسرور خورشید نے ہمیں مسرور کیا

آدمی یوروپ جائے اور پیرس کو نہ دیکھے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی آگرہ جا کر وہاں کا پیٹھا تو کھا آئے لیکن تاج محل کو نہ دیکھے۔ ہم بھی بہت دنوں تک برطانیہ میں پیٹھا ہی کھاتے رہے۔ پیرس یوروپ کے کلچر کا مرکز ہے اور ہم کلچر کے پاس ذرا دیر سے ہی جاتے ہیں۔ ۱۱؍مارچ کو وہ ایک خنک شام تھی جب ہم لندن کے احباب کو خدا حافظ کہہ، اپنے کندھے پر جھولا ڈال وکٹوریہ اسٹیشن کے سامنے ایک بس میں سوار ہو گئے۔ رات کو بسوں کا یہ قافلہ لندن سے چلتا ہے اور دوسرے دن منہ اندھیرے پیرس پہنچ جاتا ہے۔ آنے جانے کا کرایہ صرف ۲۸ پونڈ ہوتا ہے۔ بس میں سوار ہوتے ہی ہمیں احساس ہو گیا کہ ہم اچانک ایک غیر مانوس دنیا میں پہنچ گئے ہیں کیونکہ بس میں کوئی انگریزی بولنے والا دکھائی دینا تو بہت دور کی بات ہے سنائی تک نہ دیتا تھا۔ اکثریت فرانسیسیوں کی تھی جو 'غوں غاں' کر رہے تھے۔ فرانسیسی اپنی بات چیت میں 'غ' کا جتنا استعمال کرتے ہیں اتنا یوروپ میں شاید ہی کوئی اور قوم کرتی ہو۔ تبھی تو کلچر کے معاملہ میں انھوں نے اتنی ترقی کی ہے۔ بس بڑی دیر تک لندن میں گھومتی رہی۔ پھر شہر سے باہر نکل گئی۔ تین گھنٹوں کے سفر کے بعد ہمیں یہ مژدہ سنایا گیا کہ ہم برطانیہ کی بندرگاہ ڈوور پہنچ گئے ہیں۔ یہاں سے بس اب سمندری جہاز میں داخل ہو گی اور بعد میں یہ سمندری جہاز ہمیں بس سمیت فرانس کی بندرگاہ بولون تک لیجائے گا۔ ہم سے کہا گیا کہ ہم کسٹم وغیرہ کی رسومات طے کر لیں۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ ڈوور کی بندرگاہ کو تو خیر ہم کیا دیکھتے لیکن اس کے اطراف پھیلی ہوئی سفید رنگ کی پہاڑیوں کو دیکھ کر ہمارے وجود میں اُجالا سا پھیل گیا۔ سبحان اللہ کیا اُجلی اور شفاف پہاڑیاں ہیں۔ یوں لگا جیسے کسی

نے سارے ماحول میں روئی کے گالے اُچھال دیئے ہوں۔ اس منظر کو دیکھ کر ہماری روشنی طبع کچھ اور تیز ہوگئی اور ہمیں ہر طرف سپیدی کے سوائے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ بادل ناخواستہ اس منظر کو چھوڑ کر ہم دوبارہ بس میں سوار ہو کر سمندری جہاز میں داخل ہونے لگے تو دیکھا کہ بسوں کی ایک لمبی قطار ہے جو سمندری جہاز میں داخل ہوتی چلی جا رہی ہے۔ جہاز کی نچلی منزل میں بس رُکی تو ہمیں بتایا گیا کہ ہم فرانس کی بندرگاہ بولون کے آنے تک آزاد ہیں۔ جہاز میں جہاں چاہیں بیٹھیں مگر بولون کے آتے ہی بس میں آن بیٹھیں۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ فرانس اور انگلستان کے بیچ سمندر میں اکثر تموج رہتا ہے۔ ہم جہاز کے ریستوران میں بیٹھے سمندر کے اشتعال کو کافی پی پی کر قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک امریکی لڑکی جو بس میں ہماری ہم سفر تھی ہمارے پاس آئی اور ہم سے سگریٹ مانگنے لگی۔ ہم نے اس کی خدمت میں سگریٹ پیش کیا تو ہماری قومیت، ہمارے نام، ہماری تعلیم، ہمارے پیشے وغیرہ کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرنے لگی۔ اس کی معلومات میں خاصا اضافہ کرنے کے بعد ہم نے اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا تو اعلان ہوا کہ بولون کی بندرگاہ آ گئی ہے۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار ہمیں رودبارِ انگلستان کے مختصر ہونے کا دکھ ہوا۔ وہ بولی کوئی بات نہیں بس میں چل کے بیٹھتے ہیں۔ وہاں آپ کی معلومات میں اضافہ کرونگی۔ ہم پھر کسٹم کی رسومات سے گذر کر بس میں آن بیٹھے۔ امریکی لڑکی نے پھر ہم سے سگریٹ مانگا اور لگی ہماری معلومات میں اضافہ کرنے۔ پتہ چلا یوروپ کی سیر پر نکلی ہے۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اللہ نے سب کچھ دیا ہے (سگریٹ کے سوائے)۔ ابھی تک شادی نہیں کی ہے اس لئے کہ ابھی دنیا نہیں دیکھی۔ یوں بھی دنیا کو دیکھے بغیر شادی کرنے کا کیا فائدہ۔ ہماری طرح نہیں کہ شادی ہوئے پچیس برس بیت گئے ہیں اور اب دنیا دیکھنے کو نکلے ہیں اور وہ بھی بیوی کے بغیر۔ یوں بھی مخدومی مشتاق احمد یوسفی نے کہیں لکھا ہے کہ پیرس کی سیر پر جاتے ہوئے اپنے ساتھ بیوی کو لاد کے لیجانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی آدمی ہمالیہ پہاڑ پر جانے لگے اور اپنے ساتھ احتیاطاً تھرماس میں برف کی ایک ڈلی بھی رکھ لے۔ خیر پیرس کی سرزمین پر ہماری بس نے قدم رنجہ فرمایا تو صبح کی اوّلین ساعتیں آ چکی تھیں۔ فرانسیسی دیہاتوں کے اُجلے، سفید اور چمکیلے مکانوں نے ہماری آنکھوں کو منور کر دیا۔ برطانوی مکان زیادہ تر سرخ اینٹوں کے بنے ہوتے ہیں اور ان کا رنگ بھورا یا زردی مائل سا ہوتا ہے جبکہ فرانسیسی مکان سفید اور بھڑکیلے ہوتے ہیں۔ فرانس کی سرزمین پر قدم

رکھتے ہی ہمیں اس بات سے سخت تشویش ہوئی کہ ہماری بس نے اچانک ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی شروع کردی یعنی جو بس اب تک سڑک کے بائیں طرف چل رہی تھی اس نے اچانک دائیں طرف کو چلنا شروع کر دیا۔ سارا یوروپ دائیں طرف کو چلتا ہے مگر برطانیہ اپنے روایتی مزاج کی وجہ سے بائیں طرف کو چلتا ہے۔ کچھ دیر تک عجیب سی الجھن ہوتی رہی۔ پھر اپنی بیوقوفی پر غصہ بھی آیا کہ چار دن کے لئے فرانس میں آئے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ فرانسیسیوں کو راہ راست پر لانے کی ذمہ داری ہماری ہے۔

بس جوں جوں پیرس کے مضافات سے گذرنے لگی ہمیں مسرور خورشید کا خیال آنے لگا۔ ان سے پچھلی شام فون پر یہ بات طئے ہوگئی تھی کہ وہ پیرس کے محلہ اسٹالن گراڈ کے بس اسٹاپ پر ہمارا انتظار کریں گے۔ پہلے تو ہمیں یقین ہی نہ آتا تھا کہ جب روس میں اسٹالن گراڈ باقی نہیں رہا تو پیرس میں کہاں سے آئے گا مگر لوگوں نے یقین دلایا کہ پیرس میں بھی دوسری جنگ عظیم کی یادگار کے طور پر ایک عدد اسٹالن گراڈ موجود ہے۔ اسٹالن گراڈ کا مسئلہ تو خیر حل ہوگیا تھا لیکن مسرور خورشید کا مسئلہ ہم سے حل نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ مسرور خورشید سے ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ دوستوں سے ان کا ذکر بہت سنا تھا۔ ان کی قلندری اور ان کے مزاج کے مد جزر کی داستانیں بھی سنی تھیں۔ لندن میں کئی برس گذارنے کے بعد پچھلے سات آٹھ برسوں سے پیرس میں مقیم ہیں اور تنہا رہتے ہیں۔ ہر شریف آدمی کی طرح ماضی بعید میں ان کا تعلق حیدرآباد سے رہ چکا ہے اور علامہ رشید ترابی مرحوم کے قریبی عزیز ہیں۔ ہم نے مسرور خورشید کے حُلیے کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا پاکستان کے سابق صدر جنرل یحییٰ خاں کے ہم شکل ہیں۔ بڑی مشکل سے اپنے شخصی حافظہ میں جنرل یحییٰ خاں کے نقوش کو از سر نو تازہ کرنے کی کوشش کی تو برصغیر کی تاریخ نے ان کا جو چہرہ بنایا تھا اس کے خدوخال ذہن میں ابھرنے لگے۔ بارے اسٹالن گراڈ کے بس اڈے پر اتر کر اب جو ہم نے جنرل یحییٰ خاں کو تلاش کرنا شروع کیا تو جنرل صاحب تو کہیں نظر نہ آئے البتہ ہندوستانی فلموں کے مزاحیہ اداکار دھومل کے ہم شکل ایک صاحب دور سے تیز تیز آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ یہ مسرور خورشید تھے۔ پستہ قد، پھرتیلے اور گٹھیلے بدن کے۔ پیرس کی اس سرد اور کپکپاتی صبح میں وہ کچھ ایسی گرم جوشی سے ملے کہ ہماری ساری تھکن دور ہوگئی۔

ہماری ان سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ سو ہم عادتاً ان سے کچھ رسمی گفتگو بھی کرنا چاہتے تھے

مگر وہ ہماری رسمی گفتگو کو سننے کے مشتاق نظر نہیں آئے۔ انھوں نے فون پر ہم سے کہہ رکھا تھا کہ ہم اپنے ساتھ اپنا ایک عدد فوٹو بھی لیتے آئیں۔ انھوں نے پوچھا ''آپ کا فوٹو کہاں ہے؟''۔ ہم نے فوٹو ان کے ہاتھ میں تھمایا تو اسے لے کر تیز تیز قدموں سے زیرزمین اُترنے لگے۔ یہ اسٹالن گراڈ کا زمین دوز ریلوے اسٹیشن تھا۔ پیرس کی زمین دوز ریل کو 'میترو' کہا جاتا ہے۔ لندن کی 'ٹیوب' اور پیرس کی 'میترو' میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ فرانس کی ریلیں یوروپ کی ریلوں میں سب سے کارکرد اور کامیاب سمجھی جاتی ہیں۔ رفتار جتنی تیز ہے کرایہ اتنا ہی کم ہے۔ مسرور خورشید نے دو چار منٹ میں میترو میں ہمارے ایک ہفتہ کے سفر کا پاس بنوا دیا۔ ہمیں لے کر چھپاک سے ایک ٹرین میں گھس گئے۔ پھر بولے '' حضرت! آپ سے مشکل یہ ہے کہ آپ نے پیرس کی سیر کے لئے صرف چار دن نکالے ہیں۔ چار دن بہت چھوٹے ہیں اور پیرس لندن سے چھوٹا شہر ہونے کے باوجود لندن سے بہت بڑا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کم سے کم وقت میں آپ زیادہ سے زیادہ پیرس دیکھیں۔ میں نے چار دن کی چھٹی لے لی ہے اور پورے ایک ہفتہ کا کھانا بنوالیا ہے۔ اب فوراً گھر چلتے ہیں۔ سامان رکھ کر فوراً بھاگتے ہیں۔''

انھوں نے ہمیں جواب میں کچھ بولنے کا موقع نہیں دیا کیونکہ اتنی دیر میں وہ اسٹیشن آ گیا جہاں مسرور خورشید کا گھر تھا۔ ان کا گھر جس علاقے میں ہے اسے Rue Mufftard کہتے ہیں۔ بولنے میں اس کا تلفظ 'روم افتاد' ادا ہوتا ہے۔ ہم نے تاڑ لیا کہ ضرور کوئی افتاد پڑنے والی ہے۔ پتہ چلا اس علاقہ میں فرانس کے کئی نامور مصور اور ادیب رہ چکے ہیں۔

ان کا گھر ایک کمرہ پر مشتمل ہے جو دنیا بھر کی کتابوں سے بھرا پڑا ہے۔ (اُردو کی کتابیں زیادہ ہیں)۔ مسرور خورشید کے بارے میں وقار لطیف کا جملہ یاد آیا کہ کتابیں مسرور خورشید کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ اور یہ سچ ہے کہ اس کمرے میں کتابوں کے سما جانے کے بعد خود مسرور خورشید کے رہنے کے لئے کوئی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار متواتر چار دنوں تک ہمیں بھی کتابوں سے نہ صرف قریب بلکہ خود کتابوں کے اوپر رہنے کا موقع ملا۔ کیونکہ ہمارے لئے جو پلنگ انھوں نے مختص کر رکھا تھا اس کے نیچے پلنگ کی سطح تک کتابیں لبالب بھری ہوئی تھیں بلکہ بعض معرکتہ الآرا کتابیں تو سطح سے اوپر تک جھانکنے لگی تھیں۔ چنانچہ پہلی رات ہمیں پلنگ پر چین کی نیند نہیں آئی تو انھوں نے دوسرے دن ازراہ عنایت ہمارے پلنگ کے نیچے سے دانتے، نطشے،

گو ئیٹے، برنارڈ شا اور سارتر کی کتابیں نکال کر فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کے شعری مجموعے اور کرشن چندر اور قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے مجموعے رکھ دیئے تھے۔ دوسری رات ہمیں سچ مچ گہری اور پر سکون نیند آئی۔ اُردو سے ہمیں کتنی محبت ہے اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔

مسرور خورشید عجلت اور جلد بازی کا نمونہ ہیں۔ ہر دم بے چین، مستعد اور پھر تیلے۔ گھر پہنچ کر وہ کچھ بتائے بغیر غائب ہو گئے۔ ہم نے موقع کو غنیمت جان کر کمر سیدھی کرنی چاہی تو کیا دیکھتے ہیں کہ مسرور خورشید اپنے دونوں ہاتھوں میں دو لمبی لمبی چھڑیاں لئے چلے آ رہے ہیں۔

ہم نے کہا" یہ آپ نے اچھا کیا کہ پیرس کی سیر کے لئے دو واکنگ اسٹکس Walking Sticks خرید لیں۔ ایک آپ کے کام آئے گی، ایک کو میں استعمال کرونگا۔"

بولے" آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے یہ چھڑیاں نہیں روٹیاں ہیں۔"

ہم نے حیرت سے ان قد آدم روٹیوں کو دیکھا۔ افسوس کہ نظیر اکبر آبادی کی نظر ان روٹیوں پر نہیں پڑی ورنہ انھیں چاند اور سورج روٹیوں کی طرح دکھائی نہیں دیتے بلکہ مینار پر روٹی کا گمان ہوتا۔ ہمارے ملک میں ایسی روٹیوں کا رواج بہت کار آمد ہو سکتا ہے۔ بالخصوص ضدی بچوں کو روٹی کھلانا آسان ہو جائے گا۔ شرافت سے روٹی کھائیں تو ٹھیک ہے ورنہ اسی روٹی سے ضدی بچوں کی پٹائی شروع کر دی۔ مسرور خورشید نے ہمیں پلنگ پر آرام کرتے دیکھا تو بولے" حضرت! یہ آپ اپنی کمر وغیرہ لندن جا کر سیدھی کیجئے۔ پیرس میں آپ کو لگا تار گھومنا ہے۔ پانچ منٹ میں کھانا کھا کر چلتے ہیں۔ پہلے ہم لووف کے شہرۂ آفاق میوزیم کی سیر کریں گے۔ سہ پہر ایفل ٹاور کے سائے میں گذرے گی۔ شاہراہ شانزالیزے شام کو آپ کا انتظار کرے گی۔ محراب فتح کے دیدار بھی وہیں ہو جائیں گے۔ اور دریائے سین تو آپ کو کئی جگہ مل جائے گا۔ ویسے آپ کی ساری شامیں بک ہو چکی ہیں۔ میں نے پیرس کی بعض اہم شخصیتوں سے کہہ رکھا ہے کہ آپ آرہے ہیں۔ یہ شخصیتیں آپ سے ملنے کے لئے میرے گھر آئیں گی۔ آج کی شام سوبورن یونیورسٹی کے صدر شعبہ اُردو جناب عبدالماجد آپ سے ملنے کے لئے آرہے ہیں، ہمیں سات بجے گھر پہنچنا ہوگا۔ کل دن میں پیرس کی مشہور کتب فروش کمپنی 'شیکسپیر اینڈ کمپنی' کے مالک اور دانشور مسٹر جارج سے ملنا ہے۔ شام میں عالمی شہرت یافتہ

مصور حیدر رضا آپ سے ملنے آ رہے ہیں۔ پرسوں ایک فرانسیسی دانشور کرستیان لادو اور ڈاکٹر حمیداللہ صاحب کے پاس آپ کو چلنا ہے۔''

ہم نے کہا'' خاں صاحب! مسٹر جارج اور کرستیان لادو کے بارے میں تو ہم نہیں جانتے البتہ حیدر رضا اور ڈاکٹر حمیداللہ کے بارے میں خوب جانتے ہیں۔ ہم اس قابل نہیں ہیں کہ اتنی بڑی شخصیتوں سے ملیں۔ حیدر رضا ایک بار دہلی آئے تھے۔ دہلی کے رابندر بھون میں انھیں دور سے دیکھا تھا۔ اس وقت ہماری ہمت نہیں ہوئی تھی کہ ان سے ملیں۔ جس فنکار سے ہم دہلی میں نہیں ملے اس سے اب پیرس میں ملاقات کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر آپ نے اتنے بڑے فنکار کو اپنے ہاں کیوں بلایا۔ اخلاق کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہم خود جا کر ان سے ملیں۔''

مسرور خورشید بولے'' حضرت! یہ سب کاریگری ہے۔ میں نے حیدر رضا کو بتایا ہے کہ آپ اُردو کے پائے کے ادیب ہیں۔ اس پر حیدر رضا نے کہا کہ وہ خود آپ سے ملنے کے لئے آئیں گے۔ چنانچہ کل شام وہ آ رہے ہیں۔''

ہم نے کہا'' مگر میں سچ مچ اس قابل نہیں ہوں کہ حیدر رضا جیسے بڑے آرٹسٹ سے ملوں۔''

بولے'' مگر میں تو آپ کو اس قابل بنا دیا ہے۔ چلیئے اب اس مسئلے پر بات نہیں ہوگی۔ اب اُٹھیئے بہت دیر ہو رہی ہے۔'' یہ کہہ کر مسرور خورشید ہمیں تقریباً گھسیٹتے ہوئے گھر کے باہر لے گئے۔ مسرور خورشید نے پیرس کی سیر اس طرح کرائی جیسے قصائی بکرے کو ذبح کرنے کے لئے لے جاتا ہے۔ آدھے گھنٹے میں ہم لووف Louvre کے شہرہ آفاق میوزیم میں تھے۔ لووف کا میوزیم جس محل میں واقع ہے وہ چالیس ایکٹر کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اتنا بڑا میوزیم ہے کہ اسے دیکھنے کے لئے ایک عمر چاہیئے۔ یونان، روم، مصر اور مشرقی ممالک کے شعبے الگ ہیں۔ دنیا بھر کے مجسمے اور مصوری کے شاہکار ہیں۔ جتنے قیمتی مجسمے اور پینٹنگس اس میوزیم میں ہیں دنیا کے کسی اور میوزیم میں نہیں ہیں۔ دوسری صدی قبل مسیح کے مشہور و معروف وینس ڈی میلو کے مجسمے کا دیدار بھی یہیں ہوا۔ لیونارڈو داونچی کی شہرہ آفاق پینٹنگ 'مونالیزا' کو بھی اسی میوزیم میں دیکھا۔ اس تصویر کی یوں حفاظت کی جاتی ہے جیسے یہ کوئی زندہ ہستی ہے۔ بلٹ پروف شیشے کے پیچھے سے مونالیزا ہمیں دیکھ کر مسکراتی رہی۔ اور ہم اس بات پر مسکراتے رہے

کہ بلٹ پروف شیشے کی حفاظت میں رہنے کے باوجود ایک سپاہی بندوق تانے مونالیزا کی مسکراہٹ کی حفاظت کر رہا ہے۔

فرانسیسیوں کی انگریزی یا تو یونہی کمزور ہے یا پھر وہ جان بوجھ کر اپنی انگریزی کو کمزور بناتے چلے جاتے ہیں۔ اس میوزیم میں ہمیں ایک جگہ انگریزی عبارت نظر آئی جس میں لکھا تھا CLOCK ROOM FURTHER DOWN NOT HERE اس انگریزی کا مطلب یہ تھا کہ اگر آپ اس منزل سے نیچے جانے کا ارادہ رکھتے ہوں اور اگر آپ کو پیشاب وغیرہ آ رہا ہے تو یہیں فارغ ہو کر جایئے کیونکہ نیچے کوئی پیشاب خانہ وغیرہ نہیں ہے۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ کسی فرانسیسی کو انگریزی آتی بھی ہو تو وہ انگریزی نہیں بولتا اور اگر بولتا ہے تو انگریزی کا کچومر نکال دیتا ہے۔ فرانسیسیوں کے قول و فعل کا بھی کوئی بھروسہ نہیں کیونکہ یہ لکھتے کچھ ہیں اور پڑھتے کچھ اور ہیں۔ "PALAIS DE CHAILLOT" کو پیلے دی شیو بولتے ہیں۔ مشہور شاہراہ CHAPMS-EL YSEES کو شانزالیزے بولتے ہیں۔ MONT MARTRE کے مشہور گرجا گھر کو مومارت بولتے ہیں۔ VERSAILLES ان کے پاس صرف ورسائی بن جاتا ہے۔ اسی لئے ہم فرانسیسی نام پڑھ تو لیتے تھے لیکن ان کا نام اپنی زبان پر نہ لاتے تھے۔

خیرلووف کے میوزیم سے ہم حیرت زدہ ہو کر نکلے تو ایفل ٹاور جا پہنچے۔ ۳۲۰ میٹر اونچا یہ فولادی ٹاور ۱۸۸۹ میں بنا تھا۔ اس کے اوپر چڑھ جایئے تو نہ صرف سارا پیرس دکھائی دیتا ہے بلکہ پیرس کے بہت سے نواحی علاقے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ پیرس میں ہر جگہ سے دکھائی دیتا ہے۔ ایک انگریز ادیب نے ایفل ٹاور کے بارے میں لکھا تھا کہ پیرس میں اس بدنما ڈھانچے کے دیدار سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آدمی خود ایفل ٹاور پر جا کر بیٹھ جائے۔ ایفل ٹاور کے سامنے دریائے سین بہت سلیقے سے بہتا ہے۔ دریا کو پل سے عبور کر کے آگے نکل جایئے تو پیلے دی شیو آتا ہے۔ یہاں نیشنل تھیٹر ہے اور کئی قسم کے میوزیم ہیں۔ یہ عمارتیں ۱۹۳۷ء میں بنی تھیں۔ یہ پیرس کا سب سے خوبصورت علاقہ ہے۔ بالخصوص رات میں تو اس کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم بہت دیر تک دریائے سین کے کنارے کھڑے رہے۔ یوروپ کے اکثر دریا ہمیں نہایت شریف اور مہذب نظر آئے۔ سین میں اس وقت کئی جہاز چل رہے تھے۔ شام ہونے کو تھی۔ یوں بھی سوبورن یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالماجد آٹھ بجے گھر

آنے والے تھے۔ وہ ٹھیک وقت پر آئے۔ سوچا تھا کہ ان سے ادب کلچر وغیرہ پر بات ہوگی مگر وہ مسرور خورشید کے بنائے ہوئے حیدر آبادی کھانوں کے ذائقے میں کچھ اس طرح کھو گئے کہ ادب کا نمبر ہی نہیں آیا۔ پروفیسر عبدالماجد خود حیدر آبادی ہیں۔ غالباً آزادی سے پہلے پیرس چلے گئے تھے۔ حیدر آباد کا حال پوچھا۔ ہم نے فرانسیسی ادب کا حال پوچھنا چاہا تو وہ حیدر آبادی کھانوں کا ذکر لے بیٹھے۔ ہم نے بھی علم و ادب کو دور رکھا اور حیدر آبادی کھانوں میں کھو گئے۔ ہم فرانس کے بارے میں کوئی سوال کرتے تو وہ جواب میں حیدر آباد کی کسی چیز کے بارے میں سوال کرنے لگتے تھے۔

(''سفرِ لخت لخت۔'' ۱۹۸۴)

ایروفلوٹ میں ہمارا پہلا سفر

محبانِ سوویت یونین (FRIENDS OF SOVIET UNION) کے سکریٹری جنرل، کے۔آر۔گنیش ہمارے کرم فرماؤں میں سے ہیں، آپ کو یاد ہو کہ نہ یاد ہو یہ وہی کے۔آر۔گنیش ہیں جو سابق میں مرکزی وزیرفینانس رہ چکے ہیں۔اپنے دورِوزارت میں انھوں نے اسمگلنگ کے خلاف کچھ ایسے اقدامات کئے تھے کہ اسمگلر انھیں اب تک یاد کرتے ہیں۔اس امتیازی وصف کے علاوہ وہ آرٹ اور ادب اور بالخصوص اُردو ادب کا بہت نکھرا ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اسمگلروں اور اُردو ادیبوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ایک دن انھوں نے ہم سے پوچھا ''آپ کبھی سوویت یونین گئے ہیں۔؟''

ہم نے دل ہی دل میں سوچا کہ ہم کوئی ہیون سانگ، فاہیان یا ابن بطوطہ تھوڑے ہی ہیں کہ اپنے بال بچوں اور عزیز و اقارب کو چھوڑ، کندھے پر ایک جھولا ڈال، نئی نئی دنیاؤں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں اور جب برسوں بعد زندگی کی شام ڈھلے واپس ہوں تو پتہ چلے کہ مسافر کی جھولی میں سفر کی یادیں تو بہت ہیں لیکن وطن میں عزیز و اقارب اور بال بچوں کی تعداد میں کمی واقع ہوگئی ہے۔سیاحت ان کے لئے ایک نصب العین تھی ہمارے لئے ایک تفریح ہے۔پھر کسی ہیون سانگ یا کسی ابن بطوطہ کے ساتھ یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ کسی اجنبی دھرتی پر پہنچتا تھا تو وہاں کا حاکم اس کے ذوق سفر سے خوش ہو کر اس کا منہ موتیوں سے بھر دیتا تھا۔اب حالات بدل گئے ہیں۔اب اجنبی دیس کا حاکم الٹا سیاح کے سینہ یا پیٹ میں چھپے ہوئے موتیوں یا ہیرے، جواہرات کو نکال لیتا ہے (ہمارا اشارہ کسٹم والوں کی طرف ہے)۔ہمارے ہاں ذوق سفر تو بہت ہے لیکن از وقہ سفر

کی ہمیشہ کمی رہی۔

سو ہم نے کچھ دیر سوچ کر کہا ''گنیش جی مانا کہ ہم نے ملکوں ملکوں کی خاک ضرور چھانی ہے لیکن اسی وقت چھانی ہے جب اس خاک کو چھاننے کا معاوضہ یعنی کرایہ آمد و رفت کسی اور نے ادا کیا ہو۔ ہم تو کب سے سوویت یونین جانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں لیکن کسی ملک میں بن بلائے چلے جانا ہماری فقیرانہ شان کے خلاف ہے۔ آپ تو اب ہمارے سوویت یونین جانے کی بات کر رہے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ایک زمانہ ہم پر ایسا بھی گذرا ہے جب ہم سالم روس اور اس کے انقلاب کو خود ہندوستان میں لانے کی بابت سوچا کرتے تھے۔ گنیش جی ہماری بات کو سن کر خاموش ہو گئے جیسا کہ ان کی عادت ہے اور بعد میں ہم بھی اس بات کو بھول گئے جیسا کہ ہماری عادت ہے۔ تاہم دو مہینوں بعد ایک دن اچانک گنیش جی کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ بیرونی ممالک سے دوستانہ و ثقافتی تعلقات کی مرکزی سوویت انجمن اور سوویت یونین کی سوویت۔ ہند دوستی انجمن نے ان کی اس تجویز کو مان لیا ہے کہ اُردو کے ادیبوں اور دانشوروں کے دو وفود کو سوویت یونین کا دورہ کرنے کی دعوت دی جائے۔ پہلا وفد دو ارکان پر مشتمل ہوگا۔ ایک رکن تو آپ ہیں اور دوسرے رکن ہیں پروفیسر اشتیاق عابدی۔ ۲۰ رستمبر کو جانا ہوگا۔ کوچ کرنے کی تیاری کیجئے۔ اس اطلاع سے ہمیں دوہری مہمیز لگی۔ ایک تو سوویت یونین کا سفر اور اوپر سے اشتیاق عابدی جیسا ہمسفر نصیب آجائے تو کیا کہنے۔ وہ ہمارے ہم نوالہ، ہم پیالہ، ہم دم، ہم مشرب اور ہم مشروب تو ہیں ہی اب ہم رکاب اور ہم رکابی بھی بن جائیں گے۔ ہم رکابی پر ہمارا زور اس لیے ہے کہ وہ ہم جیسے ملنگوں کے دوست ہونے کے باوجود ماڈرن فوڈ انڈسٹریز کے چیرمین ہیں۔ سفر میں اور وہ بھی بیرونی سفر میں یہ طمانیت کیا کچھ کم ہے کہ ہماری ماڈرن بریڈ ہمارے ساتھ رہے گی۔

صاحبو! اس پس منظر کے ساتھ اب ہم سوویت ایرلائنس 'ایروفلوٹ' کے وسیع وعریض ہوائی جہاز میں بیٹھے ہیں۔ اس ہوائی جہاز کو ہم نے اکثر اپنے گھر کے اوپر سے گذر کر دہلی کے ہوائی اڈے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کی ساخت اور آواز دنیا کے مروجہ دیگر ہوائی جہازوں سے مختلف ہوتی ہے۔ ہم تو اپنے گھر کے اندر بیٹھے بیٹھے ہی پتہ چلا لیتے ہیں کہ ایروفلوٹ کا ہوائی جہاز ہماری چھت پر سے گذر رہا ہے۔

تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

ہم نے دنیا کی کئی ایر لائنس میں سفر کیا ہے لیکن ایروفلوٹ میں بیٹھنے کا یہ پہلا موقع ہے۔لوگوں نے کہہ رکھا ہے کہ ایروفلوٹ کی ہوائی حسیناؤں کے ہونٹوں پر اتنی مسکراہٹ نہیں ہوتی جتنی کہ اور ایئر لائنس کی ہوائی حسیناؤں کے ہونٹوں پر ہوتی ہے۔ مسکراہٹ پر یاد آیا کہ بنکاک سے دہلی کے سفر میں تھائی ایرویز کی ایک موہنی سی ایرہوسٹس تو ہم نے ایسی بھی دیکھی تھی جس کے ہونٹ ہی نہیں اُس کی آنکھیں تک مسکراتی تھیں۔ پیشانی کھلکھلاتی تھی اور ابرو ٹھٹھا مارتے تھے۔ اس کی آواز تک تبسم ریز تھی۔ غرض اس کا رُواں رُواں ہمیں مسکراتا اور کھلکھلاتا ہوا ملا۔ اس بے نام و بے نشان مسکراہٹ کی یاد اب بھی ہماری آنکھوں کو کبھی کبھی لبریز کر دیتی ہے۔ خیر ہمیں اب مسکراہٹوں سے کیا لینا دینا ہے۔ جو دے اس کا بھلا اور جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔ یوں بھی ہمیں تین گھنٹوں بعد تاشقند میں اُتر جانا ہے۔ ایرہوسٹس دانے دنکے کو پوچھ لے یہی کافی ہے۔ تاہم یہ بات ضرور ہے کہ ایروفلوٹ کے ہوائی جہازوں میں بیٹھنے کے لئے وہ فراغت نہیں ہوتی جو عام جمبو جٹ ہوائی جہازوں میں ہوتی ہے۔ پاؤں تو آپ پسار ہی سکتے ہیں لیکن اتنے بھی نہیں کہ آپ کو دیکھنے والے کو یہ گمان گذرے کہ آپ رحلت فرما چکے ہیں اور یہ کہ آپ کی بے گور و کفن نعش نشست پر بے حس و حرکت پڑی ہے۔ ہوائی سفر میں ہم اس اندازِ نشست و برخاست کے قائل نہیں ہیں۔ اس لئے ایروفلوٹ کی نشستیں کم از کم ہماری شخصی شائستگی اور ذاتی رکھ رکھاؤ کے عین مطابق نظر آئیں۔ آدمی پاؤں پسارے گا بھی تو باہر تھوڑا ہی جائے گا اور میاں یہ ہوائی جہاز ہے کوئی گھر تو ہے نہیں کہ آپ کھانے کی میز پر جوتوں سمیت پاؤں رکھے، گود میں کھانے کی پلیٹ سجائے کھانا کھانے لگ جائیں۔ یہ سب پیٹ بھروں کے چونچلے ہیں۔ ہم تو بسوں کے ڈنڈوں سے لٹک کر سفر کرنے کے عادی ہیں۔ اب ایروفلوٹ میں کشادہ اور آرام دہ نشستوں کے طلبگار کیونکر ہوں۔

ہمارا حلقہ احباب کتنا وسیع ہے اس کا اندازہ تو ہمیں ہوائی جہاز کے اندر پہنچنے پر ہی ہوا۔ ایک طرف ہمارے یار دلدار ارجن دیو بیٹھے ہیں جو تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ دوسری طرف تلگو دیشم کے رکن پارلیمنٹ اور عثمانیہ یونیورسٹی میں سماجیات کے پروفیسر ڈاکٹر لکشمنا بیٹھے ہیں۔ یہ دونوں برلن میں ہونے والی کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے جارہے ہیں۔ تیسری طرف ہفتہ وار نئی دنیا

کے ایڈیٹر شاہد صدیقی اور صحافی شمس الزماں بیٹھے ہیں۔ مولانا اسحٰق سنبھلی بھی یہیں کہیں ہیں۔ اگلی نشستوں پر محترمہ شیلا کول، سابق مرکزی وزیر تعلیم بھی براجمان ہیں جو تاشقند میں ہونیوالی خواتین کی کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے جارہی ہیں۔ باقی وہ مسافر ہیں جنھیں ہم نہیں جانتے مگر قیاس اغلب ہے کہ وہ بھی یقیناً کسی اچھی سی کانفرنس میں شرکت کے لئے جارہے ہوں گے۔

ہوائی جہاز کو رات کے دس بجکر بیس منٹ پر اُڑنا تھا لیکن روانگی میں دیر ہوتی چلی جارہی ہے۔ ایروفلوٹ کی ہوائی حسیناؤں نے اچانک مسافروں کو گننا شروع کردیا۔ ہم نے کہا یا اللہ یہ مسافروں کو گننے کا کیا سلسلہ ہے۔ پھر سب کے ٹکٹوں کو چیک کرنے کی باری آئی۔ روسی زبان میں کچھ اعلان بھی ہوا۔ انگریزی میں بھی کچھ بولا گیا، جس پر روسی لہجہ کا کلف کچھ اتنا زیادہ چڑھا ہوا تھا کہ اپنے مطلب کی انگریزی ہمارے پلے نہیں پڑی۔ کسی نے کہا ''شاید کوئی مسافر بلا ٹکٹ سوار ہوگیا ہے۔ اس کی تلاش ہورہی ہے۔'' پھر ایرہوسٹس نے بعض مسافروں کو اُٹھا کر کچھ پوچھنا شروع کیا۔ یہ معمہ کچھ ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ اتنے میں ایرہوسٹس ہاتھوں میں کوئی آلہ پکڑے نمودار ہوئیں اور ہوائی جہاز کی راہداری میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آلہ کے بٹن کو دباتی اور چھوڑتی ہوئی چلنے لگیں۔ آلوں کے بجنے کی آواز سے یوں لگا جیسے سویرا ہوگیا ہے اور چڑیوں نے چہچہانا شروع کردیا ہو۔ ہم نے اشتیاق عابدی سے پوچھا ''یہ کیا ماجرا ہے؟''

وہ بولے ''ہوائی جہازوں کے اغوا کے بڑھتے ہوئے واقعات کے پیش نظر یہ کوئی احتیاطی تدبیر لگتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس آلہ کے ذریعہ ہتھیاروں کا پتہ چلایا جارہا ہو''۔ یہ سنتے ہی ہمارے پسینے چھوٹ گئے کیونکہ ہماری جیب میں چابیوں کا جو جھیلہ رکھا ہوا ہے اس میں ایک چھوٹا سا چاقو بھی موجود ہے۔ یہ چاقو ہم نے ہوائی جہاز کو اغوا کرنے کے ارادہ سے نہیں رکھا ہے بلکہ اس کا مقصد ناشپاتی، امرود اور اسی قسم کے دیگر پھلوں کو کاٹنا ہے۔ مبادا یہ نہ سمجھئے کہ ہم پھل کھانے کے بہت شوقین ہیں۔ یاد آتا ہے کہ زندگی میں صرف ایک بار چاقو کی مدد سے ایک سیب کو کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ سیب تو نہیں کٹا تھا البتہ انگلی ضرورت کٹ گئی تھی۔ اب جو یہ چاقو اپنے ساتھ لیجارہے ہیں تو اس کا پس منظر صرف اتنا ہے کہ دوستوں نے مشہور کررکھا ہے کہ ازبکستان میں پھل بہت ملتے ہیں۔ تمہارے سامنے پھل تو بہت ہوں اور چاقو تمہارے پاس نہ ہو تو کیا کروگے؟۔ ہندروس دوستی کے سچے جذبہ کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ پھل اگر سوویت یونین کے ہوں تو ان پھلوں کو

کاٹنے کے لئے جو چاقو استعمال ہو وہ کم از کم ہندوستانی ضرور ہونا چاہیئے۔ یکطرفہ دوستی یوں بھی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ لہٰذا دوطرفہ دوستی کے عملی مظاہرہ کے طور پر یہ چاقو ہماری جیب میں پڑا ہوا ہے۔

ہوائی جہاز کی روانگی میں ایک گھنٹہ کی تاخیر ہوگئی تھی کہ اچانک ہوائی جہاز نے رن وے پر دوڑنا شروع کردیا۔ اب ہم ہوا میں ہیں۔ زمین سے جب بھی ہمارا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو نہ جانے یہ دھرتی اتنی خوبصورت کیوں نظر آنے لگتی ہے۔ ہم نے سوچا تھا کہ ہوائی جہاز جب اپنی مقررہ اونچائی پر پہنچ جائے گا تو ہمیشہ کی طرح ہوائی حسینائیں اچانک جلوہ گر ہونگیں اور یہ بتانا شروع کریں گی کہ ہوائی حادثہ کی صورت میں آپ کو کدھر سے راہ فرار اختیار کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہمیں ہوائی حسیناؤں کی یہ مشقیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ جب بہت دیر تک ایر ہوسٹس جلوہ افروز نہ ہوئیں تو کسی نے بتایا کہ ایروفلوٹ میں یہ تماشے نہیں دکھائے جاتے۔ جب کوئی حادثہ ہوتا ہی نہیں تو خواہ مخواہ مسافروں کا دل کیوں دہلایا جائے۔ ہم نے کہا ''اگر حادثہ نہیں ہوتا تو کرتب نہ دکھاؤ۔ تمہاری مرضی۔ مگر خدا کے لئے کھانا تو کھلا دو۔ اب ہوائی جہاز کو دھرتی سے اُٹھ آئے کوئی ایک گھنٹہ بیت چکا ہے۔ ساڑھے بارہ بجنے کو ہیں۔ ہوائی سفر کی ہیبت میں ہم کھانا کھائے بغیر آٹھ بجے ہی ہوائی اڈہ پر آگئے تھے۔''

کسی نے کہا'' ایروفلوٹ میں کھانا مسافر کی بھوک کے حساب سے نہیں آتا بلکہ جب ایر ہوسٹس کو بھوک لگے گی تو وہ خود بخود کھانا لے آئیگی۔''

ابھی ہم اس دلچسپ ریمارک سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ ایر ہوسٹس اپنے پورے مطبخ اور تام جھام کے ساتھ نمودار ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری نشستوں پر لوگ کھانے میں مصروف ہوگئے۔ ہمیں تو ایروفلوٹ کا کھانا بھی اچھا لگا۔ لوگوں نے خواہ مخواہ ہی ایروفلوٹ سے ڈرا رکھا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر گھڑی دیکھی تو ہوائی سفر کے دو گھنٹے بیت چکے تھے۔ پون گھنٹہ یا ایک گھنٹہ اور بیت جائے تو ہم تاشقند میں ہونگے۔

کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ہم شاید ہمالیہ سے گذر رہے ہیں۔ یہیں کہیں سے صدیوں پہلے آریہ ہندوستان آئے تھے۔ سکندر اعظم بھی دنیا کو فتح کرنے کے ارادہ سے یہیں سے گذرا تھا۔ کتنی تکلیفیں اٹھا کر آیا تھا۔ اس زمانے میں ایرو فلوٹ کہاں تھی کہ کسٹم کی جانچ اور سیکوریٹی چیک کروا کے پلک جھپکتے میں حفاظتی پٹی باندھ کر چلا

آ تا۔ نیچے اس علاقہ میں کہیں وہ غار بھی ہوگا جس میں ناکام ونامراد تیمور لنگ دشمنوں سے گھبرا کر پناہ لینے آیا تھا اور اس کی ملاقات اس چیونٹی سے ہوئی تھی جو اناج کے ایک وزنی دانہ کو اٹھا کر اوپر لے جانے کی کوشش میں بار بار نیچے گر جاتی تھی۔ سینکڑوں بار وہ گری مگر بالآخر دانہ کو اوپر لے جا کر ہی دم لیا۔ چیونٹی نے اناج کے اس دانہ کے ساتھ کیا سلوک کیا مورخین اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ چیونٹی کا یہ عزم اور حوصلہ بعد میں تیمور لنگ کا عزم اور حوصلہ بن گیا۔ وہ غار سے نکلا تو امیر تیمور بن چکا تھا۔ اس کی سلطنت سارے وسط ایشیاء کی سرحدوں کو پھلانگ گئی۔ ملک گیری کے شوق میں اس نے جگہ جگہ انسانی سروں کے مینار کھڑے کئے۔ تاریخ امیر تیمور کو یاد کرتی ہے لیکن چیونٹی کو بالکل بھول جاتی ہے۔ یہ ہمارے کانوں میں کیسی آوازیں آرہی ہیں۔ کہیں یہ چنگیز خاں کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز تو نہیں ہے۔ وہ بھی اپنے دو لاکھ گھڑسواروں کے ہمراہ تہذیبوں کے نشان مٹاتا ہوا یہیں سے تو گذرا تھا۔ نہ جانے وہ گھوڑے کیا ہوئے۔ تاریخ ان گھوڑوں کی شجاعت کو یاد نہیں کرتی۔ صرف چنگیز خاں کو یاد کرتی ہے۔ شاید یہ چنگیز خاں کا ہی لشکر ہے۔

ذرا سنو تو کیسی ہیبتناک آوازیں آرہی ہیں۔ ارے نہیں یہ تو ایروفلوٹ کے ہوائی جہاز کے نیچے اُترنے کا سلسلہ ہے۔ تاریخ کے صفحو! اب ٹھہر جاؤ۔ ہمارے ذہن میں الٹنے پلٹنے کی کوشش نہ کرو۔ ہمیں تاشقند کی جگمگاتی روشنیوں میں کھو جانے دو۔ حدِنظر تک کیسی خوشنما اور دلآویز روشنیاں ہیں۔ حال کی روشنی جب سامنے ہو تو ماضی کی تاریکیوں کو کون یاد کرے۔ باادب باملاحظہ ہوشیار! اب ہم کچھ ہی دیر میں ازبکستان کی راجدھانی تاشقند میں اُترنے والے ہیں۔ پتہ نہیں یہ شہر ہمیں کیسی کیسی یادیں عطا کرنے والا ہے۔ ہم اس شہر کو فتح کرنے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ نہ لاؤ لشکر ہے نہ تام جھام۔ ہم تو اپنا دل ہتھیلی پر لئے اس شہر نگاراں کے دروازے پر کھڑے ہیں۔

جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ

(''سفرِ لخت لخت۔'' ۱۹۸۶)

☆☆

ہم تاشقند سے بول رہے ہیں

ہم تاشقند کے ہوٹل ازبکستان کے کمرہ نمبر ۷۴۳ سے بول رہے ہیں۔ ہندوستانی وقت کے مطابق ہم رات کے تین بجے تاشقند پہنچے تھے۔ازبکستان اور ہندوستان کی دوستی کی انجمن کے سکریٹری اسیا ئیوالیگزینڈ روچ ہمیں لینے کے لئے ہوائی اڈہ پر آ گئے تھے۔ وہ بڑے تپاک اورگرم جوشی کے ساتھ ہم سے ملنا چاہتے تھے۔لیکن ہم نے انھیں منع کیا کہ رات کے تین بجے ہمارے پاس انہیں جوابی تپاک نہیں ملے گا۔اس رسم کو صبح کے لئے اٹھار کھئے۔خوابیدہ تاشقند کو اور اس کی وسیع شاہراہوں اوراونچی عمارتوں کو اپنی نیم خوابیدہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے ہوٹل پہنچے۔ الیگزینڈ روچ نے ہم سے کہا کہ ہم اپنی گھڑیوں کو بیس منٹ آگے کر کے ابن الوقت بن جائیں کیونکہ تاشقند کا وقت دہلی کے وقت سے بیس منٹ آگے ہے۔آج ہی سے نیا وقت لاگو ہوا ہے اگر آپ ایک دن پہلے آجاتے تو آپ کو اپنی گھڑیوں کو ایک گھنٹہ بیس منٹ آگے کرنا پڑتا۔ہم نے کہا چلو بچت کی کوئی صورت تو نکل آئی ورنہ ہم تو ہمیشہ گھاٹے کا سودا کرتے آئے ہیں۔ بیرونی سفر میں ہمیں اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی کہ ہماری گھڑی کو ہوتی ہے۔پھر یہ تو سوویت یونین ہے جہاں وقت کے سات منطقے ہیں۔اس کے مشرق کے شہر اور مغرب کے شہر کے درمیان وقت کے معاملے میں تقریباً سات گھنٹوں کا فرق ہے۔جو ملک دو براعظموں میں پھیلا ہوگا اس کا یہی حشر ہوگا۔الیگزنڈر ہوٹل سے جانے لگے تو اس وقت ہماری گھڑی میں تاشقند کے وقت کے حساب سے صبح کے چار بج رہے تھے۔وہ بولے" صبح ٹھیک آٹھ بجے ہوٹل کی لابی میں آجایئے۔دوستی انجمن کے عہدیدار بھی آئیں گے۔ساتھ میں ناشتہ بھی ہوگا اور دن بھر کا سارا پروگرام آپ کو بتادیا جائے گا۔"

ہم نے کہا۔" بندۂ خدا! ہم تو آئے ہی ہیں سوویت یونین کو دیکھنے کے لئے۔ آپ دکھانے کے لئے جتنے بے چین ہیں اتنے ہی ہم دیکھنے کے لئے بھی اوتاولے ہیں۔ مگر ذرا ہمیں اپنی کمر تو سیدھی کر لینے دو۔ رات اب جانے کو ہے اس کے جاتے جاتے کوئی چھوٹا سا حسین خواب بھی دیکھ لیں تو کیا مضائقہ ہے۔ آٹھ بجے کی بجائے دس بجے ملیں تو کیسا رہے گا۔ آپ اطمینان رکھیں اس بتدیلی سے ہند۔ روس دوستی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔"

ہمیں یاد نہیں کہ الیگزینڈر کے چلے جانے کے بعد ہم نے اپنی کمر سیدھی کی بھی یا نہیں۔ نیند کو لانے کے ان لوازمات کا کسے ہوش تھا۔ آنکھ کھلی تو آٹھ بج رہے تھے۔ کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو صبح بہت روشن تھی۔ دور دور تک اونچے اونچے درختوں کے ساتھ اونچی اونچی عمارتیں نظر آئیں۔ کھڑکی کے سامنے جو وسیع شاہراہ تھی اس پر موٹریں، بسیں، ٹرامیں دوڑی چلی جارہی تھیں۔ تاشقند کب کا جاگ چکا تھا۔ اس بھاگتی دوڑتی زندگی کو دیکھ کر ہم میں چستی اور پھرتی کی لہر سی دوڑ گئی۔ فٹافٹ اپنے آپ کو تیار کیا اور ٹھیک دس بجے لابی میں پہنچے۔ الیگزینڈر رویچ حسب وعدہ لابی میں موجود تھے۔ ان کے ہمراہ ایک متین سنجیدہ اور بردبار خاتون کھڑی تھیں۔ الیگزینڈر نے کہا۔" ان سے ملئے یہ ہیں ڈاکٹر لیدیا کیبر یکشتس، ماسکو کے بین الاقوامی تعلقات کے انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر ہیں۔ یہ مرکزی دوستی انجمن کی طرف سے آپ کے استقبال کے لئے خاص طور پر ماسکو سے آئی ہیں۔ سوویت یونین کے سارے دورہ میں یہ آپ کے ساتھ رہیں گی۔ ان کے ہمراہ ایک اور صاحب کھڑے تھے غفور جہاں گستری، تاشقند میں سوویت یونین کا جو سب سے بڑا اشاعتی مرکز 'رادوگا' کے نام سے قائم ہے اس میں اُردو زبان کے ایڈیٹر اور صدر شعبہ ہیں۔ یہ ازبک ہند دوستی انجمن کی طرف سے آئے تھے۔ ازبکستان کے سارے دورہ میں یہ ہمارے ساتھ رہے۔ ان کے بارے میں ایک الگ مضمون لکھیں گے جس کے کہ وہ مستحق ہیں۔ فی الحال ڈاکٹر لیدیا کا ذکر ہو جائے۔ ناشتہ کی میز پر ہم نے ان سے انگریزی میں بات کرنے کی کوشش کی تو انھوں نے سلیس اُردو میں جواب دیکر اُردو کے مستقبل کے تعلق سے ہماری مایوسی کو وقتی طور پر ہی سہی دور کر دیا۔ پتہ چلا کہ اُردو ہندی کی اسکالر ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری پر تحقیقی مقالہ لکھ چکی ہیں۔ اتنی ہی مرتبہ ہندوستان آچکی ہیں جتنی مرتبہ ہم دہلی سے حیدر آباد گئے ہیں۔ ہمیں تو ساٹھ باسٹھ برس کی خاتون نظر آئیں۔ مگر جب ہم نے ان کی عمر پوچھی تو الٹا ہم سے اور اشتیاق عابدی سے ہماری مروجہ عمریں پوچھ بیٹھیں۔ ہم نے اپنی عمر پچاس برس بتائی

اور اشتیاق عابدی چھپن برس پر رُک گئے۔ ڈاکٹر لیدیا کچھ دیر اس طرح سوچتی رہیں جیسے اپنے لیے کسی سہولت بخش عمر کا انتخاب کر رہی ہوں۔ بولیں ''میں ۵۴ برس کی ہوں۔'' یہ سنتے ہی ہم نے بر سر موقعہ انھیں اپنی بہن بنالیا۔ ہم نے انھیں سمجھایا کہ ہندوستان میں بھی ہماری کوئی بہن نہیں ہے۔ ایک چچازاد بہن تھی جس سے ہم نے بعد میں شادی کرلی۔ اب روس میں آپ جیسی قابل اور لائق بہن مل جائے تو کیا کہنے۔ یوں بھی آپ کے نام کا آخری حصہ یعنی 'کیبر یکشتس' بولنے میں کچھ اتنا ثقیل ہے کہ ہماری زبان سے ادا نہ ہوگا۔ 'کیبر یکشتس' کی جگہ آپا لگا کر 'لیدیا آپا' بولا جائے تو آپ کا نام خاصا رواں ہو جائے گا اور ہم کسی خاص محنت مشقت کے بغیر سوویت یونین کے دورہ سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔ اشتیاق عابدی بھی 'کیبر یکشتس' سے فکر مند تھے۔ بولے میں بھی آپ کو 'لیدیا آپا' کہوں گا۔ ہنس کر بولیں ''عابدی بھائی! اگر چہ آپ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں لیکن پھر بھی آپ کے لیدیا آپا کہنے سے دو ملکوں کی دوستی کو فروغ حاصل ہوتا ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

ناشتہ کے بعد ہم تاشقند کی سیر کو نکلے۔ کیا صاف ستھرا اور کشادہ شہر ہے۔ ازبکستان جس کی گود میں کئی تہذیبیں پروان چڑھیں، آبادی کے اعتبار سے سوویت یونین کی چوتھی بڑی جمہوریہ ہے اور اس کی راجدھانی تاشقند کو سوویت یونین کا چوتھا بڑا شہر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ازبکستان کی تاریخ ہزاروں برس پرانی ہے۔ سکندر اعظم بھی یہاں آیا تھا۔ ساتویں صدی میں عرب اسلام کو لے کر یہاں آئے۔ کیسے کیسے عالم، کیسی کیسی جلیل القدر ہستیاں یہاں پیدا ہوئیں۔ آٹھویں صدی کے اختتام اور نویں صدی کے آغاز میں علم الجبرا کے بانی محمد ابن موسیٰ الخوارزم کا مسکن یہی تھا۔ مشہور ریاضی داں احمد الفرغانی بھی اسی عرصہ میں یہاں رہتا تھا۔ مشرق کے ارسطو، الفارابی کا وطن بھی یہی تھا۔ مشہور دانشور اور طبیب ابن سینا اور ابو ریحان البیرونی بخارا میں رہتے تھے۔ علم و دانش کی جو شمعیں یہاں روشن ہوئیں ان سے سارا عالم جگمگا اٹھا۔ پھر چنگیز خاں کے لشکر نے اس تہذیب کو روندا۔ امیر تیمور نے یہاں ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی جس کی سرحدیں ایشیاء سے نکل کر یوروپ تک چلی گئی تھیں۔ تیمور اور اس کے جانشینوں بالخصوص اس کے پوتے الغ بیگ کے عہدِ حکومت میں سمرقند اور بخارا کا شمار دنیا کے عظیم شہروں میں ہونے لگا۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی ظہیر الدین بابر بھی یہیں سے آیا تھا۔ ازبکستان کا چپہ چپہ ماضی کی تاریخ کا امین ہے۔

ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو تاشقند کا موسم دہلی کی طرح ہی لگا۔ ازبکستان ہوٹل جس میں

ہمارا قیام ہے انقلاب چوک میں واقع ہے۔ بیحد خوبصورت جگہ ہے۔ سامنے ہی ازبکستان کے ادیبوں کی انجمن کا دفتر ہے۔ ہم نے لینن چوک بھی دیکھا جہاں ازبکستان کی سپریم سوویت کی عمارت واقع ہے۔ بہت پر فضا مقام ہے۔ چاروں طرف خوبصورت باغ ہیں، فوارے الگ چل رہے ہیں۔ اس شہر کی زیادہ تر عمارتیں اپریل ۱۹۶۶ء میں تاشقند کے زلزلے کے بعد بنی ہیں۔ لینن کا ایک بھاری مجسمہ بیچوں بیچ نصب ہے۔ ازبک ادب کے بانی علی شیر نوائی کے نام پر یہاں جو شاہراہ ہے وہ تاشقند کی سب سے بڑی شاہراہ ہے۔ دونوں طرف اونچی اونچی عمارتیں ہیں۔ تاشقند کے ایک پارک میں ہندوستان کے دوسرے وزیراعظم لال بہادر شاستری کا ایک خوبصورت مجسمہ بھی نصب ہے، آنجہانی شاستری نے جنوری ۱۹۶۶ء میں اس وقت کے صدر پاکستان ایوب خاں کے ساتھ تاشقند معاہدہ پر دستخط کئے تھے اور یہیں ان کا انتقال بھی ہوا تھا۔

قوموں کی دوستی کا چوک اور محل دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہیں ایک لوہار اور اس کی بیوی اور ان کے گود لئے ہوئے چودہ بچوں کا مجسمہ ہے جسے دیکھ کر انسان دوستی اور عالمی امن پر آدمی کا یقین پختہ ہو جاتا ہے۔ اس مجسمہ کا قصہ یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب سارے سوویت یونین میں یتیم و یسیر اور بے سہارا بچوں کی تعداد بڑھ گئی تھی تو تاشقند کے ایک لوہار احمد شاہ محمودوف اور اس کی بیوی نے مختلف قومیتوں کے چودہ کمسن یتیم بچوں کو گود لے لیا تھا اور انھیں وہ پیار اور تربیت دی جو شاید ان کے اصلی ماں باپ بھی نہ دے سکتے تھے۔ احمد شاہ محمودوف تو اب اس دنیا میں نہیں ہیں البتہ ہمیں بتایا گیا کہ ان کی بیوی ابھی تک زندہ ہیں اور یہ چودہ بچے جو اب بڑے ہو چکے ہیں سوویت یونین کے مختلف علاقوں میں رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ مر چکے ہیں، جو زندہ ہیں وہ اپنی ماں سے ملنے اکثر تاشقند آتے رہتے ہیں۔ ایسا پر شکوہ اور اثر انگیز مجسمہ ہے کہ جسے لگاتار دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔

تاشقند کی عالیشان عمارتوں اور وسیع و عریض سڑکوں کو دیکھ چکے تو ہم نے غفور جہاں گستری سے کہا "جناب والا! آپ کے ہاں کوئی پرانا تاشقند بھی ہوگا، اسے دکھائیے"۔ اور تھوڑی دیر بعد ہم پرانے تاشقند میں تھے۔ ازبک ٹوپیاں اور پگڑیاں باندھے ہوئے لوگ سڑکوں سے گذر رہے تھے۔ تنگ گلیاں، ان گلیوں میں بہتی ہوئی موریاں، سر راہ کباب اور پھل بیچنے والے، قہوہ پیتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف لوگ ان سب کو دیکھ کر ہمیں یوں لگا جیسے ہم پرانی دہلی کے کسی علاقے سے گذر رہے ہیں۔ گلیوں کے دونوں طرف یک منزلہ عمارتیں ہیں۔ باہر سے اکثر بوسیدہ نظر آتی ہیں۔ مگر سنا ہے

کہ اندر بہت سجی سجائی ہیں۔ شہر کے اس حصہ میں سب سے اونچی عمارت مسجد سکہ شیخ کا مینار ہے۔ یہاں سوویت مشرق کا اسلامی مرکز ہے اور یہاں وسط ایشیاء اور قزاقستان کے مسلمانوں کا ادارہ دینیات واقع ہے۔ اس ادارہ کے سربراہ مفتی شمس الدین ابن ضیاء الدین ذیشان اس دن باکو گئے ہوئے تھے جہاں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ اس ادارہ کے برابر ہی تاشقند کے مشہور عالم اور مفتی امام کفال شاشی کا مقبرہ ہے۔ مفتی کفال شاشی نے ایک طویل عرصہ بغداد میں گذارا تھا۔ جب وہ تاشقند واپس ہونے لگے تو بغداد کے اس وقت کے خلیفہ نے ان کی علمی و دینی خدمات سے متاثر ہو کر انھیں قرآن کا وہ نسخہ تحفہ میں دیا تھا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ حضرت عثمانؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ایک صفحہ پر جو دھبے ہیں وہ حضرت عثمانؓ کے خون کے ہیں۔ یہ نسخہ بعد میں پیٹرس برگ چلا گیا۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد لینن کے دستخط شدہ فرمان کے مطابق قرآن کا یہ نسخہ سوویت مشرق کے مسلمانوں کے حوالہ کیا گیا اور یہ آج بھی یہاں محفوظ ہے۔ تاشقند کا ادارہ دینیات سوویت یونین کے مسلمانوں کے چار مذہبی مرکزوں میں سے ایک ہے۔ یہ ادارہ سوویت مشرق کی پانچ جمہوریتوں قزاقستان، ازبکستان، تاجکستان، کرغزیہ اور ترکمانیہ کی مسجدوں اور مسلمانوں کے مذہبی فرقوں کو متحد کرتا ہے۔ اس ادارہ کے تحت دینی تعلیم کا انتظام موجود ہے۔ اس کے کتب خانے میں تیس ہزار دینی کتابیں ہیں جن میں سے اکثر نایاب ہیں۔ ادارہ دینیات اور مسجدوں کے لئے مالی وسائل دینداروں کے عطیوں سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ تاشقند کے زلزلے سے متاثر ہونے والے خاندانوں کی امداد کے لئے ادارہ دینیات نے دو لاکھ روبل (موجودہ شرح مبادلہ کے مطابق ایک روبل سولہ ہندوستانی روپیے کے برابر ہے) کا عطیہ اپنے فنڈ سے دیا تھا۔ اسی ادارے نے قرآن شریف کے کئی ایڈیشن شائع کئے ہیں۔ وہ ہر سال قمری جنتری اور دیگر مذہبی رسالے شائع کرتا ہے۔

ہم جب اس ادارے میں گئے تو دوپہر کا وقت تھا اور دن اتوار کا تھا۔ مسجد کا صحن کافی بڑا ہے۔ پتہ چلا کہ جمعہ کی نماز کے وقت صحن نمازیوں سے بھر جاتا ہے۔ مسجد کے ایک حصہ کی تعمیر زور و شور سے جاری تھی۔ لیکن ہمیں سب سے زیادہ دلچسپی ان نوجوان جوڑوں سے تھی جو عروسی لباس پہنے جوق در جوق ادارے میں آرہے تھے۔ پتہ چلا کہ یہ جوڑے اسلامی طریقے سے نکاح پڑھوانے آرہے ہیں۔ سوویت قانون کے مطابق ہر شادی کا رجسٹریشن ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بعد کوئی چاہے تو اپنے مذہبی طریقے سے بھی شادی رچا سکتا ہے۔ چونکہ اتوار کو چھٹی کا دن ہوتا ہے اسی لئے

نوجوان جوڑے اس دن ادارہ دینیات میں آتے ہیں۔ نوجوان جوڑے زرق برق لباس پہنے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ موٹروں میں لدے پھندے آرہے تھے۔ مسجد میں ایک میلہ کا سا گمان ہو رہا تھا۔ ایک گھنٹہ ہم وہاں رہے اور اس عرصہ میں پندرہ نوجوان جوڑے وہاں آئے۔ السلام علیکم، وعلیکم السلام اور مرحمت (شکریہ) کے الفاظ بار بار سنائی دیئے۔ ہم نے بعض جوڑوں کو مبارکباد بھی دی۔ دلہنیں ہماری مبارکباد سے بہت خوش ہو رہی تھیں اور ''مرحمت، مرحمت'' کی رٹ لگا دیتی تھیں۔ ایک دلہن کا نام پوچھا تو اس کا نام مشکورہ نکلا۔ دوسری سے پوچھا تو وہ ماہرہ نکلی۔ تیسری جو ملی تو عائشہ تھی۔ مشکورہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر ہم سے ازبک میں پوچھا ''پردیسی یہ تو بتاؤ میں کیسی لگ رہی ہوں۔'' ہمارے مترجم تھے غفور جہاں گستری۔ ہم نے کہا ''بی بی! آپ کے دولھا میاں آپ کے ساتھ ہیں اسی لئے ہم سے صحیح جواب کی توقع نہ رکھو۔ یہ تمہارے ساتھ نہ ہوتے تو ہم بتاتے کہ تم کیسی لگ رہی ہو۔ کیا تم سچ مچ اس دنیا کی مخلوق ہو؟''۔ غفور جہاں گستری نے ہماری اُردو کا نہ جانے کیا ترجمہ کیا کہ اب کی بار دولہا میاں ہمارے سر ہو گئے کہ ہم رات کا کھانا اُن کے ساتھ کھائیں۔ ہم نے سوچا کہ غفور صاحب نے ضرور ترجمہ کا گھپلا کیا ہے ورنہ جہاں ہمیں رسوائی ملنی تھی وہاں ہمارے حصہ میں نیک نامی کیسے آ گئی۔ کھانے کے معاملے میں غفور صاحب کی نیت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ کہنے لگے کہ آپ شادی کی دعوت میں چلیں تو آپ کو ازبک کھانوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع بھی مل جائے گا۔ مگر ہم نے دولہا میاں سے معذرت کی کہ بھیا! ایک لکھنوی دوست منظر سلیم تاشقند میں رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ رات کے کھانے کی بات پہلے ہی طے ہو چکی ہے۔ جی تو بہت چاہتا ہے کہ آپ کی دعوت میں شرکت کریں، ایسی محبت ہمیں پھر کہاں ملے گی۔ مگر پھر وہی منظر سلیم۔ ہائے منظر سلیم! تم ہندوستان میں کبھی نہیں ملے۔ اب تاشقند میں ملے بھی تو کب ملے۔ بادلِ نخواستہ نوجوان جوڑوں سے اجازت لے کر مشہور عالم مدرسہ کوکلتاش اور برق خاں کے مدرسہ کو دیکھنے گئے۔ یہ دونوں مدرسے سولھویں صدی عیسوی میں شیبانی خاں کے دورِ حکومت میں بنے تھے۔ ان مدرسوں کو جس طرح محفوظ رکھا گیا ہے انھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ عمارتیں ابھی بنی ہیں۔

(''سفرِ لخت لخت''۔ ۱۹۸۶ء)

☆☆

ہم نے اُردو میں ازبیک کھانا کھایا

ہم جب بھی بیرونی سفر پر جاتے ہیں تو کم از کم پیٹ کی بھوک کے معاملے میں یہ احتیاط ضرور کرتے ہیں کہ بھوک اُسی وقت لگے جب ہمارا یا ہماری مترجم ہمارے ساتھ ہو۔ اس احتیاط کو ملحوظ نہ رکھنے کی صورت میں اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ ہم نے انڈا کھانا چاہا اور بیرے نے سالم مرغ ہمارے سامنے لاکر رکھ دیا۔ مرغ اور انڈے کا تو خیر ایک رسمی اور غیر رسمی سا رشتہ بھی ہے۔ پیرس میں ہم نے اشاروں کی مدد سے آئسکریم کھانی چاہی تھی اور بیرے نے ان اشاروں کا سلیس ترجمہ سور کے گوشت کے قتلوں کی شکل میں لاکر رکھ دیا تھا۔ کھانے کے معاملے میں اتنی جدیدیت کے ہم قائل نہیں ہیں۔ بیرونی سفر کے اس وسیع تجربہ کی روشنی میں ہم نے ازبکستان میں حتی الامکان یہ کوشش کی کہ مترجم کی غیر موجودگی میں ہمیں بھوک نہ لگنے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ مترجم کی موجودگی میں ہم کھانے کے سوائے کوئی اور کام ہی نہیں کرتے۔ اسے ہمارا جذبۂ حُب الوطنی نہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ وطن عزیز میں ہمیں بڑی مشکل سے بھوک لگتی ہے مگر جیسے ہی وطن سے باہر قدم نکالتے ہیں بھوک کچھ اس زور سے چمکتی ہے کہ بجلی بھی کیا چمکے گی۔ ہم نے ازبیک میزبانوں سے کہہ رکھا ہے کہ ہندوستان میں ہمارا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے ہے اور یہ کہ ہمارے معدے کو مرغن غذاؤں سے خاص رغبت ہے اور سیدھی سادی غذاؤں سے ہمارا ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے۔ ہم تو ناشتے میں ہی اتنا کھا جاتے ہیں کہ وطن عزیز میں پورے دن بھر میں اتنا کھانے کی توفیق نہیں ہوتی۔ اس پر مستزاد دوپہر کا کھانا، شام کا ناشتہ اور رات کا کھانا الگ کھا جاتے ہیں جو وطن میں ہماری ایک ہفتہ کی غذا کے برابر ہو جاتا ہے۔ کھانے کے معاملہ میں اتنی احتیاط کے باوجود ایک

سہ پہر کو اچانک بھوک نے زور مارا۔ ہم نے اپنے مترجم کو کہہ رکھا تھا کہ وہ ہمیں گھنٹہ بھر آرام کرنے کا موقع عنایت کریں۔ وہ جا چکے تو بھوک آ گئی۔ بھوک کے ہم کچے تو ہیں ہی اکیلے ہی ہوٹل ازبکستان کے ڈائننگ ہال میں پہنچ گئے۔ بیرے کو بلا کر اپنے دانتوں میں دو انگلیاں ڈالیں اور لگے انھیں چبانے۔ بیرا بہت ہوشیار تھا ہمارے اشارے کو بھانپ کر ازبیک میں پوچھا ''گوشت؟''۔ ہم نے اُردو میں کہا '' ہاں ہاں گوشت۔'' پھر اپنے ہاتھوں سے پیالے کی ایک شکل بنائی اور ہاتھ کو ہلا ہلا کر اس میں لہریں سی چلانے لگے۔ ہمارے اس اردو اشارے کا مطلب یہ تھا کہ پیالے میں گوشت کا شوربا لے آؤ۔ بیرے نے ازبیک میں پوچھا '' پیالہ''؟

ہم نے اُردو میں کہا '' ہاں ہاں پیالہ''۔ پھر پیالے میں چلنے والے ہمارے ہاتھ کی لہروں کے اشارے کو تاڑ کر بیرے نے ازبیک میں پوچھا '' شورپا''؟

ہم نے کہا '' ہاں ہاں شورپا۔ اگر چہ ہم اُردو میں ایک نقطہ والا شوربا پیتے ہیں لیکن ازبکستان میں تین نقطوں والا شورپا پینے میں ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ایک نقطہ والا شوربا ہی جب اتنا لذیذ ہوتا ہے تو تین نقطوں والا شورپا تو اور بھی لذیذ ہوگا۔''

ہم نے ہاتھ کی روٹی بنائی تو بیرے نے ازبیک میں پوچھا '' نان''؟

ہم نے اُردو میں کہا '' ہاں ہاں بھئی نان! تم اُردو بہت اچھی جانتے ہو''۔

اُردو کا لفظ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے سمجھا کہ یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ اب ہم اسے کس طرح سمجھاتے کہ ہم تو اُردو کو نہیں کھاتے البتہ ہمارے ملک میں اُردو اکیڈیمیاں ہیں جو اُردو کو ضرور کھا رہی ہیں۔ پھر ہم نے ہاتھ کے اشارے سے چمچہ بھی لانے کو کہا تو بیرے نے ازبیک میں پوچھا۔ '' چمچ''؟

ہم نے اُردو میں کہا '' ہاں ہاں چمچ۔ برخوردار تم تو اُردو جانتے ہو۔ پہلے بتایا ہوتا تو ہمیں اداکاری کے اتنے جوہر دکھانے کیوں پڑتے۔ اچھا یہ بتاؤ تمہارے ہاں چمچہ صرف دسترخوان پر چلتا ہے یا سیاست اور حکومت کے ایوانوں میں بھی چلتا ہے۔'' بیرے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ظاہر ہے کہ چمچوں کے فواید اور نقصانات سے جتنا ہم واقف ہیں ازبکستان والے کہاں سے واقف ہونگے۔ جب ہم نے دیکھا کہ ہمارے ہر اُردو کھانے کا نام بھی ازبکستان میں وہی ہے تو بیرے سے پوچھ لیا '' میاں! یہ تو بتاؤ تمہارے پاس کھانے کے لئے اور کیا ہے؟''

اس پر بیرا ازبیک میں کہنے لگا۔'' پلاؤ ہے۔ کباب ہے۔ قورمہ ہے۔ قیمہ ہے۔ تنجن ہے۔ ماش کھچڑی (ماش کی دال کی کھچڑی) ہے۔''

یہ سن کر جی ہی جی میں غصہ آیا کہ ازبکستان کے لوگوں نے ہمارے اتنے اچھے اور لذیذ کھانوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔

بعد میں غفور جہاں گستری سے ازبیکیوں کی اس دست درازی کا شکوہ کیا تو وہ نظریں جھکا کر خاموش ہو گئے۔ لیکن جب خود ٹھنڈے دماغ سے غور کیا تو احساس ہوا کہ یہ تو اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے والا معاملہ ہے۔ یہ پکوان تو ہیں ہی وسط ایشیاء کے، جنھیں مغل اپنے ساتھ ہندوستان لے آئے تھے اور جن کی مدد سے آج تک ہم اپنا وزن اور بلڈ پریشر دونوں کو بڑھا رہے ہیں۔ ازبکستان میں چار روزہ قیام کے دوران میں ہمیں ایسے کئی لفظ ملے جو اُردو اور ازبکستانی دونوں میں مشترک ہیں۔ جیسے دسترخوان، مہمان خانہ، آپا، خالہ، کتاب، کاغذ، قلم، دیوان، مشاعرہ، شاعر، غزل وغیرہ۔

ایک بات اور ہم نے یہ محسوس کی کہ ازبکستان کے لوگوں کے قول اور فعل میں کافی تضاد پایا جاتا ہے۔ 'ح' اور 'خ' دونوں حروف تہجی کی آوازیں ان کی زبان میں رائج ہیں۔ لیکن جہاں 'ح' کی آواز نکالنی ہوتی ہے وہاں وہ اسے 'خ' کے تلفظ سے ادا کرتے ہیں اور جہاں 'خ' بولنا ہوتا ہے وہاں 'ح' بولتے ہیں۔ 'محمد' کو 'مخمد' بولیں گے۔ بخارا شریف کو 'بحارا شریف'، 'مہمان خانہ' کو 'مہمان حانہ' بولیں گے۔ ان کا ایک خوبصورت شہر ہے جسے وہ 'شخری سبز' بولتے ہیں۔ ہم بھی 'شخری سبز'، 'شخری سبز' کی گردان کرتے رہے۔ ایک دن ازبکستان کے بارے میں ایک انگریزی کتاب مل گئی تو اس 'شخری سبز' کے آگے اس کا انگریزی ترجمہ GREEN CITY لکھا ہوا پایا۔ تب ہمیں پتہ چلا کہ یہ تو اصل میں 'شہرِ سبز' ہے۔ ایک دن غفور جہاں گستری نے بتایا کہ ہمیں تاشقند کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ بھی چلنا ہے۔ ہم نے پوچھا یہاں کیا ہے؟ بولے'' یہاں بہت سے قدیم مخطوطات ہیں۔ شرقیات کے بارے میں یہاں تحقیق کا کام ہوتا ہے۔ بہت مشہور ادارہ ہے۔ آپ کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد، پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو، دوسرے وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور تیسری وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی بھی یہاں جا چکی ہیں۔'' ہم نے کہا مخطوطات تو ہمارے گھر میں بھی بہت سے ہیں۔ خود ہمارے کئی ناقابل اشاعت مضامین مخطوطات

کی شکل میں محفوظ ہیں مگر ہم اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں ضرور جائیں گے کیونکہ ہم کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتے۔''

تاشقند کا اورینٹل انسٹی ٹیوٹ بڑی عالیشان عمارت میں واقع ہے۔ ہم وہاں پہنچے تو انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خیر اللہ مظفر اپنے رفقاء کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔ صباحت عظیم جانو ابھی تھیں جو ہندوستان کے مغل حکمرانوں کے بارے میں تحقیق کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر عارفوف تھے جو جدید اُردو ادب پر کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر سوتلیانہ تھیں جو جدید ہندی ادب پر کام کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر ہاشموف الیاس تھے جنھوں نے ٹیگور پر خاصا کام کیا ہے۔ اور بھی کئی محققین وہاں موجود تھے جن کے بارے میں ہم نے مزید تحقیق اس لئے نہیں کی کہ تحقیق ہمارا میدان نہیں ہے۔ ڈاکٹر خیر اللہ مظفر نے نہایت تفصیل کے ساتھ ہمیں اس انسٹی ٹیوٹ کے بارے میں بتایا کہ افغانستان اور عرب ممالک کے کئی محققین یہاں تحقیق کی غرض سے آتے ہیں۔ ہندوستان کے مغل حکمرانوں پر تحقیق کے نتیجہ میں وسط ایشیاء کی تاریخ کے کئی گوشے نمایاں ہوئے ہیں۔ مسودات اور مخطوطات کے نگران ڈاکٹر منیر دف نے ہمیں ان مخطوطات کا دیدار بھی کرایا جنھیں دیکھ کر ہماری آنکھیں وہ ہوگئیں جو اکثر ہو جاتی ہیں یعنی کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ نویں صدی عیسوی میں خط کوفی میں لکھا ہوا قرآن مجید کا نسخہ بھی دیکھا۔ کلیات امیر خسرو کا سب سے قدیم نسخہ اسی انسٹی ٹیوٹ میں محفوظ ہے۔ حافظ شیرازی نے عقیدت کے طور پر حضرت امیر خسرو کے کچھ کلام کو اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ یہ نسخہ بھی حافظ کے دستخط کے ساتھ یہاں محفوظ ہے۔ اس کا دیدار کر کے ہم نے اپنے دل کو سرور اور نظر کو نور عطا کیا۔ ۱۱۶ تصویروں والے مصور 'شاہنامہ فردوسی' کے بھی درشن کئے، البیرونی، عمر خیام، رازی، علی شیر نوائی اور کئی اہل قلم کے قلمی نسخے دیکھنے کو ملے۔ اس ادارہ میں اٹھارہ ہزار سے زائد قلمی نسخے ہیں۔ قلمی نسخوں کے نگران ڈاکٹر منیر دف اپنے میدان کے ماہر ہیں۔ یہ ادارہ پہلے علی شیر نوائی لائبریری کا حصہ تھا۔ ۱۹۴۳ء میں سائنس اکیڈیمی کے زیر اہتمام اس ادارہ کا باضابطہ قیام عمل میں آیا۔ اس ادارہ میں کئی ریسرچ اسکالر اسلام کی تاریخ پر کام کر رہے ہیں۔ ایک اسکالر سرگئے مرتینوف بھی ملے جو چین میں اسلام کے موضوع پر ان دنوں تحقیقی کام کر رہے ہیں۔

اس ادارہ کا تفصیلی معائنہ ابھی جاری ہی تھا کہ ہم نے ڈاکٹر منیر دف سے کہا کہ آپ کے ادارہ کی کتاب الرائے ہمیں چاہیئے۔ ہم اپنی رائے قلمبند کرنا چاہتے ہیں۔ غفور جہاں گستری بولے'' ابھی تو

اور بھی کئی مخطوطات ہیں جب آپ سب کچھ دیکھ لیں تو آپ کی رائے بھی بنے گی۔ تب لکھ دیجئے۔''
ہم نے کہا ہماری رائے بن چکی ہے۔ یوں بھی رائے دینے کے معاملہ میں اپنے ملک میں خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو کئی ادیبوں کی کتابوں میں شامل ہمارے مقدمے پڑھ لیجئے یا ان کتابوں کے فلیپ دیکھ لیجئے۔ آپ کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے بارے میں تو ہم کافی تفصیلی معائنہ کے بعد رائے دے رہے ہیں۔ کتابوں کے بارے میں تو انھیں پڑھے بغیر ہی رائے دیدیتے ہیں۔ اصل میں ہم تحقیق اور مخطوطات کے آدمی ہی نہیں ہیں اس لئے رائے دینے کے لئے بے چین ہیں۔ ہم نے عجلت میں کتاب الرائے میں اپنی گرانقدر رائے لکھی۔ ڈاکٹر خیر اللہ مظفر اور ڈاکٹر میئر دف کی درازیٔ عمر کے لئے دعا کی اور چلے از بیک، ہند دوستی کی انجمن میں اپنا خیر مقدم کروانے۔ اس خیر مقدمی تقریب میں ہمیں جانے کی جلدی اس لئے بھی تھی کہ ہمیں سورت میر قاسموف کی اُردو سننی تھی۔ سورت میر قاسموف ابھی ایک سال پہلے تک ہندوستان میں روسی سفارت گھر کے ثقافتی شعبہ کے نائب مہتمم تھے۔ ان دنوں تاشقند میں از بیک۔ ہند دوستی کی انجمن کے نائب صدر ہیں۔ سچ پوچھئے تو ازبکستان میں ہم اسی انجمن کے مہمان تھے۔ انجمن کے صدر تیشہ بائف فتح غلام وچ ہم سے ہوٹل ازبکستان میں ملنے آئے تھے۔ اُردو کے بہت بڑے اسکالر ہیں۔ لکھنو کے لہجہ والی اُردو بولتے ہیں۔ بہت محبت سے ملے۔ ان دنوں تاشقند میں خواتین کی کوئی بین الاقوامی کانفرنس ہو رہی تھی۔ اس کے انتظامات میں بہت مصروف تھے۔ پھر بھی وقت نکال کر ہم سے ملنے آئے۔ ان سے ہم نے میر قاسموف کے بارے میں پوچھا تو بولے ''از بیک۔ ہند دوستی کی انجمن کے خیر مقدمی جلسے میں ان سے آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔'' میر قاسموف سے ہماری یاد اللہ دہلی میں ان کے قیام کے زمانے سے ہے۔ جب بھی اُردو کے مستقبل سے مایوس ہو جاتے تھے تو ان کی اُردو سننے کے لئے چلے جاتے تھے۔ اب بھلا تاشقند میں ان سے کیسے نہ ملتے۔ از بیک۔ ہند دوستی انجمن کے دفتر گئے تو میر قاسموف اپنی خوبصورت اور دلنشین اُردو کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔ پہلے اپنے دفتر کا معائنہ کرایا۔ معلوم ہوا کہ دوستی انجمن کے ۱۲۰ ممالک سے تعلقات ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ہی ہند۔ از بیک دوستی کا مہینہ منایا گیا تھا جس کے تحت سارے ازبکستان میں ہندوستانی فلمیں دکھائی گئیں۔ میر قاسموف نے بتایا کہ ازبکستان میں پچاس سے زیادہ ہندوستانی ادیبوں کی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ خیر مقدمی تقریب میں تاشقند یونیورسٹی کے کئی

طلباء بھی موجود تھے جو اُردو سیکھ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ سارے ازبکستان میں اُردو کے چار اسکول ہیں اور ہر اسکول میں کم از کم چار سو طلباء اُردو سیکھ رہے ہیں۔ سارے سوویت یونین میں سہ لسانی فارمولہ رائج ہے جس کے تحت طالب علم کو پہلے تو اپنے علاقہ یا ریاست کی زبان سیکھنی پڑتی ہے، دوسری لازمی زبان روسی ہوتی ہے، تیسری زبان کے طور پر طالب علم کو کوئی بھی بیرونی زبان سیکھنی پڑتی ہے۔ اس کے تحت اکثر طالب علم اُردو سیکھتے ہیں۔ اس محفل میں اُردو کے کئی طلباء وطالبات جیسے حسن تردئیف، رحیمو اگل یورا، مجید عبدالرحمانو وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ شرف مرزائف بھی ملے جو تاشقند کے ادبی اشاعت گھر 'رادوگا' میں اُردو کے ایڈیٹر ہیں۔ بہت سلیس اور شستہ اُردو بولتے ہیں۔ ریڈیو تاشقند میں اُردو کے انچارج امین جان رستموف بھی ملے جنھوں نے بعد میں ریڈیو تاشقند کے لئے اُردو میں ہمارا انٹرویو بھی لیا۔

میر قاسموف نے اپنی دل نشین اُردو میں ایک موثر تقریر بھی کی۔ ہمیں یاد ہے کہ پچھلے سال میر قاسموف جب تبادلہ کے بعد دہلی سے سوویت یونین واپس جا رہے تھے تو ان کی وداعی تقریب میں ہم شرکت کے لئے خاص طور پر گئے تھے تا کہ آخری بار ان کی فصیح و بلیغ اُردو کو سن سکیں۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ ایک سال بعد ہمیں تاشقند میں ان کی اُردو کو پھر سے سننے کا موقع ملے گا۔ میر قاسموف بہت ٹوٹ کر ملے۔ آخر میں دوستی انجمن کی طرف سے ہمیں تحفے بھی دیئے گئے اور ایک ازبیک ٹوپی بھی ہمیں پہنائی گئی۔ اس چوگوشہ ازبیک ٹوپی کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ سارے سر پر نہیں سماتی بلکہ سر کے سب سے اوپری حصہ پر ٹکی رہتی ہے۔ سارے ازبیکی اس ٹوپی کو اپنے سروں پر ٹکائے گھومتے رہتے ہیں۔ ہم نے بھی سر پر ازبیکی ٹوپی ٹکائی اور دل میں دعا کی کہ زندگی میں پھر کبھی میر قاسموف کی اُردو کو سننے کا موقع ملے۔

(''سفرِ لخت لخت۔'' ۱۹۸۶)

☆☆

ازبکستان کے ادیبوں کے درمیان

خوشحالی، خوشحالی، خوشحالی۔ ازبکستان میں لگا تار چار دنوں تک اتنی خوشحالی دیکھی کہ جی اوب سا گیا۔ اتنی خوشحالی ہم سے دیکھی نہیں جاتی ۔ بڑی بڑی عمارتوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں دیکھنے کو نہ ملیں تو ہمیں ہر شئے میں کسی شئے کی کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ غربت کی فراوانی کو ہم ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں بلکہ اس غرض سے مشرق کے دانشوروں نے قناعت، صبر اور توکل پر عمل کرنے اور غریبی میں نام پیدا کرنے کی اتنی تلقین کر رکھی ہے کہ خوشحالی ذرا سی بڑھ جائے تو ہمارے کردار مشکوک نظر آنے لگتے ہیں۔ چنانچہ ازبکستان کی خوشحالی کو برداشت کرتے ہوئے دو ایک بار ہمیں شبہ ہوا کہ ہمارے کردار کے پاؤں لڑکھڑانے لگے ہیں۔ ایسے موقعوں کے لئے بزرگوں نے تزکیۂ نفس کے کئی ٹوٹکے ایجاد کر رکھے ہیں۔ بلکہ ہم نے اپنے تئیں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ پورے ایک دن کا برت رکھیں گے اور لیموں کا پانی پی کر گذارا کریں گے تاکہ ہمارے کردار کو استحکام اور استقامت عطا ہو۔ ایسی باتوں کے بغیر ہمارا کردار مضبوط ہی نہیں رہتا۔ ہم اپنے ارادے پر عمل کرنا ہی چاہتے تھے کہ ہمیں یہ مژدۂ جانفزا سنایا گیا کہ ازبکستان کے ادیب اور شاعر ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم نے سوچا اب لیموں کا پانی پی کر گذارا کرنے کی کیا ضرورت ہے کیونکہ ادیبوں اور شاعروں کی مخلوق ایسی ہوتی ہے جسے خوشحالی سے یوں بھی خدا واسطے کا بیر ہوتا ہے۔ اُردو کے ادیب ہونے کے ناتے ہمارا تو تجربہ یہی رہا کہ بھوکے پیٹ ہم جتنا اچھا لکھ لیتے ہیں اتنا شکم سیری کے بعد نہیں لکھ سکتے۔ اگر کوئی شاعر صاف ستھرا اور قیمتی لباس پہن کر کسی مشاعرہ میں کلام سنائے تو اس کے کلام میں معنی تلاش کرنے میں ہم جیسوں کو بہت دشواری پیش آتی ہے۔

شاعر کے پھٹے پرانے، میلے کچیلے کپڑے، اس کی دگرگوں حالت اور بڑھے ہوئے بال ہی اس کی شاعری میں مفہوم پیدا کرنے کی ضمانت ہوتے ہیں۔

اس ذہنی پسِ منظر کے ساتھ ہم ازبکستان کے ادیبوں کی پس ماندگی کو دیکھنے کی آس میں خوشی خوشی رائٹرس یونین کے دفتر گئے تو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ رائٹرس یونین کا دفتر ادیبوں اور شاعروں کا دفتر نہیں لگتا بلکہ اسٹاک ایکسچینج کا دفتر لگتا ہے۔ نہایت عالیشان عمارت ہے۔ ایسی عمارت میں اگر دو دن بھی ہمیں رہنے کا موقع ملے تو ہمارا سارا ادب خطرے میں پڑ جائے۔

رائٹرس یونین کے نائب صدر اسد مختار جو بیک وقت ناول نگار، شاعر اور افسانہ نگار ہیں ایک بھاری بھرکم 'السلام علیکم' کے ساتھ ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔ ہم نے پوچھا آپ کے صدر صاحب استقبال کے لئے کیوں نہیں آئے۔ پتہ چلا کہ رائٹرس یونین کے صدر عمر بیگ ہماری ہی طرح ادیبوں کے کسی وفد کے ساتھ کوریا گئے ہوئے ہیں۔ اسد مختار ساٹھ کے لپیٹے میں ہوں گے۔ ان کے بیک وقت ناول نگار، شاعر اور افسانہ نگار ہونے پر ہمیں اُردو کے ایک ادیب یاد آگئے جو بیک وقت تین چار اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ مشاعرہ میں ہوٹنگ ہوتی ہے تو افسانہ لکھتے ہیں، افسانہ کو قارئین ناپسند کرتے ہیں تو تنقید لکھتے ہیں، ان کی تنقید پر لوگ تنقید کرتے ہیں تو پھر سے مشاعرہ میں نظر آتے ہیں۔ پچھلے کئی برسوں سے ان کا حال کچھ اس طرح کا ہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہم نے سوچا کہ اسد مختار صاحب بھی 'ضرورتِ ادبی' کے تحت بیک وقت ناول نگار، شاعر اور افسانہ نگار بنے ہوئے ہیں۔ بعد میں لوگوں نے بتایا کہ ازبکستان کے مشہور ادیبوں میں سے ہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے، ناول اور افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ بہت تپاک سے ملے۔ قبل اس کے کہ وہ ازبکستان کے ادیبوں کی انجمن کے بارے میں کچھ بتاتے ہم نے انھیں مختصر طور پر بتایا کہ انجمن سازی سے ہمارا بھی بہت پرانا رشتہ ہے اور یہ کہ ایک زمانہ میں ادب کم تخلیق کرتے تھے اور ادیبوں کی انجمنیں زیادہ بناتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم ادب کے ایوان میں انجمن کے راستے سے ہی داخل ہوئے ہیں۔ آج بھی دو چار انجمنیں ہماری جیب میں

اوران کے لیٹر پیڈ ہمارے بریف کیس میں پڑے رہتے ہیں۔ کسی انجمن میں ہم صدر ہیں، کہیں نائب صدر ہیں، کہیں سر پرست ہیں اور کہیں جنرل سکریٹری ہیں۔ خازن کو چھوڑ کر ہم ہر عہدہ پر براجمان ہیں۔ ایک بار ایک انجمن کے خازن بھی رہے۔ لیکن جب حاسدوں اور دشمنوں نے ہم پر پورے پانچ روپیوں کی خطیر رقم کے غبن کا الزام عائد کیا تو ہم انجمن سے علیحدہ ہو گئے۔ بفضل تعالیٰ آج ہم اپنی ذات سے خود ایک انجمن ہیں۔ ہم نے اسد مختار کو بتایا کہ انجمن سازی اور انجمن بانی کے اس وسیع تجربہ کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ ایک پنسیری میں مینڈکوں کو پکڑنا۔ ایک کو پکڑ کر پنسیری میں رکھو تو دوسرا پنسیری سے باہر کود جاتا ہے۔ آپ کے ادیبوں نے بھی مینڈکوں سے ضرور کچھ نہ کچھ سیکھا ہوگا۔ اسد مختار بولے ''ہماری انجمن میں کسی کو کودنے پھاندنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ادب تخلیق کرنے والوں کو مینڈکوں سے کیا لینا دینا۔'' پتہ چلا کہ ازبکستان کے ادیبوں کی انجمن کے ارکان کی تعداد چھ سو ہے، جن میں سے تین سو تو خود تاشقند شہر میں رہتے ہیں۔ باقی ارکان اضلاع سے تعلق رکھتے ہیں۔ ضلعوں میں بھی انجمن کی شاخیں ہیں۔ انجمن کی طرف سے پانچ رسالے شائع کئے جاتے ہیں۔ 'ازبکستان ادبیات' انجمن کا ہفتہ وار اخبار ہے جو ادیبوں کی تخلیقات شائع کرنے کے علاوہ ان کی سرگرمیوں کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ انجمن کی دس کونسلیں ہیں جو اشاعت کے لئے کتابوں کا انتخاب کرتی ہیں۔ سارے اشاعت گھر ریاستی ہیں جن میں 'غفور غلام اشاعت گھر' اور 'محنت اشاعت گھر' بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

ازبکستان میں سال بھر میں اوسطاً چھ سو کتابیں شائع ہوتی ہیں جن میں سے چھبیس فی صد کتابیں دوسری جمہوریتوں کے ادیبوں سے متعلق ہوتی ہیں۔ انجمن کے جلسوں میں ادیبوں کی تخلیقات پر غور وخوض کیا جاتا ہے اور ادب کے نئے رجحانات پر بحث کی جاتی ہے۔ جب ادیب ساٹھ سال کا ہوتا ہے تو حکومت اس کی ادبی خدمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے لئے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیتی ہے۔ وظیفے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ریاستی حکومت کے وظیفہ کی رقم عموماً ایک سو بیس روبل ہوتی ہے۔ مرکزی حکومت کا وظیفہ دو سو پچاس روبل کا ہوتا ہے۔ ضلع کی انتظامیہ کی طرف سے دیا جانے والا وظیفہ نوے روبل کا ہوتا ہے۔ گویا ساٹھ سال کے بعد ازبکستان کا کوئی ادیب اگر چاہے تو آرام اور سکون کی زندگی گذار سکتا ہے۔ ہماری طرح نہیں کہ شاعر اسی برس کا ہو گیا ہے اور

مشاعرہ میں چار لوگوں کے کندھوں پر سوار ہو کر جا رہا ہے اور مشاعرہ میں کلام سنا رہا ہے۔ انجمن کی طرف سے شائع ہونے والے رسالے لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہیں۔ اس دن رائٹرس یونین کے جلسہ میں یوں تو بہت سے ادیب تھے، محمد علی تھے جنھوں نے رامائن کا ازبیکی زبان میں ترجمہ کیا ہے، جمعہ نیاز جباردف تھے جو ازبکستان کے مشہور شاعر ہیں اور ادبی تراجم کے سربراہ بھی ہیں، مگر ہمیں سب سے زیادہ خوشی نعمت امینوف نشتر سے مل کر ہوئی جو ازبکستان کے طنز و مزاح نگار ہیں۔ انھیں جب پتہ چلا کہ ہم بھی طنز و مزاح نگار ہیں تو بہت ٹوٹ کر ملے۔ ہم نے نعمت امینوف سے پوچھا "کیوں بھئی نعمت صاحب! آپ کے ہاں طنز و مزاح کا کیا حال ہے؟ کیا آپ لوگ واقعی ہنستے ہیں اور اگر ہنستے ہیں تو کتنا ہنستے ہیں، کس طرح ہنستے ہیں اور کس پر ہنستے ہیں؟"۔ نعمت امینوف نے کہا "جناب والا، پتہ نہیں باہر یہ کیوں مشہور ہے کہ سوویت معاشرہ میں ہنسی مذاق کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہم جتنا ہنستے ہیں، اتنا شاید ہی کوئی ہنس سکے۔ ہمارے ہاں طنز و مزاح کی روایت بہت مستحکم ہے۔ ملا نصیر الدین ازبکستان کے ہی رہنے والے تھے، جن کے لطیفے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ ہمارے ہاں طنز و مزاح کا ایک باضابطہ رسالہ "مشتم" کے نام سے ۱۹۲۲ء سے نکلتا ہے جس کی تعداد اشاعت چھ لاکھ ہے۔ اس کے علاوہ ہر ادبی رسالہ میں طنز و مزاح کا ایک الگ گوشہ ہوتا ہے۔ نعمت امینوف نے ہمیں 'مشتم' کے کچھ شمارے بھی دیئے۔ سبحان اللہ کیا خوبصورت رسالہ ہے۔ کیا چھپائی ہے۔ کیا عمدہ کارٹون ہیں۔ نعمت امینوف نے ہماری ذات میں اور ہم نے ان کی ذات میں اتنی دلچسپی لی کہ اسد مختار کو یہ کہنا پڑا "مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے دو بچھڑے ہوئے بھائی مدتوں بعد آپس میں مل رہے ہیں۔"

نعمت امینوف نے اس دن ایک دلچسپ لطیفہ بھی سنایا کہ ایک ازبیکی اپنے چھوٹے بچے کو لے کر بخارا کی سیر کرنے گیا۔ بخارا کے مشہور کلاں مینار کے قریب یہ دونوں پہنچے تو بچے نے دیکھا کہ اس مینار کے سب سے اوپری حصہ پر ایک پرندے نے اپنا گھونسلہ بنا رکھا ہے۔ باپ مینار کی تاریخ بیان کرتا رہا لیکن بچہ متواتر اس پرندہ کو دیکھتا رہا۔ جب باپ نے مینار کی تاریخ بیان کر دی اور واپس جانے کا وقت آیا تو بچے نے باپ سے کہا "ازبکستان کے رہنے والے بھی بڑے بیوقوف ہیں۔ ایک معمولی سے پرندے کے رہنے کے لئے اتنا بڑا مینار تعمیر کر دیا۔"

رائٹرس یونین کے جلسے سے نکلے تو غفور جہاں گستری ہمیں ازبکستان کے مشہور ادیب

اور شاعر موسیٰ ایبک کا میوزیم دکھانے لے گئے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں، سوویت یونین میں ادیبوں اور فن کاروں کو بہت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے نام اور کام کو محفوظ کرنے کے سو سو جتن کئے جاتے ہیں۔ موسیٰ ایبک ازبکستان کے مشہور شاعر اور ادیب گذرے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں ان کا انتقال ہوا تو ان کے مکان کو میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا۔ وہ اس مکان میں ۱۹۴۱ء سے ۱۹۶۸ء تک مقیم رہے۔ پامیر کی پہاڑیوں میں ایک چوٹی بھی موسیٰ ایبک کے نام سے موسوم ہے۔ جدید ازبیک ادب میں موسیٰ ایبک کا بہت بلند مقام ہے۔ موسیٰ ایبک نے بیس تصانیف چھوڑیں۔ ۱۹۰۵ء میں وہ تاشقند میں پیدا ہوئے۔ گویا سوویت انقلاب کے وقت ان کی عمر بارہ چودہ سال کی رہی ہوگی۔ انقلاب سے پہلے ازبکستان میں خواندگی کا اوسط صرف دو فیصد تھا۔ موسیٰ ایبک کو یہ اعزاز بھی حاصل رہا ہے کہ انقلاب کے بعد وہ ازبکستان کے پہلے گریجویٹ بنے۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی نظم 'موسم سرما' کے عنوان سے کہی۔ ۱۹۲۶ء میں ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ موسیٰ ایبک نے 'قزل ازبیکستان' کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع کیا۔ انھوں نے ازبیکستان میں تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے ۱۹۲۱ء میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ موسیٰ ایبک کا میوزیم اگر چہ سج چکا ہے لیکن اب بھی اس کے کئی شعبوں کی ترتیب کا کام جاری ہے۔ ان کی ذات سے وابستہ چیزوں کو نہایت سلیقہ سے سجایا گیا ہے۔ موسیٰ ایبک نے بحیثیت ادیب ساری دنیا کا دورہ کیا تھا۔

ہم میوزیم کے اس کمرے میں پہنچے جہاں موسیٰ ایبک کی تصویریں آویزاں ہیں تو ایک گروپ فوٹو کے سامنے اچانک رُک سے گئے۔ ۱۹۴۹ء میں موسیٰ ایبک جب پاکستان گئے تھے تو یہ اس موقع کا گروپ فوٹو ہے۔ اس تصویر میں وہ پاکستانی ادیبوں کے ہمراہ کھڑے مُسکرا رہے ہیں۔ ہم جب بڑی دیر تک اس تصویر کے آگے رُک گئے تو غفور جہاں گستری بولے'' کیا موسیٰ ایبک کی یہ تصویر آپ کو بہت پسند آئی ہے؟''

ہم نے کہا'' اس تصویر کے آگے رُکنے کی وجہ موسیٰ ایبک نہیں، کوئی اور ہے''

غفور جہاں گستری نے پوچھا'' کون معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں؟''

ہم نے کہا'' غفور صاحب! معشوق نہیں بلکہ اس میں ہمارے بڑے بھائی صاحب موجود ہیں۔''

غفور جہاں گستری بولے'' آپ کے بڑے بھائی صاحب اس تصویر میں کہاں سے پہنچ گئے۔ یہ تو پاکستانی ادیبوں کے ساتھ موسیٰ ایبک کا گروپ فوٹو ہے۔''

ہم نے کہا'' آپ نے ابراہیم جلیس مرحوم کا نام سنا ہے؟''

غفور جہاں گستری بولے'' آپ نام سننے کی بات کرتے ہیں۔ میں نے تو انھیں پڑھا ہے۔''

ہم نے کہا'' وہ ہمارے بڑے بھائی تھے۔ تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ وہ دیکھئے۔ اس تصویر میں وہ موسیٰ ایبک کے برابر کھڑے مُسکرا رہے ہیں۔ فیض احمد فیضؔ تو ہیں ہی۔ احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، ہاجرہ مسرور بھی ہیں۔ دو چار ادیب اور بھی ہیں جنھیں ہم شکل سے نہیں پہچانتے۔''

یہ سنتے ہی غفور جہاں گستری نے میوزیم کے انچارج کو بلایا اور ہمارا تعارف کراتے ہوئے کہا'' ان سے اس میوزیم کے شخصی اور خاندانی تعلقات ہیں۔ ان کے بڑے بھائی کی تصویر تو آپ کے میوزیم میں ہے ہی، اب یہ خود اس میوزیم میں بہ نفس نفیس آئے ہیں۔''

میوزیم کے انچارج نے ہم سے اس گروپ فوٹو میں موجود بعض ادیبوں کے بارے میں پوچھا جنھیں ہم شکل سے جانتے تھے اور ان کے نام نوٹ کر لئے۔ میوزیم میں ایک کمرہ فیض احمد فیض کے لئے بھی مختص ہے۔ معلوم ہوا موسیٰ ایبک سے فیض کے بہت گہرے مراسم تھے۔ فیض ایک بار تاشقند آئے تو موسیٰ ایبک کے مہمان ہوئے۔ جس کمرہ میں وہ مقیم تھے اسے جوں کا توں محفوظ رکھا گیا ہے۔ فیض کی تصویریں بھی آویزاں ہیں۔ ہم نے سوچا بھلے ہی ہندوستان اور پاکستان میں فیض احمد فیض کا کوئی میوزیم نہ ہو لیکن تاشقند کے ایک میوزیم میں ان کا ایک کمرہ تو مختص ہے۔ میوزیم کے صحن میں موسیٰ ایبک کا ایک دیو ہیکل مجسمہ بھی نصب ہے۔

موسیٰ ایبک میوزیم سے باہر نکلے تو ہم دفور جذبات سے مغلوب تھے۔ غفور جہاں گستری بولے'' چلئے اب میں آپ کو ازبکستان کی ترقی کی نمائش میں لے چلتا ہوں۔'' ہم انھیں کیسے سمجھاتے کہ ہم خوش حالی سے جتنا دور بھاگنا چاہ رہے ہیں وہ ہمیں خوشحالی سے اتنا ہی قریب لے جا رہے ہیں۔ راستے میں تاشقند کی کئی عظیم الشان عمارتیں اور خوبصورت مقامات نظر آئے۔ جب کوئی عالیشان اور خوبصورت عمارت نظر آتی تو غفور جہاں گستری کہتے،'' یہ عمارت ۱۹۶۶ء کے زلزلے کی دین ہے۔'' جب دس بارہ عمارتوں کے بارے میں غفور جہاں گستری نے یہی بات کہی تو ہم نے کہا'' ہمارے ملک میں زلزلہ کو قہر خداوندی سمجھا جاتا ہے۔ کیا ازبکستان میں زلزلہ

نعمت خداوندی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے ہاں زلزلہ سے عمارتیں گر جاتی ہیں، ازبکستان کے زلزلوں میں یہ عجیب بات نظر آئی کہ اس میں عمارتیں گرنے کے بجائے زمین کے اندر سے نمودار ہو جاتی ہیں۔''

غفور جہاں گستری بولے'' یہ آپ سے کس نے کہا کہ ہمارے ہاں زلزلوں میں عمارتیں نہیں گرتیں۔ عمارتیں گرتی ہیں تبھی تو ہم نے نئی عمارتیں تعمیر کی ہیں۔ اگر پرانی عمارتیں نہ گرتیں تو نئی عمارتیں کہاں سے آتیں۔''

۲۶/اپریل ۱۹۶۶ء کو تاشقند میں زلزلہ کا پہلا تباہ کن جھٹکہ آیا تھا جس نے شہر کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ آن کی آن میں تاشقند کے ستر ہزار خاندان بے گھر ہو گئے۔ تقریباً اٹھارہ مہینوں تک تاشقند میں زلزلہ کے جھٹکے محسوس ہوتے رہے جن کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے بھی زائد تھی۔ سوویت یونین کے کونے کونے سے پچاس ہزار رضا کار ساز و سامان کے ساتھ تاشقند پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے شہر کو نئی اور خوبصورت عمارتوں کے ساتھ از سرِ نو تعمیر کر دیا۔

غفور جہاں گستری تاشقند کی ساری خوبصورتی کو زلزلہ کی دین سمجھتے ہیں۔

(''سفرِ لخت لخت۔'' ۱۹۸۶)

دُنیا کے غفورو ایک ہو جاؤ

غفور جہاں گستری ہمارے دورۂ ازبکستان میں ہمارے مترجم، منتظم، میزبان، ترجمان اور نہ جانے کیا کیا تھے۔ ۲۸ رتمبر ۱۹۸۶ء کی خوشگوار صبح کو ان سے ہماری ملاقات ہوٹل ازبکستان کی لابی میں یوں ہوئی جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے۔ معلوم ہوا کہ سوویت یونین کے سب سے بڑے ادبی اشاعتی مرکز 'رادوگا' میں اُردو کے ایڈیٹر اور صدر شعبہ ہیں۔ تعارف کے بعد جب ہم نے ان کا نام پوچھا تو بولے" یہ ہیچمدان اور کمترین عوام الناس میں رخصت الائیو غفور جہاں گستری کے نام سے شناخت پذیر ہے"۔ سخن گستری سے چونکہ ہمارا پرانا تعلق ہے اس لئے جہاں گستری کی بات تو سمجھ میں آ گئی۔ لیکن رخصت الائیو ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ پوچھا" یہ رخصت الائیو کیا چیز ہے؟"

بولے" علم و دانش اور اُردو زبان و ادب کا جو ادراک مبداء فیاض سے اس ہیچمدان کو ودیعت ہوا ہے اس کی مدد سے خاکسار نے بھی اس رخصت الائیو کے سر چشمے کی تحقیق و تدقیق کرنے کی سعی و کاوش کی ہے لیکن ناکام و نامراد رہا۔ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا مشتق کیا ہے۔"

ہم نے کہا" علم و دانش اور زبان و ادب کا جو ادراک مبداء فیاض سے ہمیں عطا ہوا ہے اس کے مطابق یہ 'رخصت الائیو' یا تو 'رخصت اللہ' ہے یا 'رخصت الٰہی' ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ازبک زبان میں رخصت کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں رخصت بہت اچھی چیز ہوتی ہے جیسے رخصت اتفاقی اور رخصت خاص وغیرہ۔ ہمارے سرکاری ملازمین میں بہت مقبول ہے بلکہ ان کا من بھاتا کھاجا ہے۔ عام فہم زبان میں اسے چھٹی کہتے ہیں۔ لیکن عام فہم زبان آپ کی تو سمجھ

میں نہیں آئے گی۔ کیسے آپ کو سمجھائیں۔ ہماری دانست میں رخصت اللہ یا رخصت الٰہی کا عام سا مفہوم یہی ہے کہ یا تو اللہ نے آپ کو چھٹی دے رکھی ہے یا آپ نے اللہ کو۔''

بولے'' مہمان گرامی قدر! اس حقیر فقیر بندۂ پر تقصیر کے نام کے اسرار و رموز کو جاننے میں آپ اپنی حیاتِ جاوداں کی عزیز ساعتیں اور بیش بہا ذہانتیں کیوں ضائع کرتے ہیں۔ ناچیز کو صرف غفور کہیے۔ آپ کے ہاں بھی یہ چیز ہوتی ہے۔''

ہم نے کہا'' غفور نہ صرف ہمارے یہاں ہوتے ہیں بلکہ ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ ہمارے حیدر آباد دکن میں تو غفوروں کی ایک الگ قسم بھی پائی جاتی ہے جسے 'ڈنڈ غفور' کہتے ہیں۔ اس کی توضیح و تشریح ہم نہیں کریں گے کیونکہ ہمیں نہ صرف آپ کی دوستی بلکہ ہندروس دوستی بہت عزیز ہے۔ اس دنیا میں کوئی ساٹھ غفور تو خود ہمارے دوست ہیں۔ آپ اکسٹھویں غفور ہیں۔ یورپ میں پانچ غفورے ہیں جو ہمارے دوست ہیں۔ وسط ایشیا میں کوئی غفور ہمارا دوست نہیں تھا۔ اب خدا نے آپ کو اس منصب جلیلہ پر فائز کیا ہے۔''

ہماری بات کو سن کر غفور جہاں گستری نے خالص لکھنوی انداز میں سلام کرتے ہوئے کہا'' آپ کی ذرّہ نوازی، غفور شناسی اور غفور پروری کا شکریہ۔ مگر ہم اصل موضوع سے روگردانی کرتے جا رہے ہیں۔ مجھے سب سے پہلے رسمی طور پر آپ کا استقبال اور خیر مقدم کرنے کا زرّین اور نادر موقع عنایت کیجیے۔ آپ نے ازبکستان کی سرزمین پر قدم رنجہ فرما کر ہماری عزت و توقیر میں جو اضافہ کیا ہے اس کے لئے میں سالم و کامل صمیمِ قلب کے ساتھ آپ کی خدمتِ اقدس میں اپنے شخصی و خصوصی اور ازبک عوام کے عمومی جذباتِ تہنیت و تشکر و تبریک پیش کرتا ہوں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔''

ہمارے ہندوستانی ہم سفر اشتیاق عابدی نے دبی زبان میں ہم سے پوچھا'' مجتبیٰ بھائی! یہ غفور صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟۔''

ہم نے کہا'' بڑی تکلیف کے ساتھ کتابی اُردو میں ہمارا شکریہ ادا کر رہے ہیں''

اس کے بعد یہ معمول سا بن گیا کہ اگر ازبکی زبان میں کوئی ہم سے بات کرتا تو غفور جہاں گستری 'طلسم ہوشربا' والی اُردو میں اس کا ترجمہ ہمارے لئے کرتے اور بعد میں ہم غفور جہاں گستری کی اُردو کا ترجمہ خود اپنی اُردو میں اشتیاق عابدی کے لئے کرتے تھے۔ پتہ نہیں غفور جہاں

گستری نے یہ اُردو کہاں سے سیکھی اور کیسے سیکھی۔ اُردو کے ایسے مشکل، ثقیل اور متروک الفاظ جنھیں تیس چالیس برس میں ہم نے نہ کہیں سنا نہ پڑھا نہ لکھا اُنھیں غفور جہاں گستری کی وساطت سے ازبکستان میں سننے اور برتنے کا موقع ملا۔ ان سے مل کر نہ صرف اُردو کا مستقبل روشن نظر آیا بلکہ اس کا ماضی تو اتنا روشن نظر آیا کہ ہماری بصارت اور بصیرت دونوں چکا چوند ہو گئیں۔ معلوم ہوا کہ موصوف فیض احمد فیض سے نہ صرف مل چکے ہیں بلکہ ان سے گھنٹوں اپنی مخصوص اُردو میں تبادلۂ خیال بھی کیا ہے۔ ہم نے کہا کہ ''ہمیں پتہ ہے کہ آپ فیض احمد فیض سے مل چکے ہیں۔''

گہرے تجسس کے ساتھ پوچھا ''آپ پر یہ حقیقت کیسے منکشف ہوئی کہ خاکسار فیض احمد فیضؔ کی دلنواز صحبتِ خاص سے مستفید و فیضیاب ہو چکا ہے۔''

ہم نے کہا ''فیض کی شاعری پر آپ کی اُردو کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ آخری عمر میں بڑی مشکل شاعری کرنے لگے تھے۔ آپ سے نہ ملتے تو ان کی شاعری میں یہ موڑ کہاں سے آتا۔''

نظریں جھکا کر اور قدرے شرما کر بولے ''آپ کی غفور نوازی کا شکریہ۔'' چار دن ازبکستان میں ان کے اور ان کی اُردو کے ساتھ ایسے گزرے کہ ذہن کے نہاں خانے میں ہمیشہ محفوظ رہیں گے۔ پہلے دن تاشقند کی سیر کرا کے رات کو وہ اپنے گھر چلے گئے تو اشتیاق عابدی نے ہم سے کہا ''اب آپ اپنے بسترِ استراحت کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے سرفراز فرمائیں تاکہ نیند آپ کو اپنی پرسکون آغوش میں سمولے اور آپ اس جہانِ فانی کے آلام و مصائب نیز افکار و حوادث سے عرصۂ مختصر کے لئے ہی سہی رستگاری حاصل کر سکیں۔''

ہم نے ہنس کر کہا ''فیض کی شاعری کے بعد اب آپ کی نثر بھی غفور جہاں گستری کی اُردو سے متاثر ہونے لگی ہے۔ عابدی صاحب! سچ تو یہ ہے کہ غفور جہاں گستری سے ملکر ہمیں بے ساختہ نیل کی والدہ کی یاد آ رہی ہے۔''

اشتیاق عابدی نے حیرت سے پوچھا ''نیل کی والدہ! یہ کیا قصہ ہے؟''

ہم نے کہا ''یہ قصہ بیس برس پرانا ہے۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ تلگو کے افسانوں کا اُردو میں ترجمہ کیا جائے۔ اس کام کے لئے ایک تلگو ادیب کا انتخاب کیا گیا جو دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ جب ترجمہ ہو گیا تو یہ ترجمہ نظرِ ثانی کے لئے ہمارے پاس

آیا۔ نہایت فصیح و بلیغ ترجمہ تھا۔ ایک المیہ افسانہ تھا جس میں ایک غریب کسان کی زندگی کو پیش کیا گیا تھا۔ اس کہانی میں کسان کا نوجوان بیل مرجاتا ہے۔ منظر کچھ اس طرح کا تھا کہ نوجوان بیل مرچکا ہے۔ ایک طرف بیل کی نعش پڑی ہے، دوسری طرف کسان اُداس بیٹھا ہے اور تیسری طرف وہ گائے بھی اُداس کھڑی ہے جس نے اس بیل کو جنم دیا تھا۔ افسانے کا یہ موڑ نہایت متاثر کن تھا۔ لیکن مترجم نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے ہوئے اس منظر کو اپنی عالمانہ اُردو میں یوں بیان کیا تھا ''ایک طرف نوجوان اور نوخیز بیل کی نعش بے گور و کفن پڑی تھی اور دوسری طرف بیل کی والدہ کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔''

دوسرے دن مترجم موصوف ترجمہ کے بارے میں ہماری رائے جاننے کے لئے آئے تو ہم نے کہا ''ترجمہ تو نہایت فصیح و بلیغ ہے۔ ہمیں پسند آیا۔ لیکن ایک افسانہ میں بیل کی والدہ کا ذکر ہے۔ اس طرزِ تخاطب پر ذرا نظر ثانی کرلیں تو مناسب ہے۔''

تیسرے دن وہ ترجمہ پر نظر ثانی کر کے ہمارے پاس آئے۔ ہم نے بیل کی والدہ والا صفحہ کھولا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اب کی بار فاضل مترجم نے 'بیل کی والدہ' کو کاٹ کر 'بیل کی والدۂ محترمہ و معظّمہ' بنا دیا تھا۔

یہ تو خیر ایک لطیفہ معترضہ تھا۔ بات غفور جہاں گستری کی ہو رہی تھی۔ جتنی مشکل اُردو وہ بولتے تھے اتنے ہی سادہ انسان وہ ہمیں نظر آئے۔ جیسا کہ عام طور پر سارے غفور ہوتے ہیں۔ نہایت معصوم، مخلص، محنتی اور شریف۔ تاشقند جا کر ہی ہمیں یہ احساس ہوا کہ غفور چاہے ہندوستان میں رہیں یا یورپ میں یا وسط ایشیاء میں سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اسی لئے تو ہم مذاق میں اُنھیں یہ نیا نعرہ دے آئے ہیں کہ 'دنیا کے غفورو ایک ہو جاؤ'۔

ان کی پابندیٔ وقت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ صبح آٹھ بجے آنے کا وعدہ کر جاتے تھے تو ٹھیک سات بجکر انسٹھ منٹ پر دروازے پر ان کی دستک سنائی دیتی تھی۔ چونکہ انھیں معلوم تھا کہ ہم ادیب ہیں اسی لئے ایسی جگہوں پر لے جاتے تھے جو ادیبوں کی دلچسپی کا سبب بنیں۔

پہلے دن لینن چوک کی سیر کرا چکے تو کہنے لگے ''اب میں آپ کو باغ شعراء لے چلتا ہوں جو علی شیر نوائی تھیٹر کے آگے واقع ہے۔'' ہم نے کہا ''غفور صاحب! مانا کہ ہم ادیب ہیں لیکن شاعروں سے نہ صرف گھبراتے ہیں بلکہ حتیٰ الامکان بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سوویت یونین کا

دورہ بھی اس لئے کر رہے ہیں کہ کچھ دن کے لئے ہی سہی اُردو کے شاعروں سے ہماری جان چھوٹے اور ہم مکرر ارشاد اور سبحان اللہ کہنے سے بچے رہیں۔ آپ تو یہاں بھی ہمیں 'باغ شعراء' میں لے جا رہے ہیں۔ کہیں کسی شاعر نے ہمیں کلام سنا دیا تو؟۔ اور اگر اس کا کوئی شعر غلطی سے سمجھ میں آ گیا تو؟''

غفور جہاں گستری بولے'' آپ خوفزدہ نہ ہوں۔ میں آپ کو ان مُردہ شاعروں کے پاس لے جا رہا ہوں جو امر ہو چکے ہیں۔'' ہم نے پوچھا'' کیا مطلب؟''

بولے'' باغ شعراء میں ہمیں زندہ شاعر نہیں ملیں گے۔ اس باغ میں ازبکستان کے سارے عظیم المرتبت شاعروں کے مجسمے آپ کو دیکھنے کو ملیں گے۔''

ہم نے کہا'' کیا آپ کے ہاں بھی پانی کی اتنی ہی قلت ہوتی ہے کہ حکومت ہم جیسے ادیبوں اور فنکاروں کے مجسمے نصب کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔''

بولے'' ازبکستان میں خیر اب تو پانی کی قلت نہیں ہے لیکن کسی زمانے میں ازبکستان میں پانی اتنا نایاب ہوا کرتا تھا کہ ہمارے لوک ادب میں پانی کے ایک قطرہ کو موتی کے ایک دانہ سے زیادہ قیمتی بتایا جاتا تھا۔ لیکن مجتبیٰ صاحب! ہماری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔ پانی کی قلت سے ادیبوں کے مجسموں کا کیا تعلق ہے؟''

ہم نے کہا'' بہت گہرا تعلق ہے۔ ہمارے ہاں جب بھی پانی کی قلت ہو جاتی ہے تو حکومت عوام کی پیاس بجھانے اور ان کا کلیجہ ٹھنڈا کرنے کے لئے ادیبوں اور فنکاروں کے مجسمے کھڑا کر دیتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں ہمارا تعلق جس ریاست سے ہے وہاں لوگ بوند بوند پانی کے لئے ترس رہے ہیں اور حکومت عوام پر فنکاروں کے مجسموں کی بارش برسا رہی ہے۔ ہماری ریاستی حکومت کا خیال ہے کہ جب سارے فنکاروں کے مجسمے نصب ہو جائیں گے تو ان حساس فنکاروں کے مجسموں کی آنکھوں سے عوام کی بے بسی اور مجبوری پر اتنے آنسو بہہ نکلیں گے کہ ساری ریاست میں سیلاب آ جائے گا۔''

غفور جہاں گستری کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آسان بات یوں بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بولے'' ہماری حکومت عوام کا کلیجہ اس طرح ٹھنڈا نہیں کرتی۔ خیر میں آپ کے ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرنا چاہتا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی ریاستی سرکار ٹھیک ہی

کر رہی ہو۔''

خیر تھوڑی دیر بعد ہم باغ شعراء میں تھے۔ ایسی خوبصورت اور پُر فضا جگہ ہے کہ ہم جیسے شاعر دشمن کا جی بھی شعر گوئی کی طرف مائل ہونے گا۔ شاعروں کے کیسے باوقار اور پرشکوہ مجسمے ہیں۔ علی شیر نوائی، لطفی، نادرہ، مولانا مقیمی، ظہیر الدین فرقت، حکیم زادہ نیازی، عبداللہ قادری، حمید عالم جان، غفور غلام اور موسیٰ ایبک اپنے اپنے ڈھنگ سے کھڑے ہیں۔ پاس ہی ایک گوشے میں بڑی سی پگڑی باندھے ایک مجسمہ کھڑا تھا۔ ہم نے پوچھا '' آپ کی تعریف؟''

غفور جہاں گستری بولے'' یہ بابور ہے بابور۔ ازبکستان کا مشہور عالم اور شاعر۔ اس کے 'بابرنامہ' کا ذکر تو آپ نے سنا ہوگا''۔

یہ سنتے ہی ہمارا سر تعظیماً جھک گیا اور ہم نے غفور جہاں گستری سے کہا'' غفور صاحب! خبردار، باادب باملاحظہ ہوشیار۔ آپ جس بابور کا ذکر یوں سرسری طور پر کر رہے ہیں وہ ہمارے سلطان ابن سلطان ، خاقان ابن خاقان، بانی سلطنت مغلیہ، گیتی پناہ، شہنشاہ ہندوستان، ظل سبحانی، اعلیٰ حضرت ظہیر الدین محمد بابر ہیں۔ کم از کم ان کا نام تو احترام سے لیجئے۔ یہ ہمارے حکمران رہ چکے ہیں۔''

غفور جہاں گستری بولے'' ہوں گے آپ کے حکمران۔ مگر یہاں تو بابور دلوں پر حکمرانی کرتا ہے۔ اس کے شعر کا سکہ چلتا ہے اور اس کے علم کا ڈنکا بجتا ہے۔''

سوویت یونین میں ادیبوں اور فنکاروں کی جو عزت ہے اسے دیکھ کر ہم کچھ اور بھی احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے۔ شاہراہیں ان کے نام سے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیاں فنکاروں کے ناموں سے منسوب ہیں۔ تاشقند کے کئی اسٹیشنوں کے نام بھی شاعروں ہی کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ ہم نے غفور جہاں گستری سے پوچھا'' اتنے دیو ہیکل اور بھاری مجسموں کی تیاری پر کتنا خرچ آتا ہوگا۔''

بولے'' ایک ایک مجسمہ پر کئی کئی ہزار روبل خرچ آتا ہے؟۔'' ہم نے کہا'' اگر آپ ازراہِ ادب نوازی ہمیں بھی روزانہ صرف دس روبل دیا کریں تو ہم خود بہ نفس نفیس بطور مجسمہ آپ کے باغ شعراء میں کھڑے ہونے کو تیار ہیں۔ اتنا سستا مجسمہ آپ کو نہیں ملے گا۔''

ہمیں غفور جہاں گستری پر اس وقت غصہ آیا جب انھوں نے ہماری پیشکش کو ہنس کر ٹال

دیا۔ بولے ’’اپنے ملک میں پانی کی قلت کی دعا کیجئے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دن خود آپ کے شہر میں آپ کا مجسمہ کھڑا ہو جائے۔‘‘ اور ہم نے بات کو کاٹ کر کہا ’’جس پر تھکے ماندے پرندے بیٹھ کر بیٹ کرتے رہیں گے‘‘۔

ازبکستان میں پہلے ہی دن سے وہ ہماری صحت کے بارے میں ضروری اور غیر ضروری ہدایتیں دیا کرتے تھے۔ ہمیں چھینک بھی آجاتی تو ان کا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ کہتے تھے آپکو ازبکستان سے ماسکو اور لینن گراڈ بھی جانا ہے۔ ماسکو پہنچنے تک آپ کی صحت کو ٹھیک رکھنے کی ذمہ داری میری ہے۔ اسی لئے اپنی صحت کی حفاظت کیجئے۔ بخارا کی سیر سے ہم دوبارہ تاشقند واپس آنے لگے تو اچانک بخارا کا موسم بے حد سرد ہو گیا۔ لوگوں کا بیان تھا کہ پچھلے پچاس برس میں ایسا موسم دیکھنے کو نہیں ملا۔

ہم رات کو چھوٹے سے ہوائی جہاز کے ذریعہ بخارا سے تاشقند آئے۔ پون گھنٹے کی پرواز میں وہ بار بار ہمارا حال پوچھتے رہے کہ بخارا کے موسم سے کہیں آپ کو بخار تو نہیں آرہا ہے، آنکھوں میں کہیں جلن تو نہیں ہو رہی ہے۔ اشتیاق عابدی نے ہوائی جہاز میں کھانسنا شروع کیا تو بے چین سے ہونے لگے۔ رات کو ہمیں ہوٹل پر چھوڑ کر جانے لگے تو بولے ’’بخارا کے سرد اور غیر متوقع موسم کے لئے میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ یہ میرے اختیار میں نہیں تھا کہ بخارا کو اس موسم سے اور اس موسم کو آپ سے بچاتا۔ کل تاشقند میں آپ کا بے حد مصروف آخری دن ہے۔ کئی جلسوں میں آپ کو شرکت کرنی ہے اور خطاب بھی کرنا ہے۔ اپنی صحت کو ٹھیک رکھئے اور ہو سکے تو اپنی اپنی تقریروں کی تیاری بھی کر لیجئے۔ میں صبح آٹھ بجے کمرے پر آجاؤں گا۔‘‘

اس بار اشتیاق عابدی کو اور ہمیں ایک بڑے ڈبل بیڈ والے کمرہ میں ٹھہرایا گیا۔ ہم تو حسبِ عادت گھوڑے بیچ کر سو گئے۔ صبح پانچ بجے ہماری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اشتیاق عابدی اپنے بستر میں پڑے ہند۔ روس دوستی کے موضوع پر بہ آواز بلند تقریر کر رہے ہیں۔ ہم نے سوچا ہمیں سوتا دیکھ کر یہ چوری چوری اپنی تقریر کی تیاری کر رہے ہیں۔ ہم بھی کچھ کم چالاک نہیں ہیں۔ بڑی آہستگی کے ساتھ میز پر سے قلم اور کاغذ اٹھایا اور لگے ان کی تقریر کے اہم نکات کو نوٹ کرنے۔ اشتیاق عابدی کہے چلے جا رہے تھے ’’ہند۔ روس دوستی کے بغیر عالمی امن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ روس کی دوستی وقت کی کسوٹی پر پرکھی ہوئی دوستی ہے۔ سوویت یونین نے کب کب اور

کہاں کہاں اور کیسے کیسے کٹھن وقت میں ہماری مدد کی ہے۔ میری اماں۔ میری اماں۔ (کراہنے کی آواز)۔'' تقریر تو ان کی بہت مدلّل اور اثر انگیز تھی مگر یہ درمیان میں ''میری اماں۔ میری اماں'' کی تکرار نے ہمیں تشویش سی ہوئی۔ دبے پاوں اُن کے قریب جا کر اُن کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو یوں لگا جیسے ہم نے جلتے ہوئے توے پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ہم نے انھیں جگانے کی کوشش کی تو ایک عجیب سی بحرانی کیفیت میں پوچھا ''کون ہے؟''

ہم نے کہا ''آپ کا دوست ہوں مجتبیٰ۔''

کروٹ بدلتے ہوئے بولے ''کوئی مجتبیٰ میرا دوست نہیں ہے۔ سوویت یونین ہی میرا واحد دوست ہے۔ مجھے سوویت یونین کی دوستی پر فخر ہے۔ میری اماں۔ میری اماں۔''

ہم نے تاڑ لیا کہ معاملہ سنگین ہو گیا ہے۔ دیارِ غیر میں کس سے مدد طلب کریں اور طلب کریں بھی تو کس زبان میں۔ ہم جس زبان میں اپنا مدعا یا مرض کی کیفیتیں بیان کرتے ہیں اس کے جاننے والے تو غفور جہاں گستری ہی ہیں جو دو ڈھائی گھنٹوں بعد آئیں گے۔ ہندوستان سے ہم مختلف النوع امراض کی جو دوائیں اپنے ساتھ لے گئے تھے وہ اشتیاق عابدی کو دیں۔ مگر ان کی ہند۔ روس دوستی میں کوئی افاقہ نہ ہوا بلکہ آخر میں تو امریکہ کو کھلم کھلا گالیاں تک دینے لگے۔ ٹھیک سات بجکر اُنسٹھ منٹ پر غفور جہاں گستری آئے تو ہم نے انھیں سارا ماجرا کہہ سنایا۔ یہ سنتے ہی غفور جہاں گستری پسینہ میں شرابور ہو گئے۔ چکرا کر گرنے ہی والے تھے کہ ہم نے انھیں تھام لیا اور کہا ''ہمارے یہاں آدابِ تیمارداری ایسے نہیں ہوتے۔ تیماردار کو کٹھور دل کا ہونا چاہیئے۔'' غفور جہاں گستری نے ہماری کوئی بات نہیں سنی اور اچانک کمرہ سے چلے گئے۔ پانچ ہی منٹ بعد وہ دو عدد لیڈی ڈاکٹروں، تین عدد نرسوں اور ایک اسٹریچر کے ساتھ نمودار ہوئے۔ ڈاکٹروں نے اشتیاق عابدی کا معائنہ شروع کر دیا تو یہ پسینہ پونچھتے ہوئے بولے ''میں نے سارے انتظامات کر لیے ہیں۔ نیچے ایمبولینس گاڑی بھی کھڑی ہے۔''

ہم نے کہا ''اور اس کے بعد کے انتظامات کے بارے میں بھی کہہ دیا ہوگا۔''

انھوں نے ہماری بات سنی ان سنی کر دی۔ انھیں ہماری بات سننے کا ہوش ہی کہاں تھا۔ اشتیاق عابدی کے نا، نا کرتے لیڈی ڈاکٹروں نے ان کے دونوں کولہوں پر دو انجکشن داغ دیئے اور کہا ''دو گھنٹوں کے اندر اگر انھیں پسینہ آ گیا تو تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو

جائے گا۔'' پروگرام کے مطابق دس بجے ادارہ شرقیات میں ہمارا خیر مقدم تھا۔ نرس کو اشتیاق عابدی کے پاس چھوڑ ہم اکیلے ہی سوئے مقتل چلے۔ اشتیاق عابدی سے کہا '' آپ فکر نہ کریں۔ ہم سنبھال لیں گے۔ ہندوستان کی طرف سے اچھی سی تقریر بھی کر دیں گے۔ رات کو آپ کی تقریر تو ہم نے سن ہی لی ہے۔ اس میں سے 'میری اماں۔ میری اماں' کو نکال کر باقی تقریر کر دیں گے''

دو گھنٹے بعد ہم واپس آئے تو اشتیاق عابدی بدستور تقریر کئے جا رہے تھے اور پسینہ کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ اب غفور جہاں گستری کی پریشانی بے قابو ہو گئی اور وہ پسینہ میں شرابور ہونے لگے۔ وحشت سے بولے '' شومئ قسمت سے یہ بہت بُرا ہو رہا ہے۔ ہم تاشقند میں ہندوستانی مہمانوں کے تعلق سے بہت فکر مند رہتے ہیں۔ اگر عابدی صاحب کو فوراً پسینہ نہ آیا تو ہم انھیں ماسکو نہیں جانے دیں گے۔ یہیں اسپتال میں داخل کرا دیں گے۔ آپ ماسکو چلے جایئے۔ یوں بھی ان کا تاشقند سے ہندوستان واپس جانا زیادہ آسان ہے بہ نسبت اُن کے ماسکو سے ہندوستان جانے کے۔''

یہ سنتے ہی اشتیاق عابدی رضائی پھینک کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے جسم سے پسینہ کا وہ سیلاب اُمڈا کہ اسی سے غسل صحت فرمانے لگے۔ معصومیت میں لپٹی ہوئی غفور جہاں گستری کی سچ بات کا یہ ادنیٰ سا کرشمہ تھا۔ اشتیاق عابدی کو پسینہ میں شرابور دیکھ کر غفور جہاں گستری کے چہرے پر سکون اور مسرت کے وہ آثار دکھائی دیئے جو عموماً ایک بچہ کو جنم دینے کے بعد ماں کے چہرے پر دکھائی دیتے ہیں۔

(''سفرِ لخت لخت۔'' ۱۹۸۶)

پھر وہی مسقط کے رات دن

صاحبو! 1980 سے 1990 تک ہم نے کئی ملکوں کی خوب خاک چھانی ۔ جاپان ، یوروپ ، امریکہ ، کناڈا ، روس ، سعودی عرب اور پاکستان نہ جانے کہاں کہاں گئے ۔ لوگوں کو حسبِ توفیق گمراہ کرنے کے لئے ہم نے حسبِ عادت سفرنامے بھی لکھے جو خلافِ توقع مقبول بھی ہوئے ۔ اس کے بعد ہم نے ملک سے باہر قدم نہیں نکالا ۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہم میں اچانک 'حب الوطنی' کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا جو عمر کے تقاضہ کی وجہ سے آدمی میں عموماً پیدا ہو جاتا ہے ۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ملکوں ملکوں گھومنے کے بعد ہمیں یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ انسان چاہے کسی بھی براعظم میں رہے ، کم وبیش وہی حرکتیں کرتا ہے ۔ تیسری اور اہم وجہ یہ تھی کہ اُردو کے ادیب ہونے کے ناتے ہم اُس وقت تک رختِ سفر نہیں باندھتے جب تک کہ ہمارے اخراجاتِ سفر کوئی دوسرا برداشت نہ کرے ۔ بیرون ملک کی بات تو چھوڑیئے ہم تو اندرون ملک بھی (حیدرآباد کو چھوڑ کر) کسی اور شہر میں اپنے پلّے سے کرایہ ادا کر کے نہیں گئے ۔ ایسا نہیں ہے کہ اس عرصہ میں بیرونی ملکوں سے ہمارے لئے بلاوے نہیں آئے ۔ آئے تھے ضرور لیکن ہم نہیں گئے ۔ ۔ ہم نے سوچا کہ کیوں نہ اپنے ہی ملک کو 'بیرونی ملک' بنانے کی کوشش کی جائے یعنی اسے بھی ترقی یافتہ بنادیں ۔ مگر یہ کام بھی ہم سے نہ ہو سکا ۔ ہم اکیلے کر بھی کیا سکتے ہیں ۔ لوگوں نے سمجھایا کہ مرزا غالب بھی عمر کے آخری حصہ میں فرصت کے رات دن کے متلاشی رہتے تھے ۔ تمہیں بھلے ہی فرصت نہ ملے مگر مسقط تو موجود ہے ۔ وہیں چلے جاؤ ۔ یوں بھی اب ہم آئے دن کے مسئلوں سے بیزار ہو چکے ہیں ۔ آخر

کہاں تک ان مسئلوں کا حل ڈھونڈتے پھریں۔ ہمارے وزیر اعظم مسٹر نرسمہا راؤ کو ہی دیکھئے کہ جب بھی ملک کے مسئلوں سے تنگ آجاتے ہیں تو کسی بیرونی سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ ان کی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں کتنے مسئلے پیدا ہوئے اور انھوں نے کتنے بیرونی دورے کیے۔ تاہم وزیر اعظم کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ مسئلے حل نہ کریں تو تب بھی بیرونی سفر پر جاسکتے ہیں۔ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ جب تک بال بچوں کی ضروریات پوری نہ کریں، بجلی اور ٹیلی فون وغیرہ کا بل نہ ادا کریں تب تک ملک سے تو کجا گھر سے باہر بھی قدم نہیں نکال سکتے۔

تاہم ادھر جب سے مسقط میں تیل دریافت ہوا ہے اور جب سے ہمارے دوست ہمایوں ظفر زیدی، مسقط میں جاکر پھر سے آباد ہوئے ہیں تب سے ہمیں شبہ سا ہونے لگا تھا کہ بڑے ہوکر ایک نہ ایک دن ہم مسقط ضرور جائیں گے۔ ہمایوں ظفر زیدی سے لگ بھگ بیس برس پہلے علی گڑھ میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد تھے اور علی گڑھ یونیورسٹی کے انگریزی کے استادوں کی روایت کے مطابق انگریزی کے مقابلہ میں اُردو کے معاملات سے زیادہ سروکار رکھتے تھے۔ یہ تو پتہ نہیں کہ انگریزی میں شعر کہتے ہیں یا نہیں مگر ان کے اُردو کے شعر تو خود ہم نے اپنے کانوں سے سُنے اور آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ اُردو کے بہت اچھے شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ہر کسی کو اپنے شعر نہیں سناتے۔ ہمارے پاس اچھا شاعر ہونے کی یہی کسوٹی ہے۔ اُردو ادیبوں اور شاعروں کی صحبت میں رہنے کے یہ سو سو جتن کرتے ہیں۔ ان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ایلزبتھ ٹیلر نے جتنے شوہر بدلے ہیں ان سے کہیں زیادہ نوکریاں انھوں نے بدلی ہیں۔ کبھی ایک نوکری پر قانع نہیں رہے۔ ہمیں تو اب یہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ پچھلے بیس برسوں میں کیا کیا کرتے رہے۔ البتہ پچھلے سات آٹھ برسوں میں وہ کئی بیرونی ملکوں میں رہے اور ماشاء اللہ پچھلے تین چار برسوں سے مسقط میں مقیم ہیں۔ ایک جگہ پر ٹک کر رہنے کا اُن کا یہ سب سے لمبا ریکارڈ ہے۔ اس میں بھی خوبی ان کی نہیں مسقط کی نظر آتی ہے۔ اس عرصہ میں وہ جب بھی ہندوستان آئے ہم سے خواہش کی کہ ہم مسقط ضرور آئیں۔ ادبی محفلیں سجانے کا انہیں بے حد شوق ہے۔ چنانچہ مسقط میں بھی ایک ادبی انجمن قائم کر رکھی ہے۔ ہمیں عرصہ سے مسقط بلا رہے ہیں۔ ایک بار بلایا تو ہم نے ٹالنے کے لئے کہہ دیا کہ ہماری بجائے خوشونت سنگھ کو بلائیے۔ چنانچہ خوشونت سنگھ کو بلایا۔ دوسری بار بلایا تو ہم نے ایک اور شخصیت کا نام

تجویز کردیا۔ انھیں بھی انھوں نے بُلا لیا۔ تیسری بار بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ چوتھی بار بُلایا تو بولے ''اب شرعی اعتبار سے کوئی عذر قابل مسموع نہ ہوگا۔ اس بار آپ کسی کو قربانی کا بکرا نہیں بنائیں گے۔ بلکہ خود قربان ہو جائیں گے۔'' سو اب ہم 'قربان' ہونے کے لئے مسقط جا رہے ہیں جہاں انھوں نے اُردو مزاح نگاروں کی ایک محفل کا اہتمام کیا ہے جس میں ہندوستان اور پاکستان کے چند منتخب مزاح نگاروں کو مدعو کر رکھا ہے۔ پچھلے تین دہوں میں جب سے خلیجی ممالک میں تیل دریافت ہوا ہے تب سے ان ممالک کا جو فائدہ ہوا سو ہوا ہی، اُردو کے ادیبوں اور بالخصوص شاعروں کا بھی خاصا فائدہ ہوا ہے۔ اب یہ مشاعرے پڑھنے کے لئے پیلی بھیت، اٹاوہ اور رامپور نہیں جاتے بلکہ سیدھے دوبئی، قطر، دمام، ابوظہبی اور جدّہ وغیرہ جانے لگے ہیں۔ ماشاءاللہ اب تو اُردو کے شاعر، مشاعروں کی تاریخوں اور ان سے ملنے والے معاوضوں کا حساب کتاب بھی کمپیوٹر کی مدد سے رکھنے لگے ہیں۔ ہم نے اُردو کے کئی شاعروں کے گلوں میں سونے کی زنجیریں بھی دیکھی ہیں جب کہ آزادی سے پہلے اُردو شاعروں کے پاووں میں لوہے کی زنجیریں ہوا کرتی تھیں۔ کپڑے بھی اب وہ ماشاءاللہ اچھے پہننے لگے ہیں اور ان کپڑوں پر اچھے اچھے سینٹوں کا چھڑکاؤ بھی کرنے لگے ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں اُردو شاعری نے بھلے ہی ترقی نہ کی ہو لیکن اُردو کے شاعروں نے ضرور ترقی کی ہے۔ گویا اب ان کی پرسنالٹی نکل آئی ہے۔ ہم اُردو کے ایک 'خلیج یافتہ' شاعر سے واقف ہیں جو ہفتہ کے ساتوں دنوں میں وقت دیکھنے کے لئے سات مختلف گھڑیوں کا استعمال کرتے ہیں۔ پہلے بیڑی پیتے تھے (اور وہ بھی مانگ کر) لیکن اب ڈن ہل سے کم تر درجہ کا سگریٹ پینے پر راضی نہیں ہوتے۔ یہ سب خلیجی ممالک کی دین ہے۔ خلیجی ممالک میں جب سے اُردو کی نئی بستیاں آباد ہوئی ہیں تب سے حکومت ملک میں خلیجی ممالک سے تیل کو 'درآمد' کرنے میں لگی ہوئی ہے اور شاعر حضرات اپنی شاعری کو 'برآمد' کرنے میں مصروف ہیں۔ ہم نے خلیجی ممالک کے بعض مشاعروں کے ویڈیو کیسٹ دیکھے ہیں۔ ہماری ہی طرح کے مشاعرے ہوتے ہیں صرف ایک کمی نظر آتی ہے اور وہ ہے 'ہوٹنگ' کی۔ ان کیسٹوں میں خلیجی ممالک کے سامعین ایسے صابر و شاکر نظر آئے کہ بُرے سے بُرے شعر کو بھی ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں۔ پیسہ ہو تو آدمی میں صدمہ کو جھیلنے کی سکت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ خلیجی ممالک کے سامعین اپنی جیب سے پیسہ خرچ کر کے شعراء کو مدعو کرتے ہیں۔ انھیں پتہ ہے کہ

'ہوٹنگ' کریں گے تو تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی جو اُردو کلچر انھیں میسر آرہا ہے اور جس کے لئے وہ ترستے رہتے ہیں اس سے وہ محروم ہو جائیں گے۔ اس اعتبار سے بھی خلیجی ممالک کے مشاعرے بُرے شاعروں کے لئے ایک نعمت مترقبہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

اب تو ماشاء اللہ خلیجی ممالک میں اُردو شاعروں کے جشن بھی منائے جانے لگے ہیں۔ وطن عزیز میں تو اب اُردو شاعروں کے جشن منانے کی روایت ختم سی ہوتی جارہی ہے۔ یوں بھی خلیجی ممالک میں جس اہتمام سے اُردو شاعروں کے جشن منائے جانے لگے ہیں وہ اہتمام وطن میں کہاں سے میسر آئے گا۔ اب بڑی مشکل سے دو چار ہی ایسے نامور اور خوش قسمت شاعر باقی رہ گئے ہیں جن کے جشن خلیجی ممالک میں نہیں منائے گئے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ دو ایک برسوں میں یہ باقی ماندہ شاعر بھی خلیجی ممالک سے 'جشن یافتہ' ہو کر نکلیں گے۔ اس کے بعد تیل تو ہوگا مگر جشن کے چراغوں میں روشنی نہ ہوگی۔

تاہم یہ غنیمت ہے کہ اُردو کا بجھتا ہوا چراغ خلیجی ممالک کے تیل کی مدد سے پھر سے بھڑک اُٹھا ہے۔ اب ہم مسقط جارہے ہیں تو ہمیں احساس ہے کہ ہم اُردو کی ایک نئی بستی کی طرف جارہے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ خلیجی ممالک میں اُردو کی یہ نئی بستیاں اُس وقت تک تو ضرور پھلیں پھولیں جب تک کہ ہم جیسوں کے بھی 'جشن' کی باری نہ آجائے۔

(''سیاست'' ۲۴ر دسمبر ۱۹۹۵ء)

☆☆

مسقط کی صفائی اور قصّہ اُردو شاعر کا

خلیج میں ہمارا سب سے زیادہ قریبی ملک عمان ہی ہے۔اس قربت کی وجوہات جہاں جغرافیائی ہیں وہیں سماجی، تجارتی اور سیاسی بھی ہیں۔(ادبی وجوہات کا ذکر بعد میں آئے گا)۔ عمان برسوں انگریزوں کی زیرنگرانی علاقہ رہا ہے اور جب تک انگریز ہندوستان پر حکومت کرتے رہے اس کے بہت سے اُمور دلی ہی میں طئے پاتے رہے۔ ہندوستان سے عمان کی جغرافیائی قربت کو دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ ہم دہلی سے ایک گھنٹہ پندرہ منٹ میں احمد آباد پہنچے تھے اور یہاں سے عمان کی طرف چلے تو دو گھنٹوں کے اندر اندر ہی عمان کے دراالخلافہ مسقط جا پہنچے۔یوں لگا جیسے ہم دہلی سے حیدرآباد آئے ہوں۔مسقط کے عالیشان اور خوبصورت ہوائی اڈہ پر اُترے تو رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے اور مسقط کا ہوائی اڈہ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ہم نے تھوڑی بہت دنیا پہلے بھی دیکھ رکھی ہے۔خلیجی ممالک میں بھی جا چکے ہیں۔مسقط کی وسیع، کشادہ اور آرام دہ سڑکوں پر ہمارے میزبان ہمایوں ظفر زیدی کی گاڑی دوڑنے لگی تو اندازہ ہوا کہ ایسا صاف ستھرا اور خوشنما شہر ہم نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔شہر کیا ہے کسی باذوق رئیس کا سجا سجایا ڈرائینگ روم لگتا ہے۔اس بے پناہ صفائی کی وجہ ہم نے پوچھی تو ہمایوں ظفر زیدی نے کہا کہ اس صفائی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عمان کے بادشاہ سلطان قابوس کو آرائش وزیبائش کا بے پناہ شوق ہے اور ان کی جمالیاتی حِس بہت تیز ہے۔ جیسا راجہ ویسی پرجا کا اصول تو آپ جانتے ہی ہیں۔لہٰذا سارے عمانی نفاست پسند بن گئے ہیں۔ہم نے کہا ''مگر یہاں ہم جیسے غیر عمانی بھی تو آتے رہتے ہیں''۔

بولے ''آپ جیسے لوگوں کے لئے حکومت نے ایک قانون بنا رکھا ہے کہ جو کوئی بھی اس شہر میں غلاظت پھیلاتا ہے اس پر پچاس ریال کا جرمانہ عائد کیا جاتا ہے۔'' (عمان کا ریال لگ بھگ نوے روپیوں کا ہوتا ہے اور یوں جرمانہ کی رقم 4500 سو روپے قرار پاتی ہے)۔اس پر انھوں نے ایک واقعہ سنایا کہ اُردو کے ایک شاعر کو 60 ریال معاوضہ دے کر مسقط بلایا گیا تھا۔شاعر سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ بھلے ہی اُردو شاعری اور مشاعروں میں غلاظت پھیلاتا رہے لیکن مسقط میں کوئی غلاظت نہ پھیلائے اور حفظِ ماتقدم کے طور پر ہمیشہ اپنے ساتھ پچاس ریال رکھا کرے کہ پتہ نہیں کب جرمانہ ادا کرنے کی نوبت آجائے۔شاعر نے اس نصیحت کو اور پچاس ریال کو اچھی طرح گرہ میں باندھ لیا۔باقی دس ریال میں کچھ چھوٹا موٹا سامان خریدا۔کچھ پان بھی خرید لئے کہ اُردو شاعر پان نہ کھائے تو اس کی شاعری بدرنگ اور بے مزہ لگتی ہے۔لیکن شاعر جب پان کھاتا ہے تو اس کی پیک تھوکتا بھی ہے۔اور بعض شاعر تو ایسا فی البدیہہ تھوکتے ہیں کہ ان کے تھوکنے پر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔شاعر مذکور کو ایک مرحلہ پر یہ یاد نہیں رہا کہ وہ لکھنؤ میں نہیں بلکہ مسقط میں ہے۔ چنانچہ اس نے چلتی گاڑی میں سے پان کی پیک اچانک سڑک پر منتقل کی تو عمان کی پولس نے اسے دھر لیا اور پچاس ریال کی وہ رقم، جو مشاعرہ پڑھنے کے لئے بطور معاوضہ اُسے دی گئی تھی، بطور جرمانہ وصول کر لی۔بعد میں شاعر نے منتظمین کے آگے منت سماجت کی کہ اسے تھوکنے کے جرمانہ کے علاوہ مشاعرہ پڑھنے کا معاوضہ الگ سے دیا جائے۔منتظمین چونکہ اُردو تہذیب سے واقف تھے اس لئے شاعر پر ترس کھا کر مشاعرہ پڑھنے کا معاوضہ الگ سے دیدیا۔لیکن مشکل یہ ہوئی کہ بعد میں جتنے شاعر مسقط آئے انھوں نے یہ مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ انھیں مشاعرہ پڑھنے کے علاوہ تھوکنے کا معاوضہ بھی دیا جائے۔اس واقعہ کے پس منظر میں ہمایوں ظفر زیدی نے ہمیں تاکید کی کہ تھوکنے وغیرہ کے معاملہ کو ہم وطن عزیز کو واپس ہونے تک موقوف رکھیں۔چار دن کی تو بات ہے اس کے بعد تھوکنے کے لئے تو بچی کھچی ساری عمر پڑی ہے۔اس واقعہ کا ہم پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ تھوکنا تو تھوکنا سانس لینا تک دوبھر محسوس ہونے لگا۔

مسقط کی صفائی تو اب سارے عالم میں مشہور ہے۔اس کی کسی بھی شاہراہ سے گذر جائیے تو یوں لگتا ہے جیسے وہ آپ کے پہنے ہوئے لباس سے کہیں زیادہ صاف ستھری ہے۔عمان کی صفائی کی ایک وجہ تو یہ بھی ہے کہ تین لاکھ مربع کیلومیٹر کے رقبہ پر پھیلے ہوئے اس ملک میں مقامی

آبادی صرف بیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ عمان کی ساری ترقی کی داستان 1970ء سے شروع ہوتی ہے جب عمان کے موجودہ حکمران سلطان قابوس تخت نشین ہوئے۔ سلطان قابوس نے انگلستان میں تعلیم حاصل کی۔ پھر وہ ایک کیڈیٹ کے طور پر سندھرسٹ کی رائل ملٹری اکیڈیمی سے وابستہ ہوئے۔ مشرقی روایات کی پاسداری اور جدید مغربی تعلیم کے امتزاج نے ان کے مزاج میں ایک ایسا سلیقہ پیدا کر دیا ہے جس کی جھلک مسقط کی ہر عمارت، ہر شاہراہ اور اس کے ہر چوراہے پر دکھائی دیتی ہے۔ تخت نشینی کے فوراً بعد اُنھوں نے نہایت منصوبہ بند انداز میں تیل کے ذخائر سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے ملک کی ترقی کا خواب دیکھا۔ مسقط میں آج جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ پچیس برس پہلے تک نہیں تھا۔ پچیس برس پہلے مسقط میں صرف آٹھ کیلومیٹر لمبی ایک پکی سڑک تھی۔ اب سارے عمان میں ہزاروں کیلومیٹر لمبی شاہراہوں کا جال پھیل گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ خلیج کے امیر ملکوں میں عمان کو اب بھی ایک غریب ملک سمجھا جاتا ہے۔

ہمارا قیام مسقط کے نواحی علاقہ الخویر میں تھا۔ دوسرے دن صبح میں جب ہم الخویر سے مسقط کے مرکزی علاقہ کی طرف روانہ ہوئے تو ہمیں بتایا گیا کہ جس سڑک سے ہم گذر رہے ہیں وہ دنیا کی سب سے قیمتی سڑک ہے۔ قیمتی اس اعتبار سے کہ اسے جگہ جگہ واقع اونچی اونچی پہاڑیوں کو کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ جس طرح اس وسیع و کشادہ سڑک کو تعمیر کیا گیا ہے اسے دیکھ کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ مسقط کی طرف جاتے ہوئے ہمارا گذر مطرح کی بندرگاہ سے ہوا جو عمان کی سب سے مشہور بندرگاہ ہے۔ ایسی خوبصورت اور دلفریب بندرگاہ ہے کہ اسے دیکھ کر ہی آدمی سرشار ہو جاتا ہے۔ سمندر ہم نے بہت سے دیکھے ہیں لیکن نیلے پانیوں والا ایسا صاف و شفاف سمندر ہم نے کہیں نہیں دیکھا۔ ایسا صاف ستھرا سمندر ہے کہ لگتا ہے یہاں بھی تھوکنے پر پابندی ہے۔ پرانا مسقط بھی اب ویسا نہیں رہا کیونکہ اب اس پر ترقی کا کلف چڑھا دیا گیا ہے۔ مسقط کا پرانا قلعہ بھی دیکھا۔ سارے عمان میں تین سو پرانے قلعے ہیں۔ سمندر کے کنارے سلطان قابوس کا جدید ترین عالیشان محل العلام فورٹ پیلیس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا طرز تعمیر بالکل مختلف اور انوکھا ہے۔ اس محل کے اندر ہماری گاڑی چلتی رہی لیکن ہمیں سکیوریٹی کے کسی عہدہ دار نے نہیں روکا۔ ہمیں بتایا گیا یہاں سکیوریٹی کا وہ بکھیڑا نہیں ہے جو ہمیں اپنے ملک میں نظر آتا ہے۔ سلطان قابوس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ عموماً اپنی گاڑی خود چلاتے ہوئے سڑک پر آجاتے ہیں۔ نہ سیٹیاں

بجتی ہیں نہ راستے بند کئے جاتے ہیں۔ایک بادشاہ جمہوری حکمران کی طرح رہنے لگے تو یہ بڑی بات ہے۔ ایسا بادشاہ ان جمہوری حکمرانوں سے بدرجہا بہتر ہے جو جمہوریت کی آڑ میں بادشاہوں کی سی زندگی گذارتے ہیں۔ہم نے محسوس کیا کہ نہ صرف عمان کے مقامی باشندے بلکہ بیرونی باشندے بھی سلطان کی فہم وفراست کے گن گاتے ہیں۔سلطان کے محل کی سیر کے بعد ہم البستان پیلس ہوٹل گئے جو مسقط کا سب سے پرشکوہ اور عالیشان ہوٹل ہے۔اس ہوٹل کو سلطان قابوس نے بنایا ہے۔خود اس ہوٹل کے اندر بھی چھ محل بنے ہوئے ہیں جو مختلف بین الاقوامی کانفرنسوں اور اجتماعوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ اس ہوٹل کی تعمیر پر اتنا زرِ کثیر صرف ہوا ہے کہ ایک سو سال تک بھی اس ہوٹل کے سارے کمروں میں مسافر قیام کریں اور کرایہ ادا کریں تو اس کی تعمیر کا خرچ نہ نکل آئے۔اس ہوٹل کی لابی Lobby دنیا کی سب سے بڑی لابی سمجھی جاتی ہے۔

چاروں طرف پھیلے ہوئے بے آب وگیاہ پہاڑوں اور بنجر زمینوں کے درمیان آباد مسقط کا وجود ایک عجیب دلفریب نظارہ پیش کرتا ہے۔مسقط میں جیسی خوشنما اور پرشکوہ مسجدیں ہیں ویسی مسجدیں ہم نے کہیں نہیں دیکھیں۔سماجی اعتبار سے مسقط میں ہمیں ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا کیونکہ سارے مسقط میں اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔مشہور ہے کہ مسقط میں جو عرب باشندہ یہ کہے کہ وہ اُردو نہیں جانتا تو اس کے عمانی ہونے پر شبہ کیا جاسکتا ہے۔ہم جس جگہ گئے، جس دکان میں بھی گئے وہاں لوگوں کو اُردو بولتے ہوئے پایا۔خود سلطان قابوس کے بارے میں کسی نے بتایا کہ وہ بہت اچھی اُردو جانتے ہیں۔یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سلطان کے والد سلطان سعید بن تیمور نے بہت عرصہ پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم۔اے کیا تھا۔مسقط میں ڈھائی لاکھ ہندوستانی اور پچھتر ہزار پاکستانی آباد ہیں۔اس کے علاوہ مختلف قومیتوں کے لوگ بھی یہاں کام کرتے ہیں۔اکثر گجراتی یہاں کئی نسلوں سے آباد ہیں بلکہ ان میں سے بعض کو یہاں کی شہریت بھی ملی ہوئی ہے۔غرض ہمیں عمان کی سماجی،تہذیبی اور تجارتی زندگی پر ہندوستانیت کا عنصر زیادہ غالب نظر آیا۔

(''سیاست''،۳۱؍دسمبر ۱۹۹۵)

☆☆

بابائے مسقط، گلبر گہ کے رہنے والے ہیں

صاحبو! ہم ملک سے باہر جہاں بھی جاتے ہیں وہاں اُردو زبان کے حوالہ سے ہی جاتے ہیں۔ اسی مظلوم اور بے کس زبان کے حوالہ سے بیرونی ملکوں میں عیش کرتے ہیں، اسی نادار اور مفلس زبان کے وسیلہ سے ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں اور موج مناتے ہیں۔ اسی بے بس اور دکھیا زبان کی آڑ میں فائیو اسٹار ہوٹلوں میں رہتے ہیں اور قیمتی تحفے تحائف قبول کرتے ہیں۔ گویا ہمارا شمار اس غریب زبان کے امیر ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ اپنے ملک میں یہ زبان جتنی مظلوم اور بے کس نظر آتی ہے وہ بیرونی ملکوں میں نظر نہیں آتی۔ اس کے جلسوں میں پاکستان، بنگلہ دیش، ہندوستان اور نہ جانے کن کن ملکوں کے لوگ چلے آتے ہیں۔ اندرون ملک بھلے ہی کچھ لوگوں کو اس زبان سے بیر ہو لیکن بیرونی ملکوں میں یہ زبان جس طرح کے انواع واقسام کے شائقین ادب کو اکٹھا کر دیتی ہے اس سے لگتا ہے کہ یہ برصغیر ابھی تک تقسیم نہیں ہوا۔ ہمارا تو خیال ہے کہ لگ بھگ نصف صدی گذر جانے کے باوجود اس زبان نے تہذیبی اور جذباتی سطح پر اس برصغیر کو تقسیم نہیں ہونے دیا۔ ہم یہ جو پچھلے دنوں مسقط گئے تھے تو اسی زبان کے حوالہ سے گئے تھے۔ مسقط میں آئے دن مشاعرے اور موسیقی وغیرہ کے پروگرام تو ہوتے رہتے ہیں لیکن طنز و مزاح کی کوئی باضابطہ محفل یہاں کبھی آراستہ نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے دوست ہمایوں ظفر زیدی کا عرصہ سے اصرار تھا کہ ہم مسقط ضرور آئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مسقط کے ادب دوست حضرات اب شعروں پر داد دیتے دیتے تھک چکے ہیں۔ اب وہ ذرا ہنسنا بھی چاہتے ہیں، اس بات پر کہ آخر اتنے دنوں تک وہ بلا وجہ ہی شعروں پر داد کیوں دیتے رہے۔ دیارِ غیر میں آرام و آسائش کی ساری سہولتیں تو میسر آجاتی ہیں۔ لیکن ڈھنگ سے ہنسنے کے مواقع ذرا کم ہی میسر آتے ہیں۔ ہمایوں کوئی انجمن وغیرہ تو

نہیں چلاتے البتہ اپنی ذات سے خود ایک انجمن ضرور ہیں۔ تاہم طنز و مزاح کی یہ محفل انڈیا ایسوسی ایشن آف عمان کے زیر اہتمام منعقد ہوئی جس میں ہندوستان سے یوسف ناظم اور دلیپ سنگھ کے علاوہ ہم نے اور پاکستان سے انشائیہ نگار اور شاعر منظر علی خاں نے شرکت کی۔ اس اعتبار سے مزاح نگاروں کا یہ ایک ہند پاک اجتماع تھا جس میں مسقط میں مقیم ہندوستان اور پاکستان کے شائقین ادب نے بھاری تعداد میں شرکت کی۔ لیکن اس محفل کے انعقاد سے پہلے ہمیں ایک اور محفل شعر و سخن میں شرکت کرنے کا موقعہ ملا جس کا اہتمام حبیب بینک کی مسقط شاخ کے منیجر نذیر حسین بھٹو نے اپنی قیام گاہ پر کیا تھا۔ مسقط کے مقامی شاعروں سے ہماری یہیں ملاقات ہوئی۔ حبیب بینک پاکستان کا مشہور و معروف بینک ہے۔ چنانچہ اس محفل میں زیادہ تر حبیب بینک کے ملازمین اور کھاتہ داروں نے شرکت کی۔ پھر دلچسپ بات یہ تھی کہ اس محفل میں حبیب بینک کی مسقط شاخ کے جنرل منیجر واعظ الرحمٰن کے علاوہ پاکستان سے آئے ہوئے مزاح نگار منظر علی خاں بھی شریک تھے جو خود بھی حبیب بینک کے بہت بڑے افسر یعنی اس بینک کے سینیر وائس پریسیڈنٹ ہیں بلکہ وہی اس محفل کے صدر بھی تھے۔ نتیجہ میں بینک کے ملازمین نے اس دن شعروں پر 'تھرو پراپر چینل' داد دی اور خوب داد دی۔ پہلے بینک کے وائس پریسیڈنٹ منظر علی خاں داد دیتے تھے۔ بعد میں بینک کے جنرل منیجر واعظ الرحمٰن کی داد سنائی دیتی تھی۔ تب کہیں یہ داد بینک کے منیجر نذیر حسین بھٹو سے ہوتی ہوئی بینک کے درجہ بدرجہ نچلے ملازمین کے منہ سے سنائی دیتی تھی۔ ایسی باقاعدہ اور باضابطہ داد ہم نے کم ہی سنی ہے۔ منظر علی خاں تو خیر ہمارے پرانے دوست ہیں۔ ان سے کراچی میں ہماری کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ واعظ الرحمٰن سے البتہ ہم مسقط میں پہلی بار ملے۔ ہندوستان سے پاکستان کو ہجرت کرنے سے پہلے ان دونوں حضرات کا تعلق صوبہ بہار سے رہ چکا ہے اور ان دونوں بہاریوں کا شخصی کارنامہ یہ ہے کہ جو کوئی بھی ان سے ملتا ہے بہاریوں کے بارے میں اپنی رائے کو تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے (رائے بُری ہو تو اچھی کر لیتا ہے)۔ واعظ الرحمٰن مسقط کی اُردو محفلوں کی جان ہیں۔ بے حد ملنسار، خوش اخلاق اور مخلص آدمی ہیں۔ مسقط کی محفل طنز و مزاح کے انعقاد میں بھی وہ اپنے بینک اور بینک بیلنس دونوں کے ساتھ شریک تھے۔ چونکہ ہمارا تعلق حبیب بینک سے نہیں تھا اسی لئے ہم اس محفل میں 'تھرو پراپر چینل' داد دینے کے پابند نہیں تھے۔ اس لئے ایسے شعروں پر بھی بے ساختہ داد دیتے رہے جو بحر سے خارج تھے۔ ہمایوں نے دو ایک

بارٹو کا بھی کہ حضرت آپ بے وزن شعروں پر بھی داد دے رہے ہیں۔ ہم نے کہا ''اُردو ماحول سے ہزاروں میل دور لق ودق صحرا میں کہے جانے والے شعروں پر وزن اور بحر کی پابندی اچھی نہیں لگتی۔'' اس محفل میں محترمہ صدف بھٹو، صدف ملک، عابد فاروق، مقبول احمد شیخ، سید سعید واحد، فرزانہ اعجاز، عارف انوار الحق، شکیل کاظمی، یوسف شکیل، جاوید اقبال رشید، بابائے مسقط کیفی حسینی، ہمایوں ظفر زیدی، یوسف ناظم اور صدر مشاعرہ منظر علی خاں نے کلام سنایا۔ اس محفل میں جب کنوینر مشاعرہ نے کیفی حسینی کو دعوت سخن دیتے ہوئے کہا ''اب آپ کو بابائے مسقط کلام سنائیں گے'' تو ہمارے کان کھڑے ہوگئے۔ اُردو والے جہاں بھی جاتے ہیں وہاں اپنا ایک 'بابائے اُردو' یا 'ملک الشعراء' یا 'شمس العلماء' ضرور ایجاد کر لیتے ہیں اور متعلقہ حضرات بھی ان القاب کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی نے ایک کردار کے بارے میں کہیں لکھا ہے کہ وہ اپنے نام کے ساتھ بربنائے انکسار وخطا کاری 'عاصی ظہور الدین' لکھا کرتے تھے۔ ان کے لکھے پر لوگوں نے بھی انھیں ''عاصی ظہور الدین'' پکارنا شروع کر دیا۔ کیفی حسینی غزل سرا ہوئے تو ہمیں ان کے ترنم میں سے دکن کی بو آنے لگی۔ یوں لگا جیسے ہم مخدوم محی الدین اور سعید شہیدی کا کلام ترنم سے سن رہے ہوں۔ جب بابائے مسقط کلام سنا چکے تو ہم نے پوچھا ''قبلہ! آپ کا تعلق کس علاقہ سے ہے؟'' بولے ''ویسے تو پچھلے چالیس برسوں سے پاکستان میں مقیم ہوں لیکن میرا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے۔'' ہم نے پوچھا ''حیدرآباد دکن کے کونسے علاقے سے ہے؟'' بولے ''گلبرگہ شریف سے''۔ ہم نے جب گلبرگہ شریف سے اپنے تعلق کا اظہار کیا تو بہت خوش ہوئے۔ ہم نے پوچھا ''گلبرگہ میں کہاں رہتے تھے؟'' بولے ''محلہ جگت میں رہتا تھا''۔ ہم نے کہا ''ہم بھی محلہ جگت میں رہتے تھے۔'' پھر اس کے بعد ہم نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ محلہ جگت کے کس مکان میں رہتے تھے کیونکہ ہمیں اندیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں وہ ہمارے سوال کے جواب میں یہ نہ کہہ دیں کہ وہ بھی اسی مکان میں رہتے تھے۔ ہم نے کہا ''بابائے مسقط یہ تو ہمیں پتہ تھا کہ دنیا بہت چھوٹی ہے لیکن یہ اتنی بھی چھوٹی ہو سکتی ہے اس کا ہمیں اندازہ نہیں تھا۔'' کیفی حسینی (اصلی نام مصطفیٰ حسینی) بیجاپور کے مذہبی گھرانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس مشاعرہ میں ہمایوں ظفر زیدی نے ایک خوبصورت شعر سنایا۔ آپ بھی سن لیجئے۔

مرے خدا مجھے پردیس میں سکوں دیدے
کہ اب تو لوٹ کے جانے کا حوصلہ بھی نہیں

دوسرے دن طنز ومزاح کی یادگار محفل، جس میں شرکت کے لئے ہم گئے تھے، انڈین ایسوسی ایشن کے ہال میں منعقد ہوئی۔ یہ ایک مخلوط محفل تھی جس میں ہندوستانی، پاکستانی، گجراتی، پنجابی، حیدرآبادی اور سندھی باشندے شریک تھے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے سفارت خانوں کے اعلیٰ عہدہ دار بھی موجود تھے۔ طنز ومزاح کی یہ ایک یادگار محفل تھی۔ ابتداء میں ہمایوں ظفر زیدی نے طنز ومزاح کے بارے میں انگریزی میں مدلل تقریر کی۔ اس کے بعد منظر علی خان، یوسف ناظم، دلیپ سنگھ اور ہم نے مضامین سنائے۔ لوگوں کا اشتیاق کچھ اتنا زیادہ تھا کہ ہمیں اور دلیپ سنگھ کو تین تین مضامین سنانے پڑے۔

تیسرے دن ہمارے ایک اور میزبان واعظ الرحمٰن، جنرل منیجر حبیب بینک نے اپنے گھر پر ایک خوبصورت محفل آراستہ کی جس میں مسقط میں متعینہ پاکستانی سفیر جناب خالد محمود نے بطور خاص شرکت کی۔ مسقط کے سب سے خوبصورت علاقہ 'قرم' میں واعظ الرحمٰن کی کوٹھی شائقین ادب سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ مزاح نگاروں سے پھر مضامین سنے گئے اور مسقط کے سارے شعراء نے جی کھول کر کلام سنایا۔ واعظ الرحمٰن نے مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مہمانوں کو تحفے تحائف سے بھی نوازا گیا۔ واعظ الرحمٰن نہ تو شعر کہتے ہیں نہ مزاح لکھتے ہیں لیکن ہمیں بتایا گیا کہ اُردو کے حوالہ سے کوئی بھی محفل آراستہ ہو تو وہ نہ صرف اپنے گھر کے دروازے بلکہ اپنے بینک کے دروازے بھی کھول دیتے ہیں۔ ہم تو اپنے مضامین سنا کر اُردو کی خدمت کرتے ہیں لیکن واعظ الرحمٰن کچھ سنائے بغیر ہی اُردو کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ صحیح معنوں میں اُردو کے خاموش خدمت گذار ہیں۔ واعظ الرحمٰن نے کہا کہ طنز ومزاح کی یہ محفل بہت ڈرتے ڈرتے رکھی گئی تھی لیکن جس طرح یہ محفل کامیاب رہی اس کے چرچے مسقط میں جگہ جگہ ہو رہے ہیں۔ اب انشاءاللہ ایسی محفلیں ہر سال ہوا کریں گی۔ ہم نے بھی انہیں مستقبل میں اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا ہے کیونکہ اُردو کی خدمت کے لئے ہم ہر دم ہوائی جہاز میں بیٹھنے، فائیو اسٹار ہوٹلوں میں قیام کرنے اور قیمتی تحفوں کو قبول کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ کوئی ہمیں آزما کے تو دیکھ لے۔

(''سیاست''۔ ۷ رجنوری ۱۹۹۶ء)

☆☆

کچھ حیدرآبادیوں کے بارے میں

ہمارے ایک غیر حیدرآبادی دوست کا کہنا ہے کہ حیدرآباد ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ہم نے اعداد وشمار کی بنیاد پر ان سے اختلاف کیا تو بولے" آپ شہر حیدرآباد کی آبادی میں صرف اُن لوگوں کو شامل کرتے ہیں جو حیدرآباد میں رہتے ہیں۔آپ اُن حیدرآبادیوں کو شامل نہیں کرتے جو دنیا کے ہر کونے میں پھیلے ہوئے ہیں۔دیگر شہروں کے لوگ کہیں بھی جاتے ہیں تو اپنے شہر کی شناخت کو بھول کر مقامی ماحول کا حصہ بن جاتے ہیں لیکن ایک حیدرآبادی دنیا کے کسی بھی کونے میں رہے وہ حیدرآباد ہی میں رہتا ہے۔چنانچہ حیدرآباد اب حیدرآباد سے کہیں زیادہ بیرونی ممالک میں آباد نظر آتا ہے۔اس اعتبار سے یہ شہر ہندوستان کا سب سے بڑا شہر قرار پاتا ہے۔"

کچھ برس پہلے ہم امریکہ گئے تھے تو ہمارے ایک پاکستانی دوست نے کہا تھا کہ حیدرآبادی امریکہ کے ہر گوشہ میں آباد ہیں۔کوئی پتھر بھی اٹھایئے تو اس کے نیچے سے ایک حیدرآبادی فرشی سلام کرتا ہوا برآمد ہوتا ہے۔حیدرآبادی سارا دن وقت بے وقت سلام کرنے میں گذار دیتے ہیں۔پتہ نہیں کام کب کرتے ہیں۔سچ پوچھئے تو ہم بھی ایک عرصہ تک بلا وجہ سلام کرنے کی عادت میں مبتلا رہے۔کسی نے پانی پیش کیا اور ہم نے سلام کیا۔کسی نے ہمارے لئے جگہ دی اور ہم نے سلام کیا۔کسی نے ہمارا مزاج پوچھا اور ہم نے سلام کیا۔ ہمارے دوست اوتار سنگھ جج، جو انگریزی کے صحافی ہیں، ایک عرصہ تک ہماری اس عادت سے پریشان رہے۔وہ

اکثر کہتے تھے کہ تم نے آتے ہی مجھے سلام کردیا تھا۔ پھر یہ بار بار سلام کر کے مجھے کیوں پریشان کرتے ہو۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ محفلوں میں ہمارے ان بے جا سلاموں پر روک لگانے کی خاطر وہ ہمارے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھے رہتے تھے کہ کہیں ہمارے ہاتھ سے سلام نہ سرزد ہو جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ حیدرآبادیوں کا سلام، سلام برائے سلامتی نہیں ہوتا بلکہ صرف سلام برائے سلام ہوتا ہے جیسے ان دنوں ادب برائے ادب ہوتا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ ۱۹۵۶ء کے بعد ہمارے اکثر دوست جب حیدرآباد کو چھوڑ کر بیرونی ملکوں میں آباد ہونے لگے تو دس بارہ برسوں تک ہم ان کا باضابطہ حساب کتاب رکھتے رہے کہ کونسا دوست کس ملک میں آباد ہے۔ لیکن پچیس تیس برس پہلے جب اچانک خلیجی ممالک کے دروازے کُھلے اور حیدرآبادی جوق در جوق ان ملکوں میں جانے لگے تو ہمارے لئے ان کا حساب کتاب رکھنا ناممکن نظر آنے لگا۔ حساب میں ہم یوں بھی کمزور ہیں۔ پھر ہم نے اپنے حیدرآبادی احباب کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا کہ وہ جہاں بھی رہیں خوش رہیں۔ اب ہمیں خود نہیں معلوم کہ ہمارا کون سا دوست کہاں آباد ہے۔ سعودی عرب میں ہے یا کویت میں، قطر میں ہے یا دوبئی میں، مسقط میں ہے یا شارجہ میں۔ دوستوں کا حساب نہ رکھنے کی وجہ سے اس بار مسقط میں ہمارے ساتھ ایک دلچسپ صورت حال پیش آئی۔ مسقط جانے سے پہلے ہم نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہاں کون کون حیدرآبادی دوست آباد ہے۔ ہمیں کچھ یاد نہ آیا۔ تاہم اتنا ضرور یاد تھا کہ ہمارے ایک حیدرآبادی دوست مہدی علی خاں، جو میکانیکل انجینئر ہیں اور جو برسوں دوبئی میں مقیم رہے، اب حال ہی میں مسقط میں آباد ہوئے ہیں۔ ہم جس دوست کی دعوت پر مسقط گئے تھے ان کا تعلق اُتر پردیش سے ہے۔ لہٰذا ہم نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ یوں تو مسقط میں ہمارے کئی حیدرآبادی احباب ہوں گے لیکن ایک دوست مہدی علی خاں حال ہی میں مسقط میں آباد ہوئے ہیں۔ اگر ہو سکے تو انہیں ہماری آمد کے بارے میں بتادیں۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ ہماری یہ چھوٹی سی خواہش مسقط میں ہمارے پانچ روزہ قیام کو درہم برہم کر کے رکھ دے گی۔ ہمارے میزبان ہمایوں ظفر زیدی نے پہلے تو مسقط کے حیدرآبادیوں کو تلاش کیا۔ پھر ان حیدرآبادیوں میں سے 'مہدی علی خانوں' کو ڈھونڈنا شروع کردیا۔ ہم مسقط پہنچے تو ہمایوں نے کہا ''آپ نے فون پر مہدی علی خاں کے بارے میں کہا تھا۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ آپ کے حیدرآبادی دوست مہدی علی خاں کیا کام کرتے ہیں۔ لہٰذا مجھے جتنے بھی حیدرآبادی مہدی علی خاں ملے میں نے انہیں آپ کی

آمد کے بارے میں بتادیا ہے۔ اب تک جملہ پانچ مہدی علی خاں ملے ہیں۔ ان میں سے جو بھی آپ کے کام کا مہدی علی خاں نکلے اس سے مل لیجئے۔''

دوسرے دن ہم صبح صبح گہری نیند سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ایک عدد مہدی علی خاں کا فون آ گیا۔ ہم نے خوشی خوشی کہا'' مہدی علی خاں صاحب! دیکھئے آپ کو ڈھونڈ ھ ہی نکالا۔ کیسے ہیں آپ؟''

بولے'' اچھا ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟۔'' ہم نے کہا'' ہم تو اچھے ہیں۔ مگر آپ کی آواز سے تو لگ رہا ہے کہ آپ اچھے نہیں ہیں۔ خاصی بھاری آواز ہے۔ کیا نزلہ اور زکام میں مبتلا ہیں۔''

بولے'' جی نہیں! اِدھر ایک برس سے تو کبھی نزلہ اور زکام میں مبتلا نہیں ہوا۔ خیر چھوڑیئے۔ مسقط میں آپ کا آنا مبارک ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے یاد کیا۔''

ہم نے تھوڑی دیر میں اندازہ لگایا کہ ہم جن صاحب سے بات کر رہے ہیں وہ مہدی علی خاں تو ہیں لیکن ان کی آواز اُن مہدی علی خاں کی نہیں ہے جن سے ہماری دوستی ہے۔ ہم نے کہا'' مہدی علی خاں صاحب! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ زکام کے بارے میں بعد میں بات ہوگی۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ ہمارے دوست محمد میاں کے سمدھی ہیں نا؟''

دوسری طرف سے مہدی علی خاں نے کہا'' حضور! آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ابھی تو خود میری شادی نہیں ہوئی ہے۔ میں کسی کا کیسے سمدھی بن سکتا ہوں۔ بہر حال چلئے اس بہانے آپ سے بات ہوگئی۔ میں آپ کے جلسہ میں ضرور آ ؤنگا۔ خدا حافظ۔''

ہماری بات چیت کو سن کر ہمایوں نے کہا'' چلئے ایک مہدی علی خاں کا فون تو آ گیا۔ اب چار مہدی علی خانوں کے فون آنے باقی ہیں۔'' ہم دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگے تو پھر فون کی گھنٹی بجی۔ پتہ چلا کہ ایک اور مہدی علی خاں کا فون آیا ہے۔ ہم نے ہمایوں سے کہا'' بھیا! اب تم ہی ان مہدی علی خاں سے نپٹو۔ ان سے پوچھو کہ کیا وہ میکانیکل انجینئر ہیں، اگر ہیں تو پوچھو کہ کیا وہ ہمارے دوست محمدؐ میاں کے سمدھی ہیں''۔ ہمایوں نے بات کی تو پتہ چلا میکانیکل انجینئر نہیں بلکہ الیکٹریکل انجینئر ہیں۔ ایک کوالیفیکشن یہ بھی بتائی کہ ہمارے مدّاح ہیں اور ہمارے مضامین پڑھتے رہتے ہیں۔ چنچل گوڑہ کے رہنے والے ہیں۔ ہم سے ملنے کے متمنی نظر آئے تو ہم نے انہیں

جلسہ میں آنے کی دعوت دیدی۔ غرض دوپہر ہونے تک ہم نے پانچوں مہدی علی خانوں کے فون ریسیو کئے لیکن ان میں سے کوئی بھی مطلوبہ مہدی علی خاں نہ نکلا۔ ایک مہدی علی خاں تو ایسے بھی نکلے جو مسقط کے ایک ہوٹل میں خانساماں ہیں۔ بہت اصرار کرتے رہے کہ ہم مسقط میں قیام کے دوران میں ان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا ضرور کھائیں۔ چونکہ ہماری مزاح نگاری سے وہ بالکل ناواقف تھے اس لئے ہمیں ان کے لہجہ میں بے پناہ پیار اور خلوص نظر آیا۔ وہ یہ جان کر بہت خوش تھے کہ حیدرآباد نے نہ صرف اچھے خانساماں پیدا کئے ہیں بلکہ اچھے مزاح نگار بھی پیدا کئے ہیں۔ خیر وہ جلسہ میں تو نہ آسکے البتہ باقی چاروں غیر مطلوبہ مہدی علی خاں جلسے میں موجود تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہمارے دوست مہدی علی خاں کو عین جلسہ کے دن ہماری آمد کا پتہ چل گیا اور وہ بھی باقی مہدی علی خانوں کے ہمراہ جلسہ میں موجود تھے۔ بہت شرمندہ تھے کہ ان کی تلاش میں کئی غیر ضروری مہدی علی خانوں سے ہماری ملاقات ہوگئی۔ ہمایوں کہنے لگے "مجھے یہ تو پتہ تھا کہ مسقط میں کئی حیدرآبادی آباد ہیں لیکن یہ پتہ نہیں تھا کہ ان میں سے اتنے سارے مہدی علی خاں بھی یہاں آباد ہیں۔"

اصلی مہدی علی خاں اگرچہ ہمیں دیر سے ملے لیکن یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ ان کی ساری توجہ اس بات پر تھی کہ ہمیں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کھانا کھلایا جائے۔ ایک دن وہ ہمیں ایک نخلستان میں بھی لے گئے جو مسقط سے سوا سو کیلومیٹر دور واقع ہے۔ اس کا نام 'نخل' ہے۔ دو تین پہاڑیوں کے بیچ میں سے پانچ چھ چھوٹے چھوٹے چشمے نکلتے ہیں۔ کھجور کے چند درخت ہیں۔ یہاں وہاں کچھ پانی بھی دکھائی دیتا ہے۔ بس اس کو عمان والوں نے تفریح گاہ بنادیا ہے۔ جتنے پانی کو دیکھ کر لوگ یہاں خوش ہوتے ہیں اتنا پانی تو نل کی پائپ لائین خراب ہوجانے کی صورت میں ہماری اکثر سڑکوں پر بہتا رہتا ہے۔ بہر حال ہر ایک کے خوش ہونے کے الگ الگ انداز ہیں۔ مسقط میں ہمیں اور بھی کئی حیدرآبادی ملے۔ مسقط ایرپورٹ پر ہمیں لینے کے لئے دو حیدرآبادی احباب ڈاکٹر عبدالحئی اور ادریس مشہدی بھی آئے تھے۔ ڈاکٹر عبدالحئی (جن کے ہاں یوسف ناظم مقیم تھے) کا شمار مسقط کے مشہور ڈاکٹروں میں ہوتا ہے۔ ہر دم مریضوں کی خدمت میں لگے رہتے ہیں (مریض بھی ان کی کچھ کم خدمت نہیں کرتے) اور دوسری طرف ادریس مشہدی اصلاً حیدرآبادی ہیں مگر براہ بمبئی مسقط میں مقیم ہیں۔ حیدرآباد کے سارے فنکاروں، ادیبوں اور

شاعروں کو جانتے ہیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ مزاح نگاروں کی محفل میں شرکاء کی ایک تہائی تعداد حیدرآبادیوں پر مشتمل تھی۔ ہماری دعا ہے کہ حیدرآبادی جہاں بھی رہیں خوش رہیں اور حیدرآباد کی یاد کو اپنے سینوں میں بسائے رکھیں۔

(''سیاست۔'' ۲۱؍جنوری ۱۹۹۶ء)

☆☆

لَبّیکَ اللّٰھُم لَبّیک

صاحبو! جب آپ یہ سطریں پڑھ رہے ہونگے تو ہم یہاں سے ہزاروں میل دور لاکھوں افراد کی موجودگی میں خانۂ کعبہ میں ''لَبّیکَ اَللّٰھُم لَبّیک '' کا ورد کر رہے ہوں گے۔ ابھی آٹھ دن پہلے ہم حیدر آباد کی گلیوں میں گھوم رہے تھے۔ ہم نے سوچا بھی نہ تھا کہ آٹھ دنوں میں یوں دیکھتے ہی دیکھتے دنیا اور ہم دونوں ہی اتنے بدل جائیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم حیدر آباد گئے ہی اس ارادہ سے تھے کہ اپنے بعض بزرگوں کو جو فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے مکہ جا رہے ہیں وداع کریں۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ انھیں وداع کر کے آتے ہی ہمیں ان سے اتنی جلدی دوبارہ ملنے کا موقع نصیب ہوگا۔ بیس تاریخ کو ہم دوپہر میں آرام کر رہے تھے کہ مرکزی وزارت خارجہ سے فون آیا کہ اس سال حکومت ہند حج کے موقع پر جو تیرہ رکنی خیر سگالی وفد سعودی عرب روانہ کر رہی ہے اس میں آپ کو بھی شامل رکھا گیا ہے۔ لہٰذا چلنے کی تیاری کریں۔ یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا کہ ہمیں بڑی دیر تک یقین ہی نہ آیا۔ پہلی بار اندازہ ہوا کہ حکومت ہند کو بھی ہمارے گناہوں کا علم ہے کیونکہ اس وفد میں ہماری شمولیت کا کوئی اور سبب بجز ہمارے گناہوں کے نظر نہیں آیا۔ ہم ایک نہایت حقیر، فقیر، پُر تقصیر مگر گنہگار قسم کے آدمی ہیں۔ ہمارا یوں اچانک خدا کے گھر میں حاضر ہو جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ خدا کی شان ہی نرالی ہے۔ اگرچہ 1989ء میں ہمیں عمرہ کرنے کی سعادت حاصل ہو چکی ہے۔ مکہ کی وادی میں اُترتے ہی جب پہلے پہل ہماری نظر خانۂ کعبہ پر پڑی تھی تو ہم پر جو ہیبت طاری ہوئی اور جس کیفیت سے ہم گذرے تھے اس کی یاد اب تک تازہ ہے۔ مانا کہ چودہ سو برس پہلے بھی راستے مکہ معظمہ تک جاتے تھے لیکن چودہ سو برس پہلے ان پر اسرار پہاڑیوں میں گھرے ہوئے خدا کے اس گھر سے ایک راستہ اچانک کچھ اس طرح نکلا کہ دیکھتے ہی

دیکھتے چین، اسپین، انڈونیشیا اور نہ جانے کہاں کہاں تک چلا گیا۔ اب اس راستہ پر دنیا کا ہر پانچواں آدمی گامزن ہے اور اسی راستہ پر چل کر لاکھوں افراد حج کا فریضہ ادا کرنے کے لئے ہر سال مکہ میں چلے آتے ہیں۔

ہم کئی وفود کے ساتھ اس سے پہلے بھی ملک سے باہر جا چکے ہیں لیکن حج کے اس خیر سگالی وفد کی نوعیت جداگانہ ہے۔ ہم جہاں بھی گئے گناہوں کی گٹھری کو ملک کے اندر ہی چھوڑ کر چلے گئے بلکہ واپس آتے وقت کچھ اور گناہ بھی اپنی پیٹھ پر لاد کر لے آئے۔ لیکن اس سفر میں ہم اپنے گناہوں کی گٹھری کو بھی اپنی پیٹھ پر لادے جارہے ہیں۔ گٹھری اتنی بھاری ہے کہ اسے اُٹھاتے ہیں تو سارا وجود بکھرتا سا دکھائی دیتا ہے۔ حکومت ہند نے ہمیں اس وفد میں چاہے جس وجہ سے بھی شامل کیا ہو ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ ہم خانہ کعبہ میں جذبۂ شکر گذاری کے طور پر حکومت ہند کے حق میں دعا بھی نہیں کر سکیں گے کیونکہ جس دن ہم خانۂ کعبہ میں پہنچیں گے اُسی دن اس ملک کی بیشتر ریاستوں میں اگلے عام انتخابات کے پہلے مرحلہ کی رائے دہی مکمل ہو چکی ہوگی۔ اسی لئے سوچا ہے کہ اب ہم اپنے ملک کی سلامتی، خوشحالی اور اس کے امن وامان کی دعا مانگیں گے۔ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے ہمیں مکّہ میں بلا لیا ورنہ ملک میں جس طرح کے بجھے بجھے سے ماحول میں عام انتخابات ہو رہے ہیں وہ ہم سے دیکھے نہیں جارہے تھے۔ مانا کہ آنے والی سرکار کو بنانے میں ہمارے ووٹ کا کوئی دخل نہیں ہوگا لیکن آنے والی سرکار کے لئے ہم یہ تو دعا کر سکتے ہیں کہ وہ نیکی اور سچائی کے راستہ پر چلے۔

ہم تو اسے بھی خدا کی شان ہی سمجھیں گے کہ حکومت ہند کے اس تیرہ رکنی وفد میں ہمارے پرانے کرم فرما، اُستاد اور ملک کے ممتاز ماہر معاشیات پروفیسر علی محمد خسرو کے علاوہ ہمارے دیرینہ مشفق اور معالج ڈاکٹر سی ایم حبیب اللہ بھی شامل ہیں۔ اللہ کے کس کس احسان کا شکریہ ادا کریں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہماری معاشی حالت کبھی بھی اچھی نہیں رہی مگر اللہ نے کچھ ایسے حالات پیدا کیے کہ ملک کے ممتاز ماہر معاشیات کو ہمارا ہم سفر بنا دیا۔ ڈاکٹر حبیب اللہ پیٹ کے امراض کے ماہر ہیں اور اس میدان میں بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ پیٹ بڑا بدکار ہے اور ہمیں جو کچھ بھی عارضے اب تک لاحق ہوئے ہیں ان کا تعلق پیٹ ہی سے رہا ہے۔ یقین مانیے ہم ڈاکٹر حبیب اللہ سے اور ڈاکٹر حبیب اللہ ہمارے پیٹ سے جتنا واقف ہیں کوئی اور نہ

ہوگا۔ اللہ نے انھیں بھی اس وفد میں شامل کر کے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہم جہاں بھی جاتے ہیں اُردو زبان وادب کے ماحول کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اگرچہ اس وفد میں اُردو کا کوئی ادیب شامل نہیں ہے (بشمول ہمارے) لیکن اس وفد میں شفیق مکرم شریف الحسن نقوی بھی شامل ہیں جو ابھی تین چار برس پہلے تک اُردو اکیڈیمی، دہلی کے سکریٹری رہ چکے ہیں۔ دہلی میں اُردو اکیڈیمی کے قیام اور اس کے استحکام کے علاوہ اس اکیڈیمی کو ہندوستان کی سب سے فعّال اکیڈیمی بنانے میں اکیلے شریف الحسن نقوی کے دونوں ہاتھ رہے ہیں۔ وہ اُردو کی خدمت بھی اسی طرح انجام دیتے ہیں جیسے دین اور مذہب کی بے لوث خدمت انجام دے رہے ہوں۔ اس سفر میں ان کی محبت کا میسر آ جانا بھی ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ خانۂ کعبہ میں بھی وہ اُردو زبان وادب کی بقاء کے لئے دعا کریں گے۔ وہ دعا کریں گے تو ہم بھی اس دعا میں اپنی 'آمین' کو شامل کر دیں گے۔

صاحبو! ہم نہایت عجلت میں یہ چند سطریں لکھ رہے ہیں کہ روانگی کی گھڑی سر پر آ چکی ہے۔ اکیس دن بعد ہم واپس ہونگے تو اُس وقت تک ملک کے حالات کیا سے کیا ہو جائیں گے اور ہماری حالت بھی نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے گی۔ اُس وقت تک نئی سرکار بھی شاید بن چکی ہوگی۔ ہماری دعاء ہے کہ ہمارے پیچھے ملک میں چین اور سکون برقرار رہے۔ اب جانے کی گھڑی آ گئی ہے تو بے شمار چہرے ہماری آنکھوں میں گھوم رہے ہیں۔ ایسے چہرے جو کبھی ہمارے درمیان تھے مگر اب خاک کا حصہ بن چکے ہیں اور ہمارے وہ سارے دوست بھی یاد آ رہے ہیں جن کی رفاقتیں ہمیں اب بھی میسر ہیں۔ اگرچہ ہم گنہگار آدمی ہیں لیکن اس کے باوجود ہم ان کے حق میں دعا ضرور کریں گے۔ کیا عجب کہ خدا ہماری دعا کو قبول ہی کر لے کیونکہ اُس کی تو شان ہی نرالی ہے۔

بہر حال اب ہم اُس جگہ جا رہے ہیں جہاں جانے کے لئے لوگ زندگی بھر تڑپتے رہتے ہیں۔ کیسی کیسی آرزوئیں، کیسی کیسی تمنائیں، کیسی کیسی عقیدتیں اور کیسے کیسے ارمان لے کر وہاں پہنچتے ہیں۔ لاکھوں افراد کے جم غفیر میں ہم کیا اور ہماری حیثیت کیا۔ تو صاحبو ہمیں اب اجازت دیجئے کہ ہمارا بلاوا آ رہا ہے۔ خدا حافظ۔ **لبیک اللھم لبیک**

(''سیاست''۔ ۲۸؍اپریل ۱۹۹۶ء)

☆☆

اور ہم حاجی بن گئے

صاحبو! ہم مکہ کے ہوٹل اجیاد سے بول رہے ہیں۔ کھڑکی سے خانۂ کعبہ کے باب عبدالعزیز کے بلند و بالا پر شکوہ مینار نظر آ رہے ہیں۔ آج صبح صبح خانۂ کعبہ میں حج کی آخری رسم 'طوافِ وداع' ادا کرنے کے بعد ہم باب عبدالعزیز سے باہر نکل آئے تو احساس ہوا کہ ماشاء اللہ اب تو ہم سچ مچ حاجی بن گئے ہیں۔ بالکل نئے، خالص اور نئے نکور حاجی۔ آج مئی کی پہلی تاریخ ہے اور ٹھیک ایک مہینہ پہلے ہم ظہیر آباد، گلبرگہ اور حیدرآباد نہ جانے کہاں کہاں گھوم رہے تھے۔ دھما چوکڑی مچاتے ہوئے، ٹھی ٹھی ٹھا ٹھا کرتے ہوئے۔ اس وقت بھی کچھ لوگوں نے ٹوکا تھا کہ میاں کچھ تو اپنی عمر کا لحاظ کرو۔ بزرگی آ گئی ہے لیکن بچوں کی سی حرکتیں کرتے پھرتے ہو۔ جوڑوں میں درد رہتا ہے لیکن شریر بچوں کی طرح اُچھل کود کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ ہر عمر کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ ہمیں راہ راست پر لانے کے لئے قدرت یوں اچانک ہمیں مکہ روانہ کر دے گی۔ ہم اتنی عجلت، تیزی اور جلد بازی میں حاجی بنے ہیں کہ حاجی بن جانے کے باوجود یقین نہیں آ رہا ہے کہ ہم حاجی بن چکے ہیں۔ البتہ جب جب آئینہ میں اپنی شکل دیکھتے ہیں تو یقین آ جاتا ہے۔ ہم جیسے گنہگار کا آٹھ دن کے اندر اندر حاجی بن جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ لوگ برسوں تمنا کرتے ہیں، دعائیں مانگتے ہیں، تیاری کرتے ہیں تب کہیں جا کر حاجی بنتے ہیں۔ یہ سب قدرت کا کرشمہ ہے کہ ہم چٹکی بجاتے میں حاجی بن بیٹھے ہیں۔

ہم نے آج ہی خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی ہے کہ اے پروردگار! تو ہمیں

سیدھے راستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ دنیا چاہے کسی بھی راستہ پر چلتی رہے ہمیں نیکی کے راستہ پر چلا۔ جو گناہ ہم کر چکے وہ کر چکے لیکن اب ہمیں نئے گناہوں سے محفوظ رکھ۔ یہی نہیں ہمیں ایسی نیکیوں سے بھی دور رکھ جن کے کرنے سے ہمیں نقصان پہنچے۔ خانۂ کعبہ میں ہمیں ایسی کئی صورتیں یاد آئیں جن کے ساتھ ہم نے عادت سے مجبور ہو کر نیکی کی تھی لیکن بعد میں ہمارے ان کرم فرماؤں نے ہماری نیکی کا کچھ ایسا صلہ دیا کہ ہمارا دل ہی جانتا ہے۔ اسی لیے ایسی نیکیوں سے بھی دور رہنا ہی بہتر ہے۔ اصل میں ہم اب عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں ہم گناہ کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے۔ ایک نیکی ہی کر سکتے ہیں تو اس کی بھی فضول خرچی نہیں کرنا چاہتے کیونکہ اب ہماری جھولی میں دن ہی کتنے بچے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں حکومتِ ہند نے حج کے موقع پر اپنا جو خیر سگالی وفد روانہ کیا ہے ہم اس کے ایک رکن کی حیثیت سے یہاں آئے ہیں۔ کسی نے کہا تھا کہ کوئی بھی شخص خیر سگالی وفد کے رکن کی حیثیت سے حج کا فریضہ انجام دے تو وہ بعد میں اپنے طور پر حج کا فریضہ انجام دینے کے قابل نہیں رہتا کیونکہ وہ ایسی تمام سہولتوں کا عادی ہو جاتا ہے جو حکومت کی جانب سے مہیا کی جاتی ہیں۔ وہ سفرِ حج کی اصل صعوبتوں کو برداشت کرنے کا اہل نہیں رہ جاتا۔ اس وقت بھی مکہ کے جس اجیاد ہوٹل میں بیٹھ کر یہ کالم لکھ رہے ہیں وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل ہے۔ دنیا بھر کی سہولتیں میسر ہیں لیکن آپ یہ نہ سمجھیں کہ فریضہ حج کی ادائیگی میں جو مشکلات پیش آتی ہیں ان سے بالکل ناواقف ہیں۔ آپ یقین کریں کہ عرفات کے میدان میں حج کی نماز پڑھنے اور رات مزدلفہ میں گذارنے کے بعد ہم جب منیٰ میں شیطان کو کنکریاں مارنے کے ارادہ سے آنے لگے تو سوچا کہ کیوں نہ اللہ کے پروانوں کے ساتھ بھی چل کر دیکھ لیا جائے۔ سفارت خانہ کے عہدہ داروں نے منع بھی کیا کہ یہ وقت زبردست بھیڑ کا ہے۔ خدانخواستہ کچھ ایسا ویسا نہ ہو جائے۔ مگر ہم منع کرنے کے باوجود اس بھیڑ میں شامل ہو گئے۔ اس کی ایک نفسیاتی وجہ بھی تھی کہ منیٰ میں ہم نے جب اچانک اپنے اطراف لاکھوں افراد کو ایک ہی طرح کے احرام میں ستر پوش پایا تو یوں لگا جیسے یہ مخلوق اس دنیا کی نہیں ہے کہیں اور سے آئی ہے۔ ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ اگرچہ ہم نے بھی احرام باندھ رکھا تھا لیکن ایک ایرکنڈیشنڈ بس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ بس سے اُتر کر اس خلقت میں شامل ہو جائیں۔ جب تک انسان کرۂ ارض پر اپنے اپنے علاقہ میں اپنی اپنی وضع

کے لباس پہنے رہتا ہے تو اپنی شناخت اور پہچان بنا کر مطمئن رہتا ہے۔ لباس، زبان اور برتاؤ کی یہ شناخت اور پہچان اچانک غائب ہوگئی تو لگا کہ یہ ایک نئی مخلوق ہے جو اچانک زمین پر اُتر آئی ہے۔ ہم کسی نفسیاتی دباؤ کے تحت اس مخلوق میں شامل ہونے کے لئے اچانک بس سے اُتر پڑے تو کچھ دیر تک تو بہت اچھا لگا لیکن جب بھیڑ بڑھنے لگی اور چاروں طرف سے انسانوں کا سیلاب اُترنے لگا تو ہمیں محسوس ہوا کہ ہم بہت جلد اپنی جان، جانِ آفریں کے حوالہ کرنے والے ہیں۔ بس کی طرف پلٹ کر جانے کا بھی کوئی موقع نہ تھا۔ اللہ کی دی ہوئی جان کو ہم نے کیسے بچایا اس کا حال ہمارا خدا ہی جانتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسی نے ہماری جان بھی بچائی ورنہ اپنی جان کو بچانا ہمارے بس میں نہ تھا۔ ایک لمحہ میں ہم میں اتنی طاقت نہ جانے کہاں سے آ گئی کہ اچانک حاجیوں کے ایک کیمپ کی ٹین والی دیوار کو توڑ کر ہم اندر داخل ہو گئے۔ یہ غالباً ملیشیا کے حاجیوں کا کیمپ تھا۔ کچھ خواتین وہاں تھیں۔ انھوں نے ہمیں کچھ دیر وہاں بٹھایا، پانی وغیرہ پلایا، منہ پر چھینٹے بھی مارے تو جان میں جان آئی۔ تب ہمیں پتہ چلا کہ عام حاجی حج کا فریضہ ادا کرنے کے لئے کتنی مشقت سے گذرتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ حج کا فریضہ ادا کرنا جہادِ اصغر سے کم نہیں ہے۔ مانا کہ تھوڑی دیر کے لئے موت ہماری آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی تھی لیکن اگر ہم وفد کے دیگر اراکین کی طرح بس میں ہی بیٹھے رہتے تو اس مخلوق کا حصہ کہاں سے بنتے، کیسے جانتے کہ حج کا تجربہ کیا ہوتا ہے۔ بڑی دیر بعد جان بچا کر منیٰ میں اپنے ہوٹل پر پہنچے تو سفارت خانہ کے عہدہ دار پریشان تھے۔ لاکھوں لوگوں کے ہجوم میں وہ ہمیں کہاں ڈھونڈتے۔ حج کمیٹی کے صدر نشین اور وفد کے ڈپٹی لیڈر سلامت اللہ نے کہا بھی کہ ہمیں بس سے نہیں اُترنا چاہیے تھا۔ ان کا اعتراض بالکل بجا تھا لیکن ہم نے اس مخلوق کا حصہ بن کر جو تجربہ حاصل کیا ہے وہ بہت کم ارکانِ وفد کے حصہ میں آیا ہوگا۔

صاحبو! ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ہم اس وقت کیا لکھیں اور کیا نہ لکھیں کیونکہ خیالات کا ایک ہجوم ہے جو ہمارے دل و دماغ میں موجزن ہے۔ نئے نئے حاجی بنے ہیں تو پتہ نہیں چل رہا ہے کہ اپنی بات کہاں سے شروع کریں اور شروع کریں تو کہاں ختم کریں۔ ہم نے خانۂ کعبہ کے کئی طواف کیے۔ نہ صرف ہر طواف ایک تفصیل کا طلب گار ہے بلکہ ہر طواف کا ایک ایک لمحہ بھی بیان کی تفصیل مانگتا ہے۔ خدا توفیق دے گا تو اس کے بارے میں اطمینان سے لکھیں

گے۔اس وقت تو ہم حالتِ سفر میں ہیں۔پھر بھی ہم یہ کالم صرف یہ اطلاع دینے کے لئے لکھ رہے ہیں کہ ہم بالاخر حاجی بن گئے ہیں۔یہ بھی عجیب بات ہے کہ جس دن آپ نئی سرکار بنانے کے سلسلے میں اپنے ووٹ کے استعمال کا قطعی فیصلہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے تو عین اسی وقت ہم عرفات کے میدان میں حج کی نماز ادا کر رہے تھے۔تھوڑی دیر کے لئے وطن عزیز کی یاد بھی آئی، ہم نے ملک کی سلامتی کے لئے دعا تو مانگی ہی، ساتھ میں یہ دعا بھی کہ خدا آپ کو اپنے ووٹ کا صحیح استعمال کرنے کی توفیق عطا کرے۔ہماری دعا کہاں تک قبول ہوئی اس کا علم تو ہمارے ہندوستان واپس آنے سے پہلے ہی ہو جائے گا۔خدا کرے کہ ہم حاجی بن کر وطن واپس ہوں تو حالات سازگار رہیں اور ہمیں اپنے وطن میں نیک اور اچھے کام کرنے کا موقع ملے۔ہم تین مئی کو مکہ سے مدینہ منورہ چلے جائیں گے اور انشاءاللہ اگلا کالم وہیں سے لکھیں گے۔یہ دیکھئے خانہ کعبہ سے مغرب کی اذان کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ہمیں اجازت دیجئے۔

(''سیاست۔''۵/مئی ۱۹۹۶ء)

ہم مدینہ سے بول رہے ہیں

حضرات ! پچھلے ہفتہ ہم خانہ کعبہ سے باہر آئے تھے اور اپنا کالم لکھا تھا۔ لکھتے لکھتے گاہے بہ گاہے خانہ کعبہ کے باب عبدالعزیز کے میناروں پر نظر پڑتی تھی تو احساس ہوتا تھا کہ ہم خدا کے گھر میں ہیں اور آج ہم مدینہ کے اوبیرائے ہوٹل کی نویں منزل میں بیٹھے ہیں۔ کمرہ کی کھڑکی کھلی ہے اور سامنے، جی ہاں بالکل ہی سامنے، ساری کی ساری مسجدِ نبویؐ نظر آرہی ہے۔ اس کا ایک ایک مینار، اس کی محرابیں، گنبدیں، روضۂ مبارک، جنت البقیع سب کچھ نظروں کے سامنے ہیں اور ہم سوچ رہے ہیں کہ خدا اور اُس کے رسولؐ دونوں کی شان ہی نرالی ہے۔ خدا ہر جگہ موجود ہے لیکن صرف اپنی ایک جھلک دکھانے پر اکتفا کر جاتا ہے اور اس کے رسولؐ کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح سب کے سامنے موجود ہے اور اس زندگی کا ایک ایک لمحہ تاریخ عالم کے تسلسل کا امین ہے۔ ہمیں یوں لگ رہا ہے جیسے یہ مسجدِ نبویؐ نہیں ہے بلکہ رسولِ اکرم ﷺ کی مبارک زندگی پر مبنی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ رسولِ خدا یہاں چل پھر رہے ہیں، عبادت کر رہے ہیں، مسجدِ نبویؐ کی تعمیر کے لئے کھجور کے تنوں اور پتوں کو اکٹھا کر رہے ہیں، اپنے صحابہ کے سامنے کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں، وفود سے ملاقات کر رہے ہیں، وہ اصحاب صفہ کے درمیان سے گذر رہے ہیں، حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مشورہ کر رہے ہیں، حضرت علیؓ سے محو گفتگو ہیں۔ یہی وہ مسجد ہے جس کا نہ صرف سنگِ بنیاد رسولِ خدا نے رکھا بلکہ اس کی تعمیر میں بھی حصہ لیا۔ یہاں سے اُنھوں نے دینِ اسلام کی اشاعت کی جو آج دنیا کے کونے کونے میں پایا جاتا ہے۔ یہیں ان کی

زندگی کے آخری ایام گذرے اور یہیں ان کی آخری آرام گاہ بھی ہے۔ رسول ﷺ کی مبارک زندگی کا ایک ایک لمحہ نہ صرف تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے بلکہ رُشد وہدایت کا ایک سرچشمہ ہے۔ قرآن میں جو بات اشاروں میں کہی گئی ہو اُس کی تفصیل اور تفسیر رسولِ اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ میں دیکھ لیجئے۔

تین دن پہلے خدا کے گھر میں مسلسل عبادتوں سے فارغ ہو کر مدینہ کی طرف چلنے لگے تو پروفیسر علی محمد خسرو نے کہا ''اب ہم خدا کے گھر سے نکل کر اُس کے رسول کے گھر کی طرف جارہے ہیں''۔ اس پر ہم نے کہا ''خسرو صاحب! یوں کہیے کہ ہم خدا کے گھر سے نکل کر اپنے ہی گھر کی طرف جارہے ہیں''۔ ہمارے اس جملہ پر شریف الحسن نقوی پھڑک اُٹھے۔ بولے'' سچ مچ رسول کا گھر ہمارا اپنا گھر ہے، دنیا کی عظیم ترین ہستی کا گھر جہاں ہم جیسے حقیر ترین انسانوں کو بھی سکون اور چین مل جاتا ہے''۔ اور یہ سچ بھی ہے کہ خانہ کعبہ میں جہاں خدا کے جلال و جبروت کا احساس ہوتا ہے وہیں مسجد نبوی میں رسول خدا کے جمال اور ان کی شخصیت کی دلنوازی اور دلاویزی کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ ذرا سوچئے خانۂ کعبہ میں طواف کے دوران تھوڑی دور پر ہمیں اپنی نوجوانی کا ایک دوست پورے چالیس برس بعد اچانک نظر آ گیا۔ اُس نے ایک نظر ہمیں دیکھا اور ہم نے اُسے۔ مگر نہ اُس نے ہماری خیریت پوچھی اور نہ ہی ہم نے اُس کی۔ وہاں کسے ہوش ہوتا ہے کسی کی خیریت پوچھنے کا۔ طواف کو ہر حالت میں جاری رہنا ہے، لگاتار چلتے رہنا ہے۔ اور لاکھوں لوگوں کے بیچ وہ نہ جانے کہاں کھو گیا۔ خانہ کعبہ میں انسان صرف ایک بندہ ہے، اپنے معبود کے سامنے صرف ایک عابد۔ اب آپ سے کیا بتائیں کہ پچھلے تین دنوں میں مسجد نبوی میں کتنے ہی لوگوں سے ہماری ملاقاتیں ہوئیں۔ کچھ ایسے جنھیں ہم جانتے تھے اور کچھ ایسے جنھیں ہم بالکل نہیں جانتے تھے۔ ہم اور پروفیسر علی محمد خسرو عصر کے بعد مسجد نبوی میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک شام پروفیسر خسرو مسجد نبوی کے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے کہ ایک نوجوان اُن کے پاس آیا۔ پوچھا'' کیا آپ پروفیسر علی محمد خسرو ہیں؟''۔ پروفیسر خسرو نے اثبات میں جواب دیا تو نوجوان نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اُن سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا'' آپ ہندوستانی وفد کے رکن کی حیثیت سے آئے ہیں نا۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ میرا نام اقبال ہے، حیدرآباد کا رہنے والا ہوں۔ مدینہ سے دو سو کیلومیٹر دور ایک چھوٹا سا مقام ہے وہاں کام کرتا ہوں۔ اکثر مدینہ آتا رہتا ہوں۔ مجھے

یقین سا تھا کہ آپ لوگوں سے مسجد نبوی میں ضرور ملاقات ہو جائیگی۔ آپ کے وفد کے ایک رکن مجتبیٰ حسین بھی غالباً آپ کے ساتھ آئے ہیں، ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے۔ مجھے تو روز نامہ 'سیاست' میں ان کے کالم سے ہی پتہ چلا کہ آپ لوگ سعودی عرب آئے ہوئے ہیں۔ میں ہفتہ میں دو تین دن مدینہ منورہ ضرور آتا ہوں۔ مسجد نبوی میں حاضری دیتا ہوں اور روز نامہ 'سیاست' خرید کر واپس چلا جاتا ہوں''۔ ہم پروفیسر خسرو سے کچھ دور بیٹھے تھے۔ جب انھوں نے ہماری طرف اشارہ کر کے کہا'' آپ جن سے ملنے کے مشتاق ہیں وہ آپ کے سامنے بیٹھے ہیں'' تو نوجوان بڑی تیزی سے ہماری طرف آیا اور گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا'' حضور! میں آپ کا اور آپ کی تحریروں کا مدّاح ہوں۔ حیدرآباد میں آپ سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ اللہ نے مسجدِ نبویؐ میں آپ سے ملاقات کرادی۔'' اقبال ہمیں نہایت مستعد اور باذوق نوجوان نظر آیا کہنے لگا'' میں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی کام کیا تھا۔ اس کے بعد دو سال تک نامپلی کے ہرشا ہوٹل میں رِسپشنسٹ کے طور پر کام کرتا رہا، پھر خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ سعودی عرب آ گیا''۔ غرض مسجدِ نبویؐ میں اپنے ایک چاہنے والے سے مل کر خوشی ہوئی۔ اس کے علاوہ کئی اور حیدرآبادی بھی ملے۔ کل شام ہماری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ جوڑوں میں درد بھی تھا۔ عشا کی نماز کے وقت ہمیں اُٹھنے میں ذرا سا تکلف ہوا تو اچانک ایک نوجوان نے اپنا ہاتھ ہمارے ہاتھ میں دے کر ہمیں جانماز سے اُٹھایا۔ نماز کے بعد جب اس سے بات چیت ہوئی تو معلوم ہوا کہ ازبکستان کا رہنے والا ہے اور جب اسے پتہ چلا کہ ہم تاشقند، سمرقند اور بخارا جا چکے ہیں تو بے حد خوش ہوا۔ چنانچہ فجر کی نماز میں وہ ڈھونڈھ کر ہمارے پاس آیا اور اپنا ہاتھ پھر سے ہمیں سہارا دینے کے لئے بڑھادیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مسجد نبوی میں ایسے ہی بے لوث انسانی رشتے اور تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ خانۂ کعبہ میں ہم نے ہر ایک کو احرام باندھے ہوئے دیکھا جب کہ مسجدِ نبویؐ میں آدمی اپنے اپنے ملک کا لباس پہنے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ تب احساس ہوتا ہے کہ مسجدِ نبویؐ کی چھت کے نیچے کتنی ہی قومیتوں کے لوگ رہتے ہیں۔

انڈونیشیاء، برطانیہ، بنگلہ دیش، پاکستان، ہندوستان، سوڈان، تیونس، مراقش، الجیریا، افغانستان، فلپائین، سنگاپور، امریکہ، فرانس، اسپین، ایران، تاجکستان، قزاقستان اور نہ جانے کن کن ملکوں کے لوگ یہاں آتے ہیں۔

مدینہ میں ہماری آمد کی خبر پھیلی تو پچاسوں حیدرآبادیوں کے فون آنے لگے۔ پہلا فون جلال الدین کا آیا جو ہمارے مرحوم صحافی دوست عارف الدین سلیم کے بھائی ہیں۔ اگرچہ ان سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی ہے لیکن مدینہ میں ہماری مصروفیات کے وہی نگران بنے ہوئے ہیں۔ ہم نے جب انہیں بتایا کہ ہم مرزا شکور بیگ صاحب کی مزاج پرسی کرنا چاہتے ہیں جو مدینہ کے ایک اسپتال میں زیر علاج ہیں تو انھوں نے فوراً اپنے دو دوستوں انوار الدین آرکیٹکٹ اور خورشید صدیقی سیول انجینئر کو روانہ کردیا کہ یہ آپ کو مرزا شکور بیگ صاحب کے پاس لے جائیں گے۔ مرزا شکور بیگ صاحب لگ بھگ پچھلے تیس برسوں سے ہر سال سعودی عرب آتے ہیں اور حج کا فریضہ ادا کر کے ہندوستان واپس ہوتے ہیں۔ مگر پچھلے دنوں مسجد نبوی میں عبادت کے دوران ایک نمازی ان پر گر پڑا اور وہ زخمی ہوگئے۔ کولھے کی ہڈی میں فریکچر آ گیا ہے۔ اب مدینہ کے ایک اسپتال میں زیر علاج ہیں۔ ہم مغرب کی نماز کے بعد ان کے ہاں پہنچے تو بے پناہ خوش ہوئے۔ ہم سے کہا ''مدینہ آئے ہو تو اب تمہاری زندگی میں ایک تبدیلی بھی آنی چاہیے، میں اس تبدیلی کو تم میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' مرزا شکور بیگ صاحب کے حوصلہ کی داد دیجئے کہ انھوں نے ہمیں مزاج پُرسی کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ نہ اپنی علالت کا ذکر کیا اور نہ ہی ہمیں مزاج پرسی کرنے کی مہلت دی۔ ماشاءاللہ اب وہ ٹھیک ہیں۔ مرزا شکور بیگ صاحب اُن لوگوں میں سے ہیں جنھیں دیکھ کر جینے اور ڈھنگ سے جینے کی اُمنگ ہر دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ ان ہی کے یہاں ہماری ملاقات احمد الدین اویسی سے بھی ہوئی، آج رات انھوں نے کھانے پر بلایا ہے۔ پچھلی بار بھی احمد الدین اویسی نے ہمارے اعزاز میں دعوت رکھی تھی۔ کل جلال الدین کے ہاں دعوت ہے اور مدینہ کی باقی شامیں بھی دیگر حیدرآبادیوں نے بُک کر رکھی ہیں۔ ہم نے کہا بھی کہ ہم حیدرآباد سے دور آئے ہیں تو اب حیدرآباد سے دور اور مدینہ سے قریب رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان حیدرآبادیوں کا کہنا ہے کہ وہ ایسے حیدرآبادی ہیں جو اب مدینہ کا حصہ بن گئے ہیں لہٰذا اُن سے ہمارے دور رہنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ مدینہ آ کر بھی ہم پھر سے حیدرآبادیوں میں گھر گئے ہیں۔ ہم 12 رمئی کو مدینہ سے جدہ چلے جائیں گے۔ جہاں جدہ کے حیدرآبادی ہمارا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔

☆☆

(''سیاست''، ۱۲رمئی ۱۹۹۶ء)

مدینہ میں انتخابی نتائج کو جاننے کی بے چینی

یادش بخیر! 1989ء میں ہمیں بزمِ اُردو جدہ کی پہلی اور آخری ہند پاک محفل طنز و مزاح میں شرکت کرنے کے لئے پہلی بار سعودی عرب آنے کا موقعہ ملا تھا۔ زندہ دلانِ حیدر آباد کے احباب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ جس دن ہم سعودی عرب پہنچے اسی دن عمرہ کی ادائیگی کے لئے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ خانہ کعبہ میں ہم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نماز ادا کر رہے تھے۔ امام صاحب نے جیسے ہی سلام پھیرا ایک صاحب نے جو حمایت اللہ کے برابر بیٹھے ہوئے تھے پوچھا ''قبلہ! یہاں سونے کا کیا بھاؤ ہے؟''۔ اس پر حمایت اللہ نے انھیں ڈانٹا ''جناب کچھ تو خیال کیجئے، یہ خانۂ کعبہ ہے۔ یہ عبادت کی جگہ ہے۔ سونے کا بازار نہیں کہ آپ یہاں سونے کا بھاؤ پوچھیں''۔ حمایت اللہ کی ڈانٹ کھا کر یہ صاحب چپ چاپ پچھلی صف میں طالب خوندمیری اور مصطفیٰ علی بیگ کے برابر جا کر بیٹھ گئے اور امام صاحب نے جیسے ہی دُعا ختم کی انھوں نے مصطفیٰ علی بیگ سے پوچھا ''قبلہ! یہاں سونے کا کیا بھاؤ ہے؟''۔ مصطفیٰ علی بیگ نے پہلے تو انھیں سونے کا بھاؤ بتا دیا۔ پھر کہا ''جناب! یہ اللہ کا گھر ہے۔ یہاں دنیاداری کی باتیں اچھی نہیں لگتیں''۔ اس پر ان صاحب نے مصطفیٰ علی بیگ سے کہا ''جناب! معافی چاہتا ہوں۔ آپ بھی تو آج صبح ہی سعودی عرب آئے ہیں مگر آپ کو یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ یہاں سونے کا کیا بھاؤ ہے۔ آپ بھی تو دُنیاداری کے معاملہ میں کچھ کم نہیں ہیں''۔ اس پر مصطفیٰ علی بیگ نے کہا ''حضور! میں نے تو ایرپورٹ پر اُترتے ہی سب سے پہلے سونے کا بھاؤ معلوم کر لیا تھا تا کہ خانہ کعبہ میں لوگوں سے ایسے بیہودہ

سوالات کرنے کی نوبت نہ آئے''۔

آج ہمیں اگر یہ بھولا بسرا واقعہ یاد آ گیا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس بار بھی کسی نے خانۂ کعبہ یا مسجدِ نبویؐ میں ہم سے سونے کا بھاؤ پوچھا ہے۔ اس واقعہ کے یاد آنے کی وجہ اصل میں ہندوستان کے عام انتخابات کے نتائج ہیں۔ آٹھ مئی کو صبح جب وطن عزیز میں رائے شماری کا آغاز ہوا تو مسجدِ نبویؐ میں ظہر کی نماز میں ایک صاحب نے امام کے سلام پھیرتے ہی ہم سے پوچھا '' کیوں صاحب! کچھ رائے شماری کے بارے میں پتہ چلا؟۔ کون آگے جا رہا ہے اور کون پیچھے ہے؟۔'' ہم نے کہا '' جناب والا! ہم تو ابھی تک اپنے گناہوں کی گنتی کرنے میں ہی مصروف ہیں۔ وطن میں ووٹوں کی گنتی کا کسے ہوش۔'' اور وہ صاحب اپنا سا منہ لے کر کسی اور طرف چلے گئے۔

حضرات! آج مئی کی دس تاریخ ہے اور ہم ابھی ابھی فجر کی نماز پڑھ کر حرم شریف سے واپس آئے ہیں۔ ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ پچھلے دو دنوں میں کوئی نماز ایسی گذری ہو جس میں کسی نے ہم سے رائے شماری کے بارے میں نہ پوچھا ہو۔ اس خصوص میں ہم اپنے بزرگ ساتھی مندوب کیپٹن عباس علی کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ماشاء اللہ اب 77 برس کے ہو چکے ہیں۔ اگرچہ مندوبین میں وہ سب سے عمر رسیدہ ہیں لیکن نوجوانوں کی سی پھرتی اور حوصلہ رکھتے ہیں۔ یہ وہی کیپٹن عباس علی ہیں جو 1977ء میں اُتر پردیش جنتا پارٹی کے صدر رہ چکے ہیں۔ ان کے کیپٹن کہلائے جانے کی وجہ دراصل یہ ہے کہ موصوف دوسری جنگ عظیم میں ہندوستانی فوج کے سچ مچ کیپٹن رہ چکے ہیں مگر جنوب مشرقی ایشیاء کے کسی محاذ پر انگریزوں سے بغاوت کر کے انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو گئے تھے۔ اپنی نوجوانی میں سبھاش چندر بوس سے بھی مل چکے ہیں۔ انگریزوں نے بھی انھیں حسب توفیق جیل میں رکھا اور بعد میں ایمرجنسی کے زمانے میں مسز اندرا گاندھی نے بھی انھیں ازراہ عنایت جیل میں بند رکھنا ضروری سمجھا۔ اگرچہ کیپٹن عباس علی اب عملی سیاست سے دور ہو چکے ہیں لیکن جب تک وہ ملکی سیاست پر بحث نہ کرلیں اُنھیں چین نہیں آتا۔ اُنھیں کانگریس کے بعض رہنماؤں سے خصوصی چڑ ہے اور اس چڑ کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب منٰی میں کیپٹن عباس علی ہمارے ہمراہ بڑے شیطان کو کنکریاں مارنے کے لئے چلے۔ جب تک شیطان کے قریب نہیں پہنچے تھے تو وہ بالکل نارمل تھے۔ لیکن جیسے ہی شیطان انھیں نظر آ گیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ ہم نے اور ہندوستانی سفارت گھر کے افسر رابطہ صادق حسین نے انھیں پکڑنے اور

تھامنے کی لاکھ کوشش کی مگر وہ کنکریاں مارنے والوں کی بھیڑ میں گھس پڑے۔ اس بھیڑ میں اچھے اچھے تنومند اور توانا لوگوں کا جانا ناممکن تھا مگر یہ آگے بڑھتے ہی چلے گئے۔ ہم نے دور سے دیکھا کہ وہ بھیڑ میں شیطان کے اتنے قریب پہنچ گئے تھے کہ یک جان دو قالب والا معاملہ نظر آنے لگا تھا۔ چنانچہ جو لوگ پیچھے سے شیطان کو کنکریاں مار رہے تھے وہ بلا مبالغہ کیپٹن صاحب کو لگتی چلی جا رہی تھیں۔ پھر انھوں نے نہایت غصہ سے شیطان کو کنکریاں ماریں اور جب کسی طرح بھیڑ میں سے واپس آئے تو مارے غصہ کے نہ صرف اُن کا چہرہ بلکہ اُن کا سارا وجود تمتما رہا تھا۔ منیٰ میں ہوٹل پر پہنچنے کے بعد جب وہ ذرا نارمل ہوئے تو ہم نے کیپٹن صاحب سے پوچھا "حضور! شیطان کو دیکھ کر آپ پر عجیب وغریب کیفیت کیونکر طاری ہوگئی تھی۔" زوردار قہقہہ لگا کر ایک کانگریسی رہنما کا حوالہ دیتے ہوئے کہا "جب میں شیطان کے قریب پہنچا تو مجھے شیطان میں اس کانگریسی رہنما کی شکل نظر آ گئی۔ اب میں آپے سے باہر نہ ہوتا تو کیا کرتا"۔ ڈائننگ ہال میں کیپٹن صاحب کھانے کے وقت بعض مخصوص کانگریسی رہنماؤں کو اپنی شیریں بیانی سے نوازتے رہتے ہیں۔ ایک دن ان کی شیریں بیانی کے دریا میں تلاطم آیا تو ہم نے کہا "کیپٹن صاحب! آپ آئے دن ہمارے بعض رہنماؤں کو نوازتے رہتے ہیں جب کہ آپ خود حکومت ہند کے خیرسگالی حج وفد کے رکن کی حیثیت سے یہاں آئے ہیں اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ایک صاحب کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ آپ فلاں کانگریسی رہنما کا حج بدل کرنے کے لئے یہاں تشریف لے آئے ہیں"۔ اس پر سب نے تو قہقہہ لگایا لیکن کیپٹن صاحب اچانک ناراض ہوگئے اور بولے "جناب! آپ تو نہایت خطرناک آدمی ہیں۔ آپ سے تو مجھے محتاط رہنا پڑے گا"۔ یہ کہہ کر کیپٹن صاحب اچانک ٹائلٹ روم کی طرف چلے گئے۔ اور یقین مانیے ہم معافی مانگنے کے ارادہ سے ان کے پیچھے پیچھے ٹائلٹ میں پہنچے تو دیکھا کہ کیپٹن صاحب آئینہ کے سامنے کھڑے ہنسے چلے جا رہے ہیں اور ہمارے جملہ سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ہمیں ٹائیلٹ میں دیکھ کر بہت سٹپٹائے اور بولے "حضرت! سب کے سامنے آپ کے فقرہ سے لطف اندوز ہونے کی ہمت نہیں پڑی۔ لہٰذا یہاں چلا آیا ہوں تاکہ اطمینان سے ہنس لوں۔ اب آپ یہاں سے چلے جائیں اور میری ہنسی میں مخل ہونے کی کوشش نہ کریں۔"

کیپٹن صاحب کی ذات بابرکات کا تفصیلی ذکر تو پھر کبھی ہوگا۔ اس وقت تو ہم ان کا ذکر رائے شماری کے سلسلہ میں کرنا چاہتے ہیں۔ اتفاق سے آٹھ مئی کو ہی اس دن کے 'عرب نیوز'

اور 'اُردو نیوز' میں ایک انتخابی سروے کی رپورٹ شائع ہوئی تھی جس میں پیش گوئی کی گئی تھی کہ انتخابات میں بھارتیہ جنتا پارٹی ملک کی سب سے بڑی پارٹی کے روپ میں اُبھرے گی اور کیا عجب کی وہی سرکار بھی بنائے۔ وفد کے سارے مندوبین نے صبح صبح یہ رپورٹ پڑھ لی تھی۔ ناشتہ کی میز پر سب موجود تھے لیکن کیپٹن عباس علی کہیں نظر نہیں آئے۔ جب ہم نے ان کی غیر موجودگی کی وجہ پوچھی تو حکومت ہند کے حج عہدہ دار مسٹر عبدالخالق نے بتایا کہ ان کی طبیعت ناساز ہے اور ڈاکٹروں کو طلب کیا گیا ہے۔ پتہ چلا کہ ان کا بلڈ پریشر اچانک بڑھ گیا ہے اور ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔ ہم ان کے ہاں گئے تو دیکھا کہ ہمیشہ چاق و چوبند اور پھرتیلے رہنے والے کیپٹن صاحب نڈھال پڑے ہیں۔ ڈاکٹروں نے انھیں کیا دوائیں دیں یہ ہمیں نہیں معلوم لیکن ہم نے علم طب سے عدم واقفیت کے باوجود ان کے مرض کی تشخیص کر لی۔ ہم نے مسٹر عبدالخالق سے کہا ''خالق صاحب! ان کی بیماری کا اصل سبب وہ انتخابی سروے ہے جو آج کے اخباروں میں شائع ہوا ہے۔ شام تک اگر آپ ان کے مزاج کے مطابق انتخابی نتائج کا بندوبست فرما دیں تو ان کی صحت خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔'' اور اتفاق دیکھئے کہ شام میں یہ ابتدائی اطلاعات آنے لگیں کہ کانگریس پارٹی کی حالت اتنی بُری بھی نہیں ہے اور یہ کہ نیشنل فرنٹ کے امیدوار بھی کئی حلقوں میں آگے چل رہے ہیں۔ اس اطلاع کو سن کر کیپٹن صاحب نے اچانک اپنے بستر علالت کو گول کیا اور اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ ہم نے دبی زبان میں پوچھا ''کیپٹن صاحب! جس کانگریس پارٹی سے آپ ناراض ہیں اس کی ابتدائی کامیابیوں پر آپ کو اتنا خوش ہونے کی کیا ضرورت ہے کہ صحت مند ہو کر بیٹھ جائیں''۔

بولے ''میاں! اگر کوئی آپ سے بڑے شیطان اور چھوٹے شیطان کے بیچ کسی ایک کا انتخاب کرنے کو کہے تو آپ کیا کریں گے۔ آپ یقیناً چھوٹے شیطان کا ساتھ دیں گے۔ میں بھی یہی کر رہا ہوں''۔

اتفاق سے مدینہ میں مقیم ہمارے ایک دوست نے ہمیں ایک ٹرانزسٹر لا کر دیا تھا کہ آپ چاہیں تو بی بی سی سے انتخابی نتائج معلوم کر سکتے ہیں۔ ہمیں تو انتخابی نتائج کو جاننے میں اتنی دلچسپی نہیں تھی لیکن کیپٹن صاحب کی وجہ سے ہمیں انتخابی نتائج کو جاننا ضروری ہو گیا تھا کیونکہ ہر تھوڑی دیر بعد ان کا فون آ جاتا تھا کہ بتایئے حضور! وطن عزیز میں کیا ہو رہا ہے۔

صاحبو! ہم ذرا دلجمعی کے ساتھ مدینہ میں عبادت الٰہی میں مصروف رہنا چاہتے تھے لیکن انتخابی نتائج نے ہماری تپسیا کو بھنگ کردیا۔ دوسری طرف ہمارے ایک اور ساتھی مندوب کو انتخابی نتائج سے بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ وہ بار بار ہم سے کہتے تھے کہ نئی دہلی بات ہو تو پوچھنا کہ دور درشن پر انتخابی نتائج کے اعلان کے دوران کون کونسی فلمیں دکھائی جارہی ہیں۔ بہرحال مدینہ میں قیام کے دو تین دن یوں ہی انتخابی نتائج کا حال معلوم کرنے میں بیت گئے اور اب تو خیر انتخابی نتائج کا رجحان بھی معلوم ہو چکا ہے اور کیپٹن صاحب نے نتائج کو جاننے کے باوجود اپنے آپ کو صحت مند رکھنے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے پہلے بھی کسی خاص پارٹی کے جیتنے کی دعا نہیں مانگی تھی۔ صرف یہ دعا مانگی تھی کہ ملک میں امن، چین اور سکون برقرار رہے، ملک ترقی کے راستہ پر گامزن رہے اور ملک میں کچھ ایسے سازگار حالات پیدا ہوں کہ ہمیں واپس جانے کے بعد پھر سے کوئی گناہ کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور یوں ہمارا خاتمہ بالخیر ہو۔ اور ہمیں یقین ہے کہ ہماری دعا ضرور قبول ہوگی۔

(''سیاست''۔ ۱۹؍مئی ۱۹۹۶ء)

دوبئ سے واپسی

صاحبو! پچھلے ہفتہ ہم دوبئ میں اپنا 'جشن' منوا کر بخیر و خوبی ہندوستان واپس آ گئے۔ دوبئ جانے سے پہلے ہم نے خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعاء مانگی تھی اے پروردگار، تیرے کرم کے صدقے ہم نے ملکوں ملکوں کی سیر کی ہے اور ہر جگہ سے سرخرو ہو کر ہی واپس لوٹے ہیں۔ اب دوبئ سے بھی ہمیں باعزت طور پر واپس آنے کی توفیق عطاء فرما۔ دیگر ملکوں کی حد تک ہم نے وہاں جانے کی دعاء تو ضرور مانگی تھی، لیکن وہاں سے واپس آنے کی دعاء تو بالکل ہی نہیں مانگی تھی۔ پھر بھی تو نے ہمیں وہاں سے واپس کر دیا۔ لیکن اس بار کسی ملک کو جانے سے پہلے ہی وہاں سے جلدی واپس آنے کی دعاء مانگ رہے ہیں۔

یارب العزت! دوبئ میں ہمارے قیام کو مختصر فرما، ایسے ویسے لوگوں سے ہمیں دور رکھ تاکہ واپسی پر ہم سے کوئی پوچھ تاچھ نہ ہو۔ حالانکہ پوچھ تاچھ اچھی بات ہے، کیونکہ کوئی ہم سے کچھ پوچھے تو ہم یہ تو بتا سکتے ہیں کہ ہمیں وہاں کتنی داد ملی، کس کس طرح لوگوں نے ہمیں سر آنکھوں پر بٹھایا لیکن ہم اس معاملہ میں بھی اپنے دل پر جبر کر لیں گے اور کچھ نہ کہیں گے۔ کیا کریں زمانہ ہی ایسا آ گیا ہے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

صدق دل سے مانگی گئی اس دعاء کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم پانچ دنوں میں ہی دوبئ سے

بخیر وخوبی واپس آ گئے۔ اور اس شان سے واپس ہوئے کہ ہمارے سامان سفر میں اُردو کتابوں اور رسالوں کے بنڈل موجود تھے۔ بلکہ دہلی کے ہوائی اڈہ پر ایک کسٹم آفیسر نے کتابوں کے ان بنڈلوں پر حقارت کی نظر ڈالتے ہوئے کہا: ''حضور! دوبئی سے آنے والے آپ پہلے مسافر ہیں جو اتنی ساری ردّی اور وہ بھی اُردو ردّی، گویا بہت ہی ردّی، اُٹھا کر لانے کے لئے دوبئی گئے تھے۔ جانے سے پہلے ہم سے ہی پوچھ لیا ہوتا''۔

خیر دوبئی کے ذکر کو جانے دیجئے۔ ہم تو اس وقت کوئی اور بات ہی آپ سے کرنا چاہتے ہیں۔ ہم پی۔آئی۔اے کی پرواز سے دوبئی گئے تھے اور روانگی سے چند گھنٹے پہلے ہمیں بتایا گیا کہ ہمارا جہاز پہلے کراچی جائے گا، جہاں ہمیں آٹھ گھنٹوں تک رکنا پڑے گا۔ پھر وہاں سے دوبئی کے لئے جہاز پکڑنا ہوگا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ ویسے تو ہمیں یہ سارا فالتو وقت کراچی ایر پورٹ پر ہی گزارنا ہوگا، پھر بھی کوئی رحمدل امیگریشن افسر مل جائے تو آپ کو ہوٹل میں بھی ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔ ہم یہ جان کر اپنا کلیجہ مسوسنے لگے کہ چند گھنٹوں بعد ہم وہاں ہونگے جہاں سے چند کیلومیٹر کے فاصلے پر خواجہ حمید الدین شاہد، شہر یار جلیس، مشفق خواجہ، جمیل الدین عالی، مشتاق احمد یوسفی، حمایت علی شاعر اور فاطمہ حسن کے علاوہ ہمارے بے شمار احباب موجود ہونگے اور انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا کہ ہم آٹھ گھنٹوں تک ان کی فضاؤں میں سانس لے کر گئے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی ہمیں اپنے دوست نارنگ ساقی کا خیال آیا، جو ہمارے حق میں الہ دین کے چراغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر یہ چراغ ایسا ہے جسے ہم روز ہی کسی نہ کسی سلسلہ میں رگڑتے رہتے ہیں۔ ہم نے ساقی کو فون کیا کہ یار ہم کچھ دیر بعد کراچی جا رہے ہیں۔ ہو سکے تو ہمارے بھتیجے شہر یار جلیس، خواجہ حمید الدین شاہد اور مشفق خواجہ کو فون پر اطلاع دے دینا۔ شاید ان سے ملاقات ہو جائے۔

پی۔آئی۔اے کی فلائٹ میں سوار ہوئے تو ہم نے روزنامہ 'جنگ' میں وہ اشتہار بھی دیکھا جو دوبئی میں ہمارے جشن کے سلسلہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے سوائے ہوائی جہاز میں دیکھنے کی کوئی اور گنجائش بھی نہیں تھی۔ کوئی اور ایر لائین ہوتی تو ہوائی حسیناؤں کو ہی دیکھ لیتے، لیکن پی۔آئی۔اے میں بطور خاص ایسی ایر ہوسٹس کو متعین کیا جاتا ہے جنہیں دیکھ کر آپ کا ایمان متزلزل نہ ہونے پائے۔ حُسن کی عدم موجودگی میں ہم پی۔آئی۔اے کے حُسنِ انتظام کی تعریف نہ

کرتے تو اور کیا کرتے۔ ڈیڑھ گھنٹہ بعد ہم کراچی کے ہوائی اڈہ پر اُترے تو دن کا ایک ہی بجا تھا۔ ٹرانزٹ لاؤنج میں کاؤنٹر پر جو ایمگریشن افسر نظر آیا، اس سے ہم نے اپنا اور اپنے چند ساتھیوں کا ماجرا سنانا شروع کر دیا۔ اس نے کہا: ''جناب! آپ کو ٹرانزٹ لاؤنج میں ہی اپنی اگلی پرواز کا انتظار کرنا ہوگا''۔

ہم نے کہا: ''اگلی پرواز میں پورے آٹھ گھنٹے باقی ہیں۔ اس وقت تک ہم یہاں کیا کریں؟''

ایمگریشن افسر نے پوچھا: ''قبلہ! آپ کی عمر اب کیا ہے؟''

عرض کیا: ''ترسٹھواں برس شروع ہو چکا ہے۔''

بولا: ''ترسٹھ برس میں آپ نے کیا کر لیا ہے جو ان آٹھ گھنٹوں میں آپ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ فکر نہ کریں، جس طرح ترسٹھ برس بیت گئے ویسے ہی یہ آٹھ گھنٹے بھی بیت جائیں گے''۔

ایمگریشن عہدیدار سے جب ہم بحث کر رہے تھے تو کچھ دور کیبن میں بیٹھا ہوا ایک سینئر عہدیدار ہمیں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ وہ اچانک اُٹھ کر کیبن سے باہر آیا اور بولا ''بتائیے میں آپ کی کیا خدمت انجام دے سکتا ہوں''

ہم نے سارا ماجرا اسے کہہ سنایا تو اس نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے عہدیدار سے کہا ''ان کا پاسپورٹ اور ٹکٹ لے کر تم اپنے پاس رکھ لو۔ میں انہیں لے کر ہوٹل جا رہا ہوں۔ رات میں جب یہ واپس آئیں گے تو انہیں پاسپورٹ اور ٹکٹ دے دینا''۔ یہ سب کچھ اسقدر آنا فانا ہوا کہ ہمیں یقین ہی نہ آیا۔ کون کہتا ہے آج کی دنیا میں فرشتے نہیں رہتے۔ موصوف کو جب پتہ چلا کہ ہم دہلی سے آئے ہیں تو کہنے لگے: ''میں تو خیر پاکستان میں پیدا ہوا، لیکن میرے دادا دہلی کے رہنے والے تھے۔ دہلی کے ایک مشہور کالج کے پرنسپل تھے۔'' جب انھوں نے اپنے دادا کا نام بتایا تو ہم نے کہا ''حضور! آپ کے دادا تو اپنی زندگی میں ہی ایک داستانوی کردار کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ ان کے شاگرد تو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، ان کے کچھ شاگردوں سے تو ہماری دوستی بھی ہے''۔ موصوف اپنے دادا کی تعریف پر ایسے خوش ہوئے جیسے ہم نے ان کی تعریف کر دی ہو، حالانکہ اس وقت تو وہ ہمارے لئے ان کے دادا سے کہیں زیادہ قابل تعریف تھے۔

ہم نے ان کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو بولے" دیکھئے جناب! آپ ادیب ہیں اور اگر کوئی ادیب یا فنکار سچا ہے تو اس کے قلم سے کبھی نفرت اور کدورت کے الفاظ نکل ہی نہیں سکتے۔ مجھے بتائیے آج تک کسی بڑے فنکار نے نفرت کا بیج بویا ہو"۔

ہمیں اپنے آپ کو بڑا فنکار ثابت کرنے کا بہترین موقع ہاتھ آیا تو فوراً بول پڑے "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمارے قلم سے تو آج تک نفرت کا ایک لفظ بھی لکھا نہ گیا۔" اس پر موصوف معنی خیز انداز میں ہنسنے لگے۔ اتفاق سے اُس دن کے اخبار میں ہندوستان اور پاکستان کے معتمدین خارجہ کی بات چیت میں تعطل کی خبریں شائع ہوئی تھیں۔ ان خبروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے:" اب دیکھیئے کہ دونوں ملکوں کے معتمدین خارجہ کی بات چیت میں تعطل پیدا ہوگیا ہے، لیکن آپ کی اور ہماری بات چیت میں تو تعطل پیدا نہیں ہوا۔ ان کی بات چیت رُکی ہے تو کیا ہوا۔ ہماری بات چیت تو جاری ہے۔"

اتنی دیر میں پی۔ آئی۔ اے کے عبوری مسافروں کے لئے مختص ہوٹل آ گیا تو ہم نے دیکھا کہ ہمارا بھتیجہ شہریار جلیس (ابراہیم جلیس مرحوم کا بیٹا) ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ گویا الہ دین کے چراغ نے اپنا کام کر دیا تھا۔ دس سال پہلے ہم جب کراچی آئے تھے تو ہمارا قیام شہریار کے پاس ہی تھا۔ عہدیدار موصوف ہمارے قیام کے سلسلہ میں عملہ کو ضروری ہدایات دینے چلے گئے تو ہم نے اپنے بڑے بھائی محبوب حسین جگر کی علالت اور ان کے آخری دنوں کے بارے میں شہریار کو بتانا شروع کیا۔ شہریار کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بولا:" آپ اب کچھ ذکر نہ کریں۔ قدرت کے جبر نے ہمیں ان باتوں کو برداشت کرنے کا عادی بنا دیا ہے۔ آپ کچھ اور بات کریں"۔ ہم نے اپنے دوسرے بھتیجوں کے بارے میں پوچھنا شروع کیا تو دیکھا کہ ایک پستہ قد بزرگ شیروانی میں ملبوس ہماری طرف چلے آ رہے ہیں۔ ہم انہیں پہچان تو نہ سکے لیکن اُن کے قد سے اندازہ لگایا کہ ہو نہ ہو یہ ہمارے کرم فرما اور محسن خواجہ حمید الدین شاہد ہیں۔ خواجہ صاحب خدا کے فضل سے اب باریش ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں اُنہیں پہچاننے میں دشواری پیش آئی۔ آتے ہی بغلگیر ہوئے تو بغلگیر ہوتے ہی چلے گئے۔ ان کا چہرہ ہماری پیٹھ کی طرف تھا۔ ہم نے بھانپ لیا کہ یہ ضرور دوسری طرف منہ کر کے رونے میں مصروف ہیں۔ ایسی بے ساختہ محبت کرنے والے اب دنیا میں ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ کہنے لگے" کیا بتاؤں اس وقت دل پر کیا بیت رہی ہے، عابد نہیں رہے، جگر

نہیں رہے۔ حیدر آباد تو میرے لئے اب خالی ہوتا جا رہا ہے۔ کیسے کیسے دوست اُٹھ گئے“۔

اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ حیدر آباد کے کئی احباب کے بارے میں فرداً فرداً پوچھا۔ شاہد صاحب اب ماشاء اللہ اسی سال کے ہو رہے ہیں، لیکن حیدر آباد کے لئے ان کی محبت بیس بائیس برس کے نوجوان کی سی ہے۔ کہنے لگے ”اپنے محبوب شہر حیدر آباد کو ایک بار دیکھنے کی بڑی آرزو ہے۔ دیکھو کب آنا ہوتا ہے۔“ شاہد صاحب کراچی میں رہ کر بھی حیدر آباد ہی کی زندگی جیتے ہیں۔ اپنے رسالہ 'سب رس' میں حیدر آبادی ادیبوں اور حیدر آباد سے متعلق مضامین کو دھڑا دھڑ چھاپتے رہتے ہیں۔ حیدر آباد ان کے اندر جتنا آباد ہے اتنا تو خود حیدر آباد میں بھی آباد نہ ہوگا۔ کہنے لگے: ”نارنگ ساقی نے ابھی کچھ دیر پہلے بتایا کہ تم کراچی سے گزر رہے ہو تو بھاگم بھاگ یہاں پہنچا ہوں“۔ ہم نے کہا ”شاہد بھائی! اس عمر میں آپ کو اتنی دور آنے کی زحمت دینے کو جی تو نہیں چاہتا تھا مگر کیا کروں“۔ بولے: ”اگر مجھے بعد میں پتہ چلتا تو ذرا سوچو کتنی کوفت ہوتی“۔ پتہ چلا مشفق خواجہ کسی چھوٹے سے آپریشن سے گزرے ہیں اور خیریت سے ہیں۔ ہم نے کراچی کے احباب کو ان کی معرفت پیام پہنچایا۔ ہم نے بادل ناخواستہ شاہد بھائی اور شہر یار کو رخصت کیا تو دیکھا کہ عہدیدار موصوف نے ہمارے لئے ایک اچھے سے کمرہ کا انتخاب کر لیا ہے۔ چونکہ یہ عبوری مسافروں کا ہوٹل ہے، اس لئے یہاں کمروں کی دیکھ بھال پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ مگر ہماری وجہ سے اس کمرہ کا ایرکنڈیشنر ٹھیک کر دیا گیا۔ پانی کی سپلائی بھی ٹھیک ہوئی، بجلی کے بلب بھی ٹھیک کئے گئے۔ ہم نے تو اس کمرہ کو کم سے کم استعمال کیا لیکن آنے والے مسافر ہمارے حق میں ضرور دعا کریں گے۔ ہم تھوڑی دیر آرام کرنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ بیرے نے بتایا کہ کوئی صاحب ہوٹل کی دیوار کے پاس ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ باہر نکل کر دیکھا تو عزیز گرامی ضیاء الحق قاسمی مدیر ماہنامہ 'ظرافت' نظر آئے۔ وہ ہم سے بے شمار باتیں کرنا چاہتے تھے لیکن دیوار حائل تھی۔ انہیں بھی ہمارے جشن میں دوبئی چلنا تھا لیکن ان کا کینڈا کا سفر بیچ میں حائل تھا۔ دیوار کی دوسری طرف کھڑے ہنستے اور مسکراتے رہے۔ دو چار دلچسپ لطیفے بھی سنائے جن پر ہم اُن سے ہاتھ ملانا چاہتے تھے لیکن کیا کریں بیچ میں دیوار حائل تھی۔ دیوار کو بیچ میں رکھ کر ہی ہم نے محبت کی باتیں کیں اور انہیں رخصت کیا۔ غرض خاصی خاطر تواضع کے بعد عہدیدار موصوف نے ہمیں پھر سے کراچی ہوائی اڈہ پر پہنچا دیا اور منٹوں میں سارے مراحل طے کرا دیئے۔

ہم مسافروں کے لاونج میں پہنچے تو ہندوستان اور پاکستان کے وہ سارے مزاحیہ شاعر نظر آئے، جنہیں دوبئی کی محفل میں شریک ہونا تھا۔ دلاور فگار، پروفیسر عنایت علی خاں، راغب مرادآبادی، انور مسعود، خالد مسعود، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، گلزیب زیبا، فاخرہ بتول، اوج کمال کے علاوہ ہندوستان کے ساغر خیامی، پاپولر میرٹھی، مختار یوسفی، بازغ بہاری، مسٹر لکھنوی سب کے سب موجود تھے۔ یہ سب مختلف پروازوں سے یہاں پہنچے تھے۔ گویا کراچی کے ہوائی اڈہ پر ہی جشن کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹہ کی پرواز کے دوران ہمیں بار بار عہدیدار موصوف یاد آتے رہے جن کی عنایت سے ہماری جھولی محبتوں سے بھر گئی تھی۔

(''سیاست'' ۵/اکتوبر ۱۹۹۷ء)

☆☆

جشن سے کس کو رُستگاری ہے

صاحبو! بالاخر وہ گھڑی آ ہی گئی جو نہ کسی کے ٹالے ٹلی ہے نہ ٹلے گی۔ آدمی سو سو جتن کرے، تدبیریں اختیار کرے پھر بھی ہونی ہو کر رہتی ہے۔ دعا فرمایئے کہ خدا ہمیں وہ صبر جمیل اور وہ حوصلہ عطا فرمائے جس کی مدد سے ہم اپنے ہی جشن کے صدمہ کو ہنسی خوشی برداشت کر سکیں۔ پچھلے ڈھائی تین برسوں سے متواتر یہ دھڑ کا سا لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب ہمارے جشن کا بلاوا آ جائے۔ ایک ایسا بلاوا جس کی آواز پر ہم جیسا 'صاحبِ جشن' بھی جس نے ہمیشہ دیگر 'صاحبانِ جشن' کا مذاق اڑایا ہو، دیوانہ وار لبیک کہتا ہوا دوڑ پڑے گا۔ شاعر نے کہا ہے ؎

'جشن' کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

پھر یہ بھی غور فرمایئے کہ ہمیں اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے کوئی میل دو میل نہیں بلکہ دوبئی تک دوڑتے ہوئے جانا ہے۔ پرانے قصّوں میں کوہ ندا سے آواز آتی تھی تو کوہ ندا بھی پاس ہی ہوتا تھا اور اس آواز پر لبیک کہنے والا بھی عموماً پہاڑ کے دامن میں ہی موجود ہوتا تھا۔ خیر اس زمانہ میں سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ آدمی ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اور اپنے اطراف حفاظتی پیٹی باندھے، گلے میں کیمرہ لٹکائے، ہوائی حسیناؤں کے جھرمٹ میں لبیک لبیک کہتا ہوا ہزاروں میل دور نکل جائے۔ پہلے کوہِ ندا سے آواز آتی تھی اب دشت ندا سے آتی ہے جہاں دوبئی واقع ہے۔ سنا ہے کہ دوبئی بڑا مالدار اور متمول ملک ہے جہاں دولت کی ریل پیل ہے لیکن ہم اُردو کے

شاعر اور ادیب تو دوبئی کو صرف اس حوالہ سے جانتے ہیں کہ یہاں کے 'جشن' نہ صرف پائیدار ہوتے ہیں بلکہ بہت بھی ہوتے ہیں۔ برصغیر میں تو اب ادیبوں اور شاعروں کے جشن منانے کی روایت ختم سی ہوتی جا رہی ہے کیونکہ وہاں ادب کو چلانا تو بہت دور کی بات ہے گھر گرہستی کو چلانا بھی دشوار نظر آنے لگا ہے۔ لہٰذا اب دوبئی ہی وہ 'جشن خیز' علاقہ رہ گیا ہے جہاں آئے دن ہم جیسوں کے جشن ہوتے رہتے ہیں۔ خدا بھلا کرے سلیم جعفری اور ڈاکٹر اظہر زیدی کا کہ ان کی کوششوں سے دوبئی میں 'جشن' منانے کی روایت کا آغاز ہوا۔ سلیم جعفری سنجیدہ شاعروں اور ادیبوں کو تاکتے ہیں اور ڈاکٹر اظہر زیدی مزاحیہ شاعروں اور ادیبوں پر نظر رکھتے ہیں۔

وطن عزیز میں بیٹھ کر جب ہم دوبئی میں اُردو ادیبوں اور شاعروں کے دھڑا دھڑ ہونے والے جشنوں کی روداد یں پڑھا کرتے تھے تو دل ہی دل میں ہنستے تھے کہ جب سارے قابلِ ذکر ادیب اور شاعر 'صاحب الجشن' ہو جائیں گے تو سلیم جعفری اور ڈاکٹر اظہر زیدی کا جو ہونا ہے وہ تو ہوتا رہے گا لیکن خود دوبئی کا کیا ہوگا۔ ہمیں یہ گمان بھی نہ تھا کہ اب خود ہماری بربادیوں کے مشورے آسمانوں میں ہونے لگے ہیں۔ ڈھائی تین برس پہلے ڈاکٹر اظہر زیدی نے ہمیں اس خطرہ سے آگاہ کیا تھا کہ وہ ہمارا جشن منانا چاہتے ہیں۔ ہم بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ فنکار کی عزت وطن سے باہر نکلنے کے بعد ہی ہوتی ہے۔ یگانہ چنگیزی کے بارے میں کسی نے کہا تھا۔

کوچہ گردِ لکھنؤ فخرِ عظیم آباد ہے

دیکھا جائے تو ہم بھی کوچہ گردِ دہلی وحیدر آباد ہیں مگر اب فخرِ دوبئی بننے جا رہے ہیں۔ وطن سے باہر فنکار کی ہونے والی عزت پر یاد آیا کہ کچھ برس پہلے ہمیں مشرق بعید کے ایک ملک میں جانے کا موقع ملا تھا۔ وہاں ہمارے کسی بدخواہ نے یہ افواہ اڑا دی کہ لکھنے پڑھنے سے ہمارا بھی کچھ تعلق ہے۔ سو ہمارے اعزاز میں وہاں ایک خیر مقدمی تقریب رکھی گئی۔ نہ ہم میزبانوں کی زبان جانیں اور نہ وہ ہماری۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی، جو ان کے پاس تھی اور اس سے کہیں زیادہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی جو ہمارے پاس تھی، اس سے کام چلانا پڑا۔ ایک صاحب نے انگریزی میں علامہ اقبالؔ کے بارے میں کچھ پڑھ رکھا تھا۔ سو انہوں نے اس محفل میں ہمارا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ علامہ اقبالؔ کے بعد ہم اُردو زبان کے بڑے شاعر ہیں۔ اس تعارف کے جواب میں ہم اپنی روایتی کسر نفسی اور عجز وانکسار کے مارے شرم سے پانی پانی تو ضرور ہوئے لیکن بہہ نہیں گئے۔

موصوف نے اپنی تقریر سے پہلے بہ نظر احتیاط ہم سے یہ بھی پوچھا تھا کہ علامہ اقبال کو تو ان کے مداح 'حکیم الامت' کہتے تھے۔ کیا آپ کو بھی آپ کے مدّاح کسی لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اس استفسار پر ہم نے کہا تھا کہ لوگ ہمیں بھی 'حکیم الامت' ہی کہتے ہیں لیکن ہم میں اور علامہ اقبال میں امتیاز برقرار رہے اس خیال سے 'حکیم الامت' سے پہلے 'نیم' کا اضافہ ضرور کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ صاحب ہمیں بار بار 'مسٹر نیم حکیم الامت' کہہ کر ہی مخاطب کرتے رہے۔ ہمیں یاد ہے کہ تقریب کے آخر میں ہم نے میر تقی میر کی ایک غزل اپنے نام سے سنائی تھی اور اس کے ترجمہ کے طور پر ہندوستان کے ایک غیر معروف انگریزی شاعر کی ایک طبع زاد نظم سنادی تھی۔ بلاشبہ ایسی بے ساختہ داد ہمیں آج تک کہیں نہیں ملی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وطن سے دور جب کسی فنکار کو عزت ملتی ہے تو لاعلمی اور بیگانگی کے سبب اس عزت میں چار چاند لگ جاتے ہیں

غرض ڈاکٹر اظہر زیدی نے جب ہمیں بتایا کہ برصغیر کے طنز و مزاح سے متعلق اُردو شاعروں کے وہ کئی جشن منا چکے ہیں اور اب نثر نگار کی حیثیت سے پہلے ہمارا جشن منانا چاہتے ہیں تو ہم نے دست بستہ عرض کی ''حضور! بیسویں صدی کا سب سے بڑا مزاح نگار تو خود آپ کے پاکستان میں موجود ہے۔ اس کام کے لئے پہلے انہیں پھانسیے تو کچھ بات بھی بنے۔'' بولے ''جناب! یہ تجویز میری نہیں خود مشتاق احمد یوسفی کی ہے۔'' اب کے ہم نے اپنے سر آئی بلا کو مشفق خواجہ پر ٹالنے کی کوشش بھی کر دیکھی۔ چند دنوں بعد جواب آیا کہ ان کی خواہش بھی یہی ہے کہ جشن کی سولی پر پہلے آپ ہی چڑھیں۔ ایسی ہی باتیں تو ہیں جن کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات بہتر نہیں ہو پا رہے ہیں۔ پھر بھی ہم نے آخری بہانے کے طور پر ڈاکٹر اظہر زیدی سے کہا ''حضور! جس طرح غائبانہ نماز جنازہ ہوتی ہے کیا اس طرح ہمارا غائبانہ جشن نہیں ہو سکتا؟''

بولے ''جناب آپ جنازہ اور جشن کا فرق بھی نہیں جانتے۔ جنازہ میں لوگ کسی کے گذر جانے کے بعد اس کی پیٹھ پیچھے تعریف کرتے ہیں اور جشن میں 'صاحب جشن' کے منہ پر تعریف کی جاتی ہے۔ آپ تو جہاندیدہ آدمی ہیں۔ اُردو معاشرہ میں منہ پر تعریف کرنے اور پیٹھ پیچھے غیبت کرنے کو ہمیشہ مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ آپ نہیں آئیں گے تو ہم کس کے منہ پر آپ کی تعریف کریں گے۔'' لہٰذا حضرات کیجئے ہماری تعریف اور یہ رہا ہمارا منہ۔

یادش بخیر! ہمیں پھر ایک پرانی بات یاد آ گئی۔ تیس پینتیس برس پہلے حیدر آباد دکن کی ادبی دنیا میں دو دوست ایسے نمودار ہو گئے تھے جو اُردو شاعری کے دلدادہ اور اُردو شاعروں کے بہی خواہ سمجھے جاتے تھے۔ ایک بار ان دونوں نے سوچا اور جائز طور پر سوچا کہ کیوں نہ حیدر آباد کے بعض بزرگ شاعروں کے جشن منائے جائیں۔ اس معاملہ میں ان کے ارادے نیک تھے اور نیّت بھی اچھی تھی۔ لیکن ان کی جانب سے منائے جانے والے جشنوں کے ساتھ بدبختی یہ رہی کہ یہ جس کسی شاعر کا جشن مناتے تھے تو وہ مہینہ بھر کے اندر ہی اللہ کو پیارا ہو جاتا تھا۔ ایک جلد باز شاعر تو ایسے بھی نکلے جو بمشکل تمام تین چار دن بھی اپنے جشن کی تاب نہ لا سکے اور اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ بعد میں تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ جیسے ہی کسی شاعر کا جشن شروع ہوتا تھا گورکن حفظِ ماتقدم کے طور پر پھاوڑے اور کدالیں لے کر جشن میں چلے آتے تھے۔ خدا علامہ حیرت بدایونی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ایسے زندہ دل اور بذلہ سنج بزرگ تھے کہ ہم جیسے نوجوانوں کی زندہ دلی ان کے آگے پانی بھرتی تھی۔ انھوں نے ہی بہت سوچ بچار کے بعد جشن منانے والے ان دونوں دوستوں میں سے ایک کا نام 'کفن' رکھا تھا اور دوسرے کا 'دفن'۔ ایک دن کہنے لگے "میاں! آج کفن دفن دونوں آئے تھے۔ ذرا ان کی دیدہ دلیری تو دیکھو کہ اب میرا جشن بھی منانا چاہتے ہیں۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ میں طبعی موت مرنا پسند کرونگا اور جشن کے ہاتھوں بالکل نہیں مارا جاؤنگا۔" یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ اب تو علامہ بھی ہمارے درمیان نہیں رہے۔ میاں کفن بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں البتہ دفن میاں ابھی بقیدِ حیات ہیں۔ خدا انہیں عمرِ خضر عطا فرمائے۔

لیجئے ہمیں ایک اور صحافی دوست کا جشن یاد آ گیا جو بہت دھوم دھام سے منایا گیا تھا۔ جشن سے پہلے یہ اعلان بھی کیا گیا تھا کہ ان کی خدمت میں معقول سا کیسۂ زر بھی پیش کیا جائے گا۔ نتیجہ میں جشن کے شرکاء میں ان کے پرستاروں کی تعداد کم اور قرضداروں کی تعداد زیادہ دکھائی دے رہی تھی۔ جشن کے آخر میں جب ان کی خدمت میں کیسۂ زر پیش کیا گیا تو ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کیونکہ اتنا بڑا کیسہ ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بلا مبالغہ تھیلے اور بوری سے بھی بڑا کیسہ تھا۔ دوسری طرف ہمارے صحافی دوست نے بھی اس کیسۂ زر کو یوں سنبھالا تھا جیسے کوئی ویٹ لفٹر Weight Lifter بھاری وزن کو اٹھاتا ہے۔ ان کی پیشانی اور کنپٹیوں پر اچانک اتنی رگیں پھول آئی تھیں کہ لگتا تھا ہم کسی بڑے ملک کے چھوٹے سے نقشہ میں دریاؤں

کے جال کو دیکھ رہے ہوں۔ بعد میں جب بڑے اشتیاق کے ساتھ اس کیسۂ زر کو کھولا گیا تو معلوم ہوا کہ کیسہ میں صرف کیسہ ہے اور زر کا دور دور تک کہیں کوئی پتہ نہیں ہے۔ البتہ اس کیسۂ زر میں سے جشن کے سوویز کی کئی کاپیاں اشتہارات کے بلوں کے ساتھ نکل آئی تھیں۔ کسی نے بتایا کہ جشن کے منتظمین کسی بات پر ہمارے دوست سے ناراض ہو گئے تھے اور اب اُن کی خواہش تھی کہ 'صاحب جشن' خود مشتہرین سے اشتہارات کی رقم وصول کریں اور اپنا زر آپ کمائیں۔ چنانچہ ہمارے دوست لگاتار دو برسوں تک اشتہارات کی رقم کی وصولی کے سلسلہ میں مشتہرین کے چکر لگاتے رہے۔ دنیا کی تاریخ کا یہ پہلا جشن تھا جو لگاتار دو برسوں تک جاری رہا۔ گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اس کا نام نہیں آیا یہ ایک الگ بات ہے۔ ایک دن ہمارے یہ دوست راستہ میں مل گئے تو ہمیں بے حد صحت مند نظر آئے۔ وجہ پوچھی تو بولے " پچھلے دو برسوں میں مشتہرین کے چکر لگانے میں اتنی جسمانی ورزش ہو چکی ہے کہ اب میری صحت خود بخود بہتر ہو گئی ہے اور اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ صحت، دولت سے بہتر ہوتی ہے۔ یوں سمجھو کہ جشن کے منتظمین نے میری خدمت میں کیسۂ زر نہیں بلکہ 'کیسۂ صحت' پیش کیا تھا"۔ صاحبو! ہم بھی کن جشنوں کا ذکر لے بیٹھے، ہمیں تو اپنے جشن سے مطلب رکھنا چاہیئے۔ پھر یہ تو وہ جشن ہیں جو وطن عزیز میں منعقد ہوئے تھے جہاں 'صاحب جشن' اور جشن منانے والوں کی مالی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ دوبئی کی بات الگ ہے۔ ڈاکٹر اظہر زیدی، ان کے رفقاء اور آپ سب نے جس محبت سے ہمیں یہاں بلایا ہے اس کے لئے ہم سراپا سپاس ہیں۔ دیار غیر میں آپ جس طرح اُردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور طنز و مزاح کو جس طرح فروغ دے رہے ہیں وہ ایک فال نیک ہے۔ اس کوشش میں ہمارا بھر پور تعاون ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے گا۔ تعاون سے ہماری مراد یہ ہے کہ اگر کوئی صاحب دوبارہ ہمارا جشن منانا چاہیں تو ہم اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود یہاں آنے کے لئے بسر و چشم تیار ہیں۔ آدمی کو پہلے جشن میں ہی ذرا جھجک سی محسوس ہوتی ہے۔ بعد میں تو وہ عادی ہو جاتا ہے۔ عصمت ایک بار لُٹ گئی تو سمجھو کہ ہمیشہ کے لئے لُٹ گئی۔ آخر میں دوبئی کے زندہ دلوں کو ہمارا سلام پہنچے کیونکہ وہ صحیح معنوں میں ہنسنا جانتے ہیں۔ ہم میں وہ ہنسی پیدا ہو ہی نہیں سکتی جو ریال اور درہم کو اپنی جیبوں میں رکھنے کے بعد آپ کے ہونٹوں پر پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ آدمی کو کب ہنسنا چاہیئے، کس طرح ہنسنا چاہیئے، کتنا ہنسنا چاہیئے اور کس پر ہنسنا چاہیے۔

ڈاکٹر اظہر زیدی اور ان کے رفقاء قابل مبارکباد ہیں کہ ان کے دم سے دوبئی میں خوشدلی، خوش ذوقی، خوش مذاقی، خوش کلامی اور خوش وقتی کی روایت نہ صرف برقرار ہے بلکہ مستحکم بھی ہو رہی ہے۔

(۱۹؍ستمبر ۱۹۹۷ کو دوبئی کی محفل میں پڑھی گئی تحریر)

(''سیاست۔''۲۱؍ستمبر ۱۹۹۷)

کچھ باتیں دوبئی کی

دوبئی میں ہمارا جو جشن ہوا تھا اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہیں گے کیونکہ اس کے بارے میں اخباروں میں خبریں آ چکی ہیں۔ اب اگر ہم اس کی مزید تفصیل بیان کریں گے تو ہمارا حال اس پنجابی شخص کا سا ہو جائے گا جو برسوں سے لندن میں مقیم تھا۔ جب بھی کسی انگریز سے کسی بات پر اُس کا جھگڑا ہوتا تھا تو وہ اسے انگریزی میں گالیاں تو دیتا تھا لیکن پھر بھی اس کی تشفی نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن وہ کسی انگریز سے کسی بات پر بے حد ناراض ہوا تو بڑی دیر تک انگریزی میں اُسے گالیاں دیتا رہا اور آگے کو نکل گیا۔ پھر نہ جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ پلٹ کر آیا اور And Moreover کہہ کر پنجابی زبان میں گالیاں دینے لگ گیا۔ اس نے یہ حرکت اس لئے کی کہ انگریزی میں گالی دی جائے تو وہ گالی کم اور خیر سگالی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اپنی زبان میں گالی دینے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ہم اپنے جشن کے سلسلہ میں یہاں کسی Moreover کی گنجائش نہیں رکھنا چاہتے، جو ہو چکا وہ ہو چکا۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں دوبئی کی محفل پاکستانی احباب نے سجائی تھی۔ اگرچہ دو چار ہندوستانی بھی اس میں شامل تھے لیکن کوئی حیدرآبادی موجود نہیں تھا۔ اب ہمارا معاملہ یہ ہے کہ دہلی میں حیدرآباد سے زیادہ عرصہ تک رہنے کے باوجود جہاں کہیں بھی جاتے ہیں حیدرآبادیوں کو ضرور ڈھونڈتے ہیں بلکہ دہلی میں بھی کسی دن کسی حیدرآبادی سے بات نہیں ہوتی یا ملاقات نہیں ہوتی تو لگتا ہے وہ دن ضائع گیا۔ خدانخواستہ ہمیں دوزخ میں بھی جانا پڑے تو وہاں سب سے پہلے حیدرآبادیوں کو ہی ڈھونڈیں گے۔ (اگرچہ

ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ آپ کو وہاں حیدرآبادیوں کو ڈھونڈنے میں زیادہ زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی کیونکہ یہ مخلوق وہاں آپ کو بہ کثرت مل جائے گی۔ ایسے دل جلوں اور حاسدوں کا بھلا ہم کیا جواب دیں)۔ بہر حال ہم دنیا میں جہاں کہیں بھی گئے پہلے حیدرآبادیوں کو ہی ڈھونڈا، دوبئی کی محفل میں بعض حیدرآبادی شعراء کو بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن وہ اس میں شرکت نہ کر سکے۔ ایک تو اس بات کا قلق کھائے جا رہا تھا۔ اوپر سے جب کوئی حیدرآبادی نظر نہ آیا تو ہم نے اپنے پاکستانی منتظمین سے ان کے بارے میں پوچھ ہی لیا، بولے "جناب! کم از کم اب تو آپ خود کفیل ہو جائیے۔ آخر کب تک آپ حیدرآبادیوں پر تکیہ کرتے رہیں گے۔ حیدرآبادی تو اب آپ کو محفل میں ہی ملیں گے۔" اس بات چیت کے بعد ہم اپنے کمرہ میں گئے تو فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ہم نے ریسیور اٹھایا تو ایک خاتون کی آواز آئی، بولیں "کیا طالب خوندمیری دوبئی آئے ہیں؟۔" ہم نے نفی میں جواب دیا تو پوچھا "اس محفل میں شرکت کے لئے حیدرآباد سے کون کون آیا ہے؟۔" ہم نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا "حیدرآباد سے تو بس ہم اکیلے ہی آئے ہیں۔" بولیں "مگر آپ تو دہلی سے آئے ہیں۔" ہم نے کہا "مانا کہ دہلی سے آئے ہیں لیکن حیدرآباد کے نکالے ہوئے تو ہیں۔ ہمیں بھی حیدرآبادی ہی سمجھئے، بتائیے ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟۔" بولیں "آپ کا بہت بہت شکریہ!" اور یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ ہمارے دل پر جو گذری ہوگی اس کا اندازہ آپ لگا ہی سکتے ہیں۔ اب بھلا بتائیے ایسی کیا بات ہوگی جو وہ صرف طالب خوندمیری سے ہی کرنا چاہتی تھیں اور ہم سے نہیں کر سکتی تھیں۔ دل پر جبر کر کے ہم کچھ دیر آرام کرنا ہی چاہتے تھے کہ پھر فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو آواز آئی "نانا جان! آپ کیسے ہیں۔ آپ نے پہلے سے آنے کی اطلاع ہی نہیں دی۔" اس غیر متوقع 'نانا جان' پر ہمیں سخت غصہ آیا۔ پردیس میں آپ اچانک نانا جان کہلائے جانے لگیں تو غصہ نہیں آئے گا تو اور کیا آئے گا۔ ہم نے سوچا کہ ضرور کوئی ہم سے مذاق کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا ہم نے غصہ سے کہا "یہ کیا مذاق ہے۔ ہم کسی کے نانا نہیں ہیں۔ آپ کون بول رہی ہیں؟۔" آواز آئی "نانا جان! آپ نے مجھے نہیں پہچانا، میں ریحانہ بول رہی ہوں، میں پچھلے مہینہ ہی گلبرگہ سے دوبئی آئی ہوں۔" تب ہمیں یاد آیا کہ ریحانہ ہماری مرحومہ بہن کی نواسی ہے۔ ابھی تین چار مہینے پہلے تو گلبرگہ میں اس کی شادی ہوئی تھی۔ ہمیں یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ دوبئی آ گئی ہے۔ کوفت ہوئی کہ بلاوجہ اپنی ہی نواسی کو ڈانٹ دیا، دنیا اب اتنی پھیلتی اور ساتھ ہی

ساتھ سُکڑتی جا رہی ہے کہ کون کہاں ہے اس کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ ہم نے اپنی نواسی سے ملنے کا وعدہ کیا تو اطمینان ہوا کہ چلو دوبئی میں کوئی حیدرآبادی نہ ملے تو نہ سہی ہماری نواسی تو یہاں موجود ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ دوبئی جانے سے پہلے جب ہم نے یونہی اپنے احباب کا حساب لگایا تو احساس ہوا کہ غالباً دوبئی میں ہمارا کوئی دوست نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو ہمارے پاس اس کا پتہ نہیں ہے۔ یوں بھی ہمارے کتنے ہی احباب ایسے ہیں جو دوبئی، ابوظہبی یا سعودی عرب جانے کی بجائے دوسری دنیا کی طرف نکل چکے ہیں۔ تاہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس سے پہلے ہم جس خلیجی ملک میں بھی گئے وہاں اپنے کسی نہ کسی دوست کے موجود ہونے کا ہمیں پہلے سے علم تھا بلکہ ان ہی کی دعوت پر وہاں جانے کا موقع بھی ملا۔ دوبئی جانے کے بعد احساس ہوا کہ دوبئی وہ جگہ ہے جہاں ہماری عمر کے لوگ ذرا کم ہی پائے جاتے ہیں۔ یہ جگہ تو نوجوانوں کے رہنے کی ہے۔ کھلا کھلا سا معاشرہ ہے، یہاں عام طور پر وہ پابندیاں نہیں دکھائی دیں جو عموماً خلیجی ممالک میں نظر آتی ہیں۔ ہم جس ہوٹل میں ٹھہرے تھے وہ امریکیوں اور دیگر یوروپی ممالک سے آئے ہوئے سیاحوں سے بھرا پڑا تھا۔ بازاروں میں بھی ان ہی کی ریل پیل نظر آئی۔ ہمیں تو دوبئی، ممبئی کی طرح نظر آیا۔ دیکھا جائے تو اب دنیا کے سارے شہر ایک جیسے ہوتے جا رہے ہیں۔ ہوٹلوں کا وہی انداز، بازاروں کا وہی رکھ رکھاؤ، ریستورانوں کی وہی جھلک، ٹریفک کی وہی رونق۔ دوبئی اور شارجہ دونوں اتنے پاس پاس ہیں کہ موٹر میں سیر کے لئے نکلنے کے بعد پتہ نہیں چلتا تھا کہ ہم اس وقت دوبئی میں ہیں یا شارجہ میں۔ بار بار پوچھنا پڑتا تھا۔

بہر حال دوبئی میں حیدرآبادیوں سے ہماری ملاقات محفل میں ہی ہوئی۔ ہم اپنا مضمون پڑھ کر تالیوں کی گونج میں نیچے اُترے تو ایک نوجوان نے بڑھ کر پر جوش مصافحہ کیا اور کہا ''میں منہاج ہوں، گلبرگہ سے میرا تعلق ہے، آپ کے پرانے دوست وہاب عندلیب کا بھانجہ ہوں۔'' کچھ دیر بعد ایک نوجوان نے نہایت مودبانہ انداز میں سلام کرتے ہوئے کہا ''آپ نے مجھے نہیں پہچانا، میں برق آشیانوی کا بیٹا ہوں۔'' اتنے میں ہمارے اطراف کچھ اور نوجوان جمع ہو گئے جن کا تعلق حیدرآباد سے تھا۔ ان میں سے ہر کوئی ہمارے کسی نہ کسی دوست کا بھانجہ تھا یا بھتیجہ، بیٹا تھا یا نواسہ تھا۔ یہ سب عمروں کا کھیل ہے۔ ایک زمانہ میں ہم بھی کسی نہ کسی کے بھانجے اور بھتیجے کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ اب ماموں، چچا، خالو اور نانا کی حیثیت سے جانے

جاتے ہیں ۔ان حیدر آبادی نوجوانوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ بعد میں ہمارے ساتھ ایک گروپ فوٹو بھی کھنچوایا۔ بہت خوش تھے۔ ایک شام دوبئی میں مقیم ایک حیدر آبادی علم دوست افتخار احمد نے اپنے فارم ہاؤس پر جشن کے شرکاء کے اعزاز میں ایک پر تکلف دعوت کی ۔ وہیں ڈریفلکو کمپنی کے سلیم صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جن کا تعلق حیدر آباد سے ہے۔ دوبئی میں قیام کے ابتدائی چار دن تو ہم نے پاکستانی احباب کے ساتھ گذارے۔البتہ دوبئی کے قیام کے آخری دو دن ہم نے حیدر آبادی نوجوانوں کے ساتھ گذارے۔اپنی نواسی سے بھی مل آئے، ہمارے کرم فرما سعید بن محمد نقش مرحوم کے فرزند حامد نے بالاخر ہمیں ڈھونڈھ نکالا اور اپنی ایک فرلانگ لمبی گاڑی میں دوبئی اور شارجہ کی سیر کرائی، پھر اپنے گھر لے گئے۔ بیگم سعید بن محمد نقش اپنے بیٹے کے ساتھ دوبئی میں ہی مقیم ہیں۔ دو سال پہلے حیدر آباد میں سعید بھائی کی پینٹنگس کی نمائش جمیلہ نشاط نے آراستہ کی تھی تو اس وقت بھی حامد سے ملاقات ہوئی تھی۔ حامد نے ہماری خاطر چھٹی لے رکھی تھی ۔شام میں ہمارے دوست اور کرم فرما سید رحمت علی، سابق رکن پارلیمنٹ کے فرزند شوکت ہمیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے حامد کے گھر آ گئے ۔حامد اور شوکت دونوں بنک میں کام کرتے ہیں۔ بہت مصروف رہتے ہیں۔شوکت کو بہت عرصہ بعد دیکھا۔ جب تک رحمت علی صاحب دہلی میں رہے ان سے تقریباً روز ہی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ شوکت اس بات سے خوش تھے کہ رحمت علی صاحب نے پھر سے لکھنا پڑھنا شروع کر دیا ہے اور 'سیاست' میں ان کے مضامین پابندی سے چھپنے لگے ہیں۔ حامد اور شوکت سے مل کر ہمیں بے حد خوشی ہوئی۔ سعادت مندی کیسی ہوتی ہے اس کا اندازہ ہمیں ان دونوں کو دیکھنے کے بعد ہی ہوا۔اس رات ہمیں دہلی کے لئے روانہ ہونا تھا۔ شوکت کا بہت اصرار تھا کہ ہم ان کے گھر ضرور چلیں اور کھانا کھائیں ۔حامد کے گھر ہم نے اتنا سارا حیدر آبادی کھانا کھالیا تھا کہ دہلی واپس ہونے تک اب کسی کھانے کی حاجت نہیں تھی۔ پھر بھی شوکت بڑے پیار سے ہمیں اپنے گھر لے گئے اور بہو سے ملوایا۔دونوں کا اصرار تھا کہ ہم کچھ دن اور دوبئی میں رُک جائیں۔ ہوائی اڈہ پر جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ ہم نے بھاگم بھاگ شوکت کے ساتھ کچھ شاپنگ کی۔ پھر ہوٹل آئے تو منتظمین ہمارے منتظر تھے، بہجت نجمی تھے جن کا تعلق اتر پردیش سے ہے۔ نجم الحسن رضوی تھے جو خلیج ٹائمز کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں۔انہوں نے ہمارے بارے میں ایک مضمون بھی محفل میں پڑھا تھا۔ نجم الحسن رضوی نے بڑی محبت کے ساتھ اپنے

افسانوں کے مجموعے ہمیں دیئے۔ پانچ دنوں میں اتنے سارے لوگوں سے ملاقات ہوئی کہ ہمیں تو اب ان کے نام بھی یاد نہیں رہے۔ ہوائی جہاز میں بیٹھنے کے بعد ہم نے نجم الحسن رضوی کے افسانوں کی کتاب کھولی تو احساس ہوا کہ ہم تو ان کے افسانے عرصہ سے پڑھ رہے ہیں۔ یہ مجموعے پہلے مل جاتے تو ہمیں معلوم ہوتا کہ ہم اُس افسانہ نگار نجم الحسن رضوی سے مل رہے ہیں جن کے افسانے ہم شوق سے پڑھتے رہے ہیں، ہم تو انہیں صرف خلیج ٹائمز کا اسسٹنٹ ایڈیٹر ہی سمجھتے رہے۔ جب نجم الحسن رضوی سے ملنے کا اشتیاق ہم میں پیدا ہوتو ہم آسمان میں کئی ہزار فیٹ کی بلندی پر پہنچ چکے تھے۔ اس کی تلافی کے لئے سارے سفر میں ان کے افسانے پڑھتے رہے۔ محفلوں اور جشنوں میں یہی تو گھپلا ہوتا ہے کہ آدمی جب مل کر رخصت ہو جاتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ ہمیں تو اس آدمی سے ملنا چاہیئے تھا۔ مزاح نگار کبیر خاں کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ اسی لئے تو اب ہم جشنوں اور محفلوں سے حتی الامکان اجتناب کرنے لگے ہیں۔

(''سیاست،'' ۱۲/اکتوبر ۱۹۹۷)

نجم الحسن رضوی! تم کہاں ہو؟

نجم الحسن رضوی سے 18 ستمبر 1997ء کو دوبئی کی ایک ایسی محفل میں ملاقات ہوئی تھی جہاں دوبئی کی کئی ادب دوست اور اُردو نواز ہستیاں موجود تھیں۔ ڈاکٹر اظہر زیدی، ڈائرکٹر آرٹس پرموشن بیورو نے یہ محفل اصل میں اس مقصد سے منعقد کی تھی کہ دوسرے دن ہونے والے بین الاقوامی مشاعرہ اور ہمارے ہی جشن کی تفصیلات کو قطعیت دی جا سکے۔ محفل میں خاصے لوگ تھے جن میں سے اکثر کو ہم نہیں جانتے تھے۔ اس وجہ سے بہت سے لوگ ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے اور ہم اُن سے کہیں زیادہ حیرت سے اُنہیں دیکھ رہے تھے۔ ایسے میں ایک صاحب نے ہم سے کہا ''جناب! مجھے نجم الحسن رضوی کہتے ہیں''۔

ہم نے کہا ''اچھا تو آپ نجم الحسن رضوی ہیں۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔'' ہم نے یہ جملہ یوں ادا کیا جیسے وہ ٹونی بلیر ہوں، یاسر عرفات ہوں، بل کلنٹن ہوں یا کوئی ایسی مشہور شخصیت ہوں جنھیں پہلے سے جاننا ہم پر فرض بنتا ہو۔ لوگوں کی بھیڑ میں جب لوگ آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو ایسے ہی رسمی اور مصنوعی جملوں سے نپٹاتے ہیں۔ اُس وقت ہمارا ذہن اس طرف بالکل نہیں گیا کہ نجم الحسن رضوی پاکستان کے ایک طرحدار افسانہ نگار کا بھی نام ہے، جس کے افسانے پچھلی ڈھائی تین دہائیوں میں پاکستانی رسائل میں کبھی کبھار ہماری نظر سے گزرتے اور ہم سے خاموش داد بھی وصول کرتے رہے ہیں۔ ایسی صورتحال سے بچنے کے لئے ہی اکثر شاعر اور ادیب اپنے والدین کے رکھے ہوئے ناموں سے کنارہ کش ہو کر اپنے قلمی نام اختیار

کر لیتے ہیں۔ آج کون جانتا ہے کہ ساحر لدھیانوی کا اصلی نام عبدالحیٔ تھا۔ ندا فاضلی اپنے گھر میں مقتدا حسین کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ظ۔ انصاری اپنے والدین کی نظر میں صرف ظل حسنین تھے۔ یوں بھی ماں باپ جو نام رکھ دیتے ہیں انہیں ادب کی دنیا میں مشہور کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ خود ہماری مثال لیجئے کہ والدین نے ہمارا نام 'مجتبیٰ حسین' رکھ کر کہہ دیا کہ بیٹا جاؤ اور اس نام کو دنیا میں روشن کرو۔ چنانچہ ایک سعادت مند بیٹے کی طرح ہم غفلت میں اپنے اصلی نام کے ساتھ ہی ادب میں چلے آئے۔ اب جو ہم نے اس نام کو مشہور کرنے کی کوشش شروع کی تو پتہ چلا کہ عوام الناس ہمارے نام کا صحیح تلفظ ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ چنانچہ بیشتر عوام الناس آج بھی ہمیں 'مشتبہ حسین' کے نام سے ہی جانتے ہیں۔ والدین سے مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو کوئی مشکل نام سونپ کر چلے جاتے ہیں۔ پھر بھی ہمیں داد دیجئے کہ ہم نے اپنے اس مشکل نام کو اتنا مشہور کر دیا کہ کچھ برس پہلے جب پاکستان کے مشہور نقاد مجتبیٰ حسین کے انتقال کی خبر ریڈیو سے نشر ہوئی تو ہماری اہلیہ کے نام سینکڑوں تعزیتی خطوط وصول ہوئے جن میں خدا سے دعا مانگی گئی تھی کہ وہ ہماری اہلیہ کو صبر جمیل کا مادہ (قبل از وقت) عطا کرے۔ (حالانکہ ادیبوں اور شاعروں کے گزر جانے کے بعد ان کی بیواؤں کو اپنی زندگی گزارنے کے لئے کسی صبر جمیل کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ صبرِ جمیل کی ضرورت تو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب ادیب اور شاعر زندہ ہوں)

بہر حال اس محفل میں یہ احساس ہی نہ ہوا کہ نجم الحسن رضوی بھی اپنے والدین کے رکھے ہوئے نام کے ساتھ ہی ادب میں چلے آئے ہیں۔ نجم الحسن رضوی تو کسی کا نام بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے ہمارا نام ہے۔ پھر پاکستان کے افسانہ نگار نجم الحسن رضوی کا بھلا دوبئی میں کیا کام۔ کچھ دیر بعد محفل میں پھر آمنا سامنا ہوا تو نجم الحسن رضوی بولے "میں خلیج ٹائمس کا اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوں۔" اس پر ہم نے مزید گرم جوشی سے کہا "اچھا تو آپ خلیج ٹائمس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں۔" اس بار ہم نے خلیج ٹائمس پر زور دے کر اپنا جملہ یوں ادا کیا جیسے ہم خلیج ٹائمس کے سب سے پُرانے قاری ہوں بلکہ اُس وقت کے قاری ہوں جب یہ اخبار نکلنا بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ ہماری اس غیر ضروری گرمجوشی کو بھانپ کر نجم الحسن رضوی نے کہا "جناب میرا تعلق بھی آپ ہی کے قبیلہ سے ہے"۔

ہم نے کہا "اچھا تو آپ کا تعلق بھی وسط ایشاء کے اُس قبیلہ سے ہے جس سے ہمارے

آباواجداد کا تعلق رہا ہے۔ سنا ہے کہ اس قبیلہ نے تیرہویں یا چودھویں صدی میں وسط ایشیا میں بڑا قہر مچا رکھا تھا۔ لوگ اس قبیلہ سے پناہ مانگتے تھے بلکہ خود ہمارے جدِّ اعلیٰ اس قبیلہ کی بدنامی سے بچنے کے لئے سولھویں صدی میں درّہ خیبر کے راستہ سے ہندوستان آ گئے تھے اور یہاں آتے ہی اپنا لبادہ اتار کر اچانک نیک اور پاکباز بن گئے تھے۔ آدمی کو بگڑتے دیر تھوڑی لگتی ہے۔'' نجم الحسن بولے'' نعوذ باللہ بھلا میرا تعلق اس قبیلہ سے کیوں ہونے چلا۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا تعلق بھی 'قلم قبیلہ' سے ہے۔ کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہوں۔'' ہم نے ہنس کر کہا'' یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ جب آپ ایک اخبار کے اور وہ بھی انگریزی اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں تو قلم تو چلائیں گے ہی، اگر آپ کسی اردو اخبار کے صحافی ہوتے تو بات مختلف ہوتی کیونکہ اُردو کے اکثر صحافی قلم کا کم اور قینچی کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ ویسے آپ نے جس 'قلم قبیلہ' سے میرا اور اپنا تعلق پیدا کر رکھا ہے وہ بھی کچھ کم قہر انگیز نہیں ہے''۔ نجم الحسن ہماری بات پر ہنسنا ہی چاہتے تھے کہ ایک صاحب انہیں کسی ضروری کام سے بُلا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ پھر محفل برخاست ہوگئی۔

الغرض دوسرے دن ہمارے جشن کی تقریب شروع ہوئی تو ڈاکٹر اظہر زیدی کے اعلان سے معلوم ہوا کہ ہمارے یہی 'ہم قبیلہ' جناب نجم الحسن رضوی ہمارے بارے میں ایک مضمون پڑھیں گے۔ ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ نجم الحسن اُردو میں بھی لکھ لیتے ہیں۔ اب جو نجم الحسن رضوی ہماری تعریف میں رطب اللّسان ہوئے تو اس بیش بہا تعریف سے سامعین کا متفق ہونا تو بہت دور کی بات ہے خود ہمارا متفق ہونا بھی مشکل نظر آنے لگا۔ پھر بھی ہم نے ان کا مضمون محض اس لئے نہایت اشتیاق سے سنا کہ بہت خوبصورت اُردو میں لکھا ہوا تھا۔ ہم نے سوچا بھئی یہ ہمارے ہم قبیلہ تو قبیلہ کے سردار نکلے۔ انگریزی کے صحافی ہیں لیکن ذرا دیکھئے تو سہی کہ کتنی خوبصورت اُردو لکھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ دوبئی میں بیٹھ کر اپنی خوبصورت اُردو کو ہم جیسے بدصورتوں پر ضائع کر رہے ہیں۔ بہرحال جب ہم میں ان سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا تو معلوم ہوا کہ اپنا مضمون سنانے کے بعد وہ اگلے دن کا خلیج ٹائمس نکالنے کے لئے چلے گئے ہیں۔ جس رات ہمیں دوبئی سے دہلی کے لئے روانہ ہونا تھا وہ دن ہم نے حیدرآبادی عزیزوں کے درمیان گزارا۔ ہوائی اڈہ جانے سے عین آدھا گھنٹہ پہلے ہوٹل پر سامان اُٹھانے کے لئے بھاگم بھاگ آئے تو دیکھا کہ نجم الحسن رضوی ہوٹل کی لابی میں ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم قبیلہ ہونے کے ناتے ہم تو

ان سے ایسی گرم جوشی کے ساتھ بغلگیر ہوئے جیسے انہیں کبھی اپنی بغل سے آزاد نہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ لیکن کیا کریں۔ آدھا گھنٹہ بعد ہمیں وہاں سے روانہ ہونا تھا اور اپنا سامان سفر بھی باندھنا تھا۔ معلوم ہوا کہ نجم الحسن رضوی بڑی دیر سے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ جان کر اور بھی شرمندگی ہوئی۔ نجم الحسن رضوی نے ہمیں اپنے افسانوں کے دو مجموعے 'ہاتھ بیچنے والے' اور 'ٹر سے کا موسم' اور مزاحیہ مضامین کا ایک مسودہ بھی دیا جو عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ ہم نے عجلت میں نجم الحسن رضوی سے کہا "اچھا تو آپ افسانہ نگار بھی ہیں۔ یہ تو ہمیں معلوم نہ تھا۔" پھر عجلت میں ان کا شکریہ ادا کیا اور اس سے کہیں زیادہ عجلت کے ساتھ ان کتابوں کو اپنے سامان سفر میں رکھ لیا۔
جب ہمارا ہوائی جہاز تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گیا تو ہم نے اپنا حفاظتی بند کھولا اور اپنے سامان میں سے نجم الحسن رضوی کے مجموعے نکالے۔ ہماری نظر 'لوڈشیڈنگ' والے افسانے پر پڑی تو معاً خیال آیا کہ یہ افسانہ تو ہم نے کہیں پڑھ رکھا ہے۔ پھر اس افسانہ کا ایک جملہ بھی ہمیں یاد آ گیا "جس شہر میں لوگوں کو زندہ سلامت گھر پہنچنے کی ضمانت نہ دی جا سکے وہاں عورتیں بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتیں۔" ہم نے بڑے اشتیاق کے ساتھ ان افسانوں کو پڑھنا شروع کیا تو احساس ہوا کہ ان میں سے بعض افسانے نہ صرف ہماری نظر سے گزر چکے ہیں بلکہ ہم ان افسانوں کے سحر میں بھی گرفتار ہو چکے ہیں۔ ہم اپنا ماتھا پیٹ کر رہ گئے کہ یہ تو وہ نجم الحسن رضوی ہیں جن کے افسانوں کے ہم قتیل رہ چکے ہیں۔ اور ہم انہیں خواہ مخواہ 'خلیج ٹائمس' کا اسسٹنٹ ایڈیٹر سمجھ کر دوبئی میں ٹال آئے۔ ان سے تو ہمیں ڈھیر ساری باتیں کرنی تھیں۔ مگر اب پچھتائے کیا ہووت۔ کیونکہ وہ تو ہماری پہنچ سے سینکڑوں میل پیچھے رہ گئے تھے۔ ہماری ذہنی کیفیت اُن والدین کی سی ہو گئی جن کے بچے بعض اوقات کسی بات پر روٹھ کر گھر سے چلے جاتے ہیں تو والدین اخباروں میں اشتہار چھپواتے پھرتے ہیں کہ بیٹا تم کہاں ہو۔ تم بلاوجہ ہم سے روٹھ کر چلے گئے۔ فوراً واپس چلے آؤ۔ تم سے کچھ بھی نہیں کہا جائے گا۔ جب سے تم گئے ہو تمہاری والدہ کی حالت تشویشناک ہو گئی ہے۔ کھانا پینا بند کر رکھا ہے۔ آئسکریم تک نہیں کھا رہی ہیں۔" غرض اس ذہنی کیفیت سے نکلنے کے لئے ہم نے نجم الحسن رضوی کی دونوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔

نجم الحسن رضوی کا افسانہ سچ مچ کا افسانہ ہوتا ہے۔ لکھتے تو وہ بھی دلِ بے قرار کا افسانہ ہی ہیں لیکن کچھ اس طرح لکھتے ہیں کہ دل کو خود بخود قرار آ جاتا ہے۔ ہمارے بیشتر جدید

افسانہ نگاروں کے افسانوں میں اور تو سب کچھ ہوتا ہے لیکن افسانہ نہیں ہوتا۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کو وہ کچھ ایسی چابکدستی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ افسانہ کتاب سے نکل کر آپ کی فکر کا حصہ بن جاتا ہے۔ وہ اُن افسانہ نگاروں میں نہیں ہیں جن کے افسانے کتابوں میں محفوظ رہ جاتے ہیں کیونکہ یہ افسانے بعد میں پڑھنے والے کے زاویۂ گاہ کو متعین کرتے ہیں۔ علامتیں ان کے افسانوں میں بھی ہوتی ہیں لیکن یہ علامتیں ایسی نہیں ہوتیں کہ علامتی افسانہ ملامتی افسانہ بن جائے۔ نجم الحسن رضوی کو طنز و مزاح سے بھی خاصا شغف ہے اور جلد ہی ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ چھپ کر آنے والا ہے۔ اس میدان میں ان کا خصوصی رجحان 'پیروڈی' کی طرف ہے۔ نثر میں ہمارے ہاں پیروڈیاں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں شفیق الرحمٰن، کنہیا لال کپور اور احمد جمال پاشا کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ نجم الحسن رضوی کے بیشتر مضامین جیسے 'اُردو ادب کا جغرافیہ'، 'موسیقی کا پلاؤ'، پرچہ بے حساب' وغیرہ پیروڈی کے زمرے میں آتے ہیں۔ انھوں نے ایک ٹیلی ویژن مذاکرہ کی ایک خوبصورت پیروڈی بھی لکھی ہے۔ یہ مذاکرہ اصل میں 'معاشی نظام' کے بارے میں ہے جس کا عنوان نجم الحسن رضوی نے 'ہمارا بد معاشی نظام' رکھا ہے۔ یہ کہنا پڑے گا کہ برصغیر کا معاشی نظام دراصل بدمعاشی کے اطراف ہی گھومتا ہے، بظاہر یہ بالکل سامنے کی بات ہے لیکن جب تک نجم الحسن رضوی اس 'معاشی نظام' کا نام 'ہمارا بد معاشی نظام' نہیں رکھ دیتے تب تک یہ کُھلی بات واضح نہیں ہو پاتی۔ نجم الحسن رضوی لفظوں کے نباض ہیں اور ان سے کھیلنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ ہمیں اب رہ رہ کے یہ افسوس ہو رہا ہے کہ دوبئی میں نجم الحسن رضوی سے تفصیلی ملاقاتیں کیوں نہ ہو پائیں۔ محفلوں سے اب جی اس لئے گھبراتا ہے کہ ہجوم سے تو ملاقات ہو جاتی ہے لیکن فرد سے ملاقات نہیں ہو پاتی۔

(''سیاست۔'' ۱۴ر نومبر ۱۹۹۷ء)

☆☆

کچھ امجد اسلام امجؔد کے بارے میں

صاحبو! یہ تو ہم کہنا ہی بھول گئے کہ دوبئی سے واپسی کے سفر میں ہم نے کچھ گھنٹے لاہور میں بھی گزارے تھے۔ وہ لاہور جس کے بارے میں کہاوت ہے کہ ''جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔'' ہمیں اچانک بتایا گیا کہ دوبئی سے واپسی کے لئے ہماری نشست پی آئی اے کی جس پرواز میں بُک کرائی گئی ہے وہ پسینجر ٹرینوں کی سی شان رکھتی ہے۔ گویا یہاں نکلی وہاں ڈوبی، وہاں ڈوبی یہاں نکلی والا معاملہ ہے۔ پتہ چلا کہ پہلے تو یہ پرواز پشاور جائے گی اور وہاں سے لاہور جائے گی۔ پھر لاہور میں آٹھ دس گھنٹے آرام کرے گی اور وہاں سے دہلی کے لئے رختِ سفر باندھے گی۔ منتظمین نے سوچا تھا کہ ہم اس پیدل جانے والی پرواز کی بابت جان کر یقیناً ناراض ہونگے لیکن یہ سن کر ہماری باچھیں کھل اُٹھیں تو پوچھا ''آپ کی اس غیر متوقع خوشی کا راز کیا ہے؟'' ہم نے کہا ''اس خوشی کا راز یہ ہے کہ لاہور میں ہمارا دوست امجد اسلام امجؔد رہتا ہے۔ اس بہانے اس سے ملاقات ہو جائیگی۔ یہ نہ ملے تو احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، منیر نیازی، انور سدید، اظہر جاوید، اجمل نیازی کتنے نام گنائیں۔ کوئی نہ کوئی تو مل ہی جائیگا۔'' ہمارا ہوائی جہاز لاہور پہنچا تو صبح کے سات بج رہے تھے۔ ہم نے ایمگریشن عہدیدار سے کہا ''میاں ہمیں چاہے جس ہوٹل میں بھی ٹھہراؤ لیکن وہاں پہنچانے سے پہلے ہماری ایک خواہش کی تکمیل کرو یعنی ہمارے دوست امجد اسلام امجؔد سے ذرا ہماری بات کرادو۔'' پوچھا ''آپ امجد صاحب کو جانتے ہیں؟۔'' ہم نے اثبات میں جواب دیا تو بولا ''جناب ایسی بات ہے تو آپ بھی میری ایک خواہش کی تکمیل کریں۔

جب آپ امجد صاحب سے بات کریں تو آخر میں میری بات بھی کرادیں۔ وہ میرے پسندیدہ رائیٹر ہیں''۔ ایمگریشن افسر نے امجد کے گھر فون ملایا تو پتہ چلا کہ اس دن لاہور میں ہونے والی کسی سائنسی نمائش کے انتظامات کے سلسلہ میں امجد صبح صبح گھر سے نکلا ہے۔ (امجد ان دنوں اُردو سائنس بورڈ پاکستان کا ڈائرکٹر جنرل ہے۔ ہمارا دوست ہے تو کیا ہوا بڑی توپ چیز ہے)۔ ہم نے اس کی بیٹی کو اپنا حال سنایا اور بتایا کہ پی آئی اے والے ہمیں نہ جانے کہاں ٹھہرائیں گے۔ یہ ہم نہیں جانتے۔ امجد سے کہنا وہ پتہ کرلے اور دن میں تین بجے سے پہلے ہم سے مل لے۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی ورنہ یہ پنچھی اُڑ جائے گا۔ امجد کے گھر فون کرنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ایمگریشن افسر نے کسی سے کچھ کہا اور ہمیں ہوٹل ایگزیکیٹو کے اس کمرہ میں ٹھہرایا گیا جو خصوصی مہمانوں کے لئے مختص ہوتا ہے۔ یہ انگریزوں کے زمانہ کا ہوٹل لگتا ہے۔ کمرہ کے رکھ رکھاؤ اور فرنیچر وغیرہ سے ایسا لگتا تھا جیسے انگریز ابھی ابھی کمرہ سے باہر گیا ہے اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر کہے گا'' ویل تم ادھر میں کیسا آ گیا، چلو بھاگو یہاں سے''۔

امجد اسلام امجد اور عطاالحق قاسمی لاہور شہر کی دو ایسی کنجیاں ہیں جو ہمیشہ ہمارے پاس رہتی ہیں ورنہ ڈپلیکیٹ چابیاں تو کئی ہیں۔ عطاالحق قاسمی کے بارے میں تو معلوم تھا وہ اب پاکستان کا سفیر بن کر ناروے چلا گیا ہے (یوں بھی وہ پاکستان میں رہتا کب تھا۔ ہمیشہ باہر ہی گھومتا رہتا تھا) یہ اچھا ہی ہوا کہ اس کا تقرر ناروے میں عمل میں آ گیا ورنہ اسے مجبوراً بار بار پاکستان واپس آنا پڑتا تھا۔ دس برس پہلے ہم لاہور آئے تھے تو ہمارا قیام عطاالحق قاسمی کے پاس ہی تھا۔ عطا سے ہماری ملاقات سترہ اٹھارہ برس پہلے دہلی میں ہوئی تھی جب وہ غالباً ابنالہ کے مشاعرہ میں شرکت کی غرض سے ہندوستان آیا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد عطا پھر دہلی آیا تو امجد اسلام امجد بھی اس کے ہمراہ تھا۔ قہقہہ بردوش اور خندہ برلب عطا اور امجد کی دوستی بلکہ جوڑی بڑی پرانی ہے۔ گویا دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ ان کے ایک 'کرم فرما' تو یہاں تک کہتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے الزام اور ملزم کا درجہ رکھتے ہیں۔ موسیقی میں جس طرح شنکر جئے کشن اور کلیان جی آنند جی وغیرہ کی جوڑیاں مشہور ہیں اسی طرح اُردو ادب میں عطا اور امجد کی جوڑی بھی مشہور ہے۔ دونوں ایسے فقرے باز اور لطیفہ باز ہیں کہ اگر یہ کسی جگہ موجود ہوں تو ان دونوں کے سوائے کسی اور کا سنجیدہ رہنا ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ ہمیں دہلی اور لاہور

کی ایسی بیسیوں محفلیں یاد ہیں جن میں ان دونوں یارانِ طرحدار کی رفاقتیں ہمیں میسر آئیں (عطاالحق قاسمی تو حیدرآباد بھی آچکا ہے) ایسی ہی ایک محفل کے بعد ہمارے پیٹ میں سچ مچ کچھ اتنے بل پڑ گئے کہ انھیں کھلوانے کے لئے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ اس پر ڈاکٹر نے کہا تھا "زندگی میں پہلی بار پتہ چل رہا ہے کہ ہنسی صحت کے لئے مضر بھی ہوسکتی ہے"۔ امجد اسلام امجد پاکستانی ادب کا بہت بڑا نام ہے۔ وہ ایک پُرگو شاعر، صاحب طرز نثر نگار، ڈرامہ نگار، سفر نامہ نگار، کالم نگار اور کئی طرح کا نگار ہے۔ اس کا لکھا ہوا ٹی وی سیریل 'وارث' اتنا مقبول ہوا کہ اب یہ سیریل اس کی بنیادی شناخت بن گیا ہے۔ بہت برس پہلے دہلی میں جب امجد سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو ہم نے کہا تھا "یوں تو اسلام ہر جگہ خطرہ میں اور سخت مشکل میں ہے لیکن تمہارے نام میں تو یہ کچھ زیادہ ہی مشکل میں نظر آتا ہے کیونکہ تم نے اسے دو امجدوں کے بیچ میں پھنسا کر اس کا 'سینڈوچ' بنا رکھا ہے۔" ہنس کر بولا "میں نے اسے حفاظت کی خاطر دو ناموں کے بیچ میں رکھا ہے تاکہ جو بھی آنچ آئے تو وہ پہلے میرے نام پر آئے اسلام پر نہ آئے"۔

ہوٹل ایگزیکیٹو پر پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ ہمارے کمرہ کا ٹیلی فون کام کر رہا ہے۔ ہم نے مخدومی احمد ندیم قاسمی کو فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ گیارہ بجے کے بعد دفتر آئیں گے۔ انتظار حسین کو فون کیا تو خود انہوں نے فون اٹھالیا۔ جب ہم نے بتایا کہ ہم لاہور سے بول رہے ہیں تو حیرت میں پڑ گئے۔ پھر جب یہ پتہ چلا کہ ہم بہ وجوہ ان سے ملنے سے قاصر ہیں تو دُکھی بھی ہوئے۔ بار بار کہتے تھے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم لاہور آؤ اور مجھ سے نہ ملو۔ ان سے بہت ساری باتیں ہوئیں۔ ہم نے فون رکھا ہی تھا کہ امجد اسلام امجد کا فون آ گیا۔ بولا "یار تمہارا فون کب سے مصروف ہے۔ میں ملا ملا کر تھک گیا۔ پتہ نہیں تم کن غیر ضروری لوگوں سے باتیں کرنے میں مصروف ہو"۔ جب ہم نے بتایا کہ انتظار حسین صاحب سے باتیں ہو رہی تھیں تو خوب ہنسا۔ بولا "ابھی کچھ دیر پہلے میری بیٹی نے سیلولر فون پر تمہاری آمد کے بارے میں بتایا تو پی آئی اے کے سارے بڑے عہدیداروں کو پریشان کر کے تمہارے ٹھکانے کا پتہ لگایا ہے۔ میں ابھی تمہارے پاس آرہا ہوں۔"

پھر دس برس پہلے لاہور میں گزاری ہوئی کتنی ہی محفلیں یاد آگئیں۔ لاہور میں ہماری اکثر شامیں منیر نیازی کے گھر پر گزرتی تھیں جو راوی کے اُس پار اور کسی حد تک امرتسر سے قریب واقع ہے۔ پورے چاند کی ایک رات کو ہم برادر عزیز اجمل نیازی کے اسکوٹر پر منیر نیازی کے گھر

سے واپس ہو رہے تھے کہ راوی کے کنارے اجمل کا اسکوٹر پھسل کر گر پڑا۔ ہمارے پاؤں میں ہلکی سی چوٹ بھی آئی تھی اور اجمل نیازی اس چوٹ سے اس قدر حواس باختہ ہوگیا تھا کہ لگتا تھا یہ چوٹ ہمارے پاؤں میں نہیں دل میں لگی ہے۔ دس برس پہلے کا یہ واقعہ یاد آیا تو ہمیں ہنسی بھی آ گئی ۔ اجمل اس رات تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہمارے کمرہ میں آتا تھا اور ہماری چوٹ کا حال پوچھ کر چلا جاتا تھا۔ کیا مجال جو اس رات اُس نے ہمیں ذرا بھی سونے دیا ہو۔ ایک مرحلہ پر تو ہمیں کہنا پڑا ''یار اجمل! چوٹ میں تو ویسے کوئی تکلیف نہیں ہے لیکن تم جس طرح اس کا حال پوچھ رہے ہو تو اس سے اب چوٹ کا درد بڑھنے لگا ہے۔'' کہتے ہیں عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ لیکن اجمل ایسا عقلمند نکلا کہ اشارہ بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ دوسرے دن ہم نے عطا الحق قاسمی ، امجد اسلام امجد، حسن رضوی اور سعادت سعید کو یہ قصہ سنایا تو سب کا ہنس ہنس کر بُرا حال ہوگیا۔ ہم کتنے ہی کرم فرماؤں اور دوستوں کو فون ملانے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ امجد آندھی کی طرح آ گیا۔ اس دن اُردو سائنس بورڈ پاکستان کی طرف سے دن میں گیارہ بجے سائنسی کتابوں کی نمائش کا افتتاح ہونے والا تھا۔ کہنے لگا تم فوراً میرے ساتھ چلو۔ نمائش میں بھی شرکت کر لینا، پھر ہم دوستوں کی طرف چلیں گے اور ہاں تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کی 145 سائنسی کتابوں کے مسودے بھی اس نمائش میں رکھے گئے ہیں۔ کم از کم اب تو چلو۔ یوں امجد نے ہماری علاقائی عصبیت کو بھی چھیڑنے کی کوشش کی۔ امجد اپنی تازہ تصانیف کے ساتھ آیا تھا۔ کہنے لگا تمہیں کچھ اور چاہئے تو بتانا۔ ہم نے کہا یار تمہارا نوجوان مزاح نگار یونس بٹ ہمیں بہت اچھا لگتا ہے۔ اس میں حِسِ مزاح اتنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے کہ پتہ نہیں وہ خود اپنے آپ میں کس طرح اور کہاں رہ لیتا ہے۔ بس ذرا زبان کے استعمال کے معاملہ میں محتاط اور چابکدست ہو جائے تو کیا کہنے۔ امجد نے ہنس کر کہا'' اچھا تو اب تم جیسا حیدرآبادی بھی اہلِ زبان ہونے کا دعویٰ کرنے لگا۔'' ہم نے کہا'' پچیس برس تک دہلی میں رہنے کا یہی ایک نقصانِ عظیم تو ہوا ہے''۔ کراچی سے دوبئی جاتے ہوئے ہم نے طیارہ میں 'جنگ' کے ایک شمارہ میں پڑھا تھا کہ امجد نے احمد ندیم قاسمی کے بارے میں ایک دستاویزی فلم بنائی ہے۔ ہم نے اس دستاویزی فلم کے بارے میں پوچھا تو اپنا ماتھا پیٹتے ہوئے بولا'' میں تو بھول ہی گیا۔ تمہیں تو یہ فلم ضروری دینی ہے۔ تم کسی طرح اب میرے ساتھ چلو بلکہ کچھ دن لاہور میں رُک جاؤ۔ میں بندوبست کرائے دیتا ہوں۔'' ہم نے

کہا'' میاں امجد تم اُردو سائنس بورڈ کے ڈائرکٹر جنرل ہو۔ اب سے کچھ دیر بعد تمہارے دفتر میں سائنسی کتابوں کی نمائش ہو رہی ہے وہاں جاؤ اور اپنے فرائض منصبی کو پورا کرو''۔ ہنس کر بولا'' تم یہ بات اس طرح کہہ رہے ہو جیسے بالکل نہیں جانتے کہ برِّصغیر میں عہدیدارانِ اعلیٰ اپنے فرائض منصبی سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں۔'' ہم نے امجد کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے بھی ہمارے لئے اتنا سارا وقت نکال لیا۔ امجد کے جانے کے بعد ہم نے کچھ دیر آرام کرنا چاہا تو دروازہ پر دستک ہوئی۔ یہ امجد کا ڈرائیور تھا جس کے ذریعہ امجد نے احمد ندیم قاسمی سے متعلق دستاویزی فلم روانہ کی تھی۔ وہ گیا تو تھوڑی دیر بعد پھر دروازہ پر دستک ہوئی۔ اس بار لاہور کے گورا پبلشرز کے مینجنگ ڈائرکٹر افتخار احمد کا آدمی ہاتھوں میں کتابوں کا بھاری بنڈل اٹھائے کھڑا تھا۔ پتہ چلا امجد نے افتخار احمد کو یونس بٹ کی کتابوں میں ہماری دلچسپی کے بارے میں بتادیا تھا۔ یہ آدمی بیس پچیس کتابوں کا بھاری بنڈل اٹھائے کھڑا تھا۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ یونس بٹ اتنا کثیر التصانیف ادیب ہے۔ بہر حال چند گھنٹوں میں امجد نے جو محبت ہم پر نچھاور کی وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ جی تو بہت چاہا کہ ہم لاہور میں کچھ دن رک جائیں۔ لاہور صحیح معنوں میں پاکستان کا ادبی، ثقافتی اور سماجی مرکز ہے۔ کیسی کیسی نامور ہستیاں اس شہر نے پیدا کی ہیں۔ ان کے تصور ہی سے یہ شہر ہماری ذات میں پھیلنے لگ جاتا ہے۔ ہم نے ان سب کو یاد کیا اور لاہور سے اُڑان بھرنے کے پانچ دس منٹ بعد ہی ہندوستان کی فضاؤں میں داخل ہو گئے۔ سوچنے لگے آخر یہ کیسی قربتیں ہیں اور کیسے یہ فاصلے ہیں۔

('' سیاست۔'' ۲ رنومبر ۱۹۹۷ء)

ہم نے ایک ہی دن میں چار مرتبہ بریک فاسٹ کیا

صاحبو! لگاتار چوبیس گھنٹوں کے طویل ہوائی سفر کے بعد اب ہم کل سے امریکہ میں ہیں اور ابراہام لنکن کے شہر شکاگو کے ایک خوبصورت علاقہ ایلجن میں اپنے بھتیجے ڈاکٹر مجاہد حسین کے گھر میں بیٹھے یہ چند سطریں لکھ رہے ہیں۔ موسم بہار کی آمد آمد ہے، ننگے درختوں پر کونپلیں پھوٹ رہی ہیں، سبزہ و گل انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ فضاؤں میں ایک عجیب سی سرمستی، سرخوشی اور والہانہ
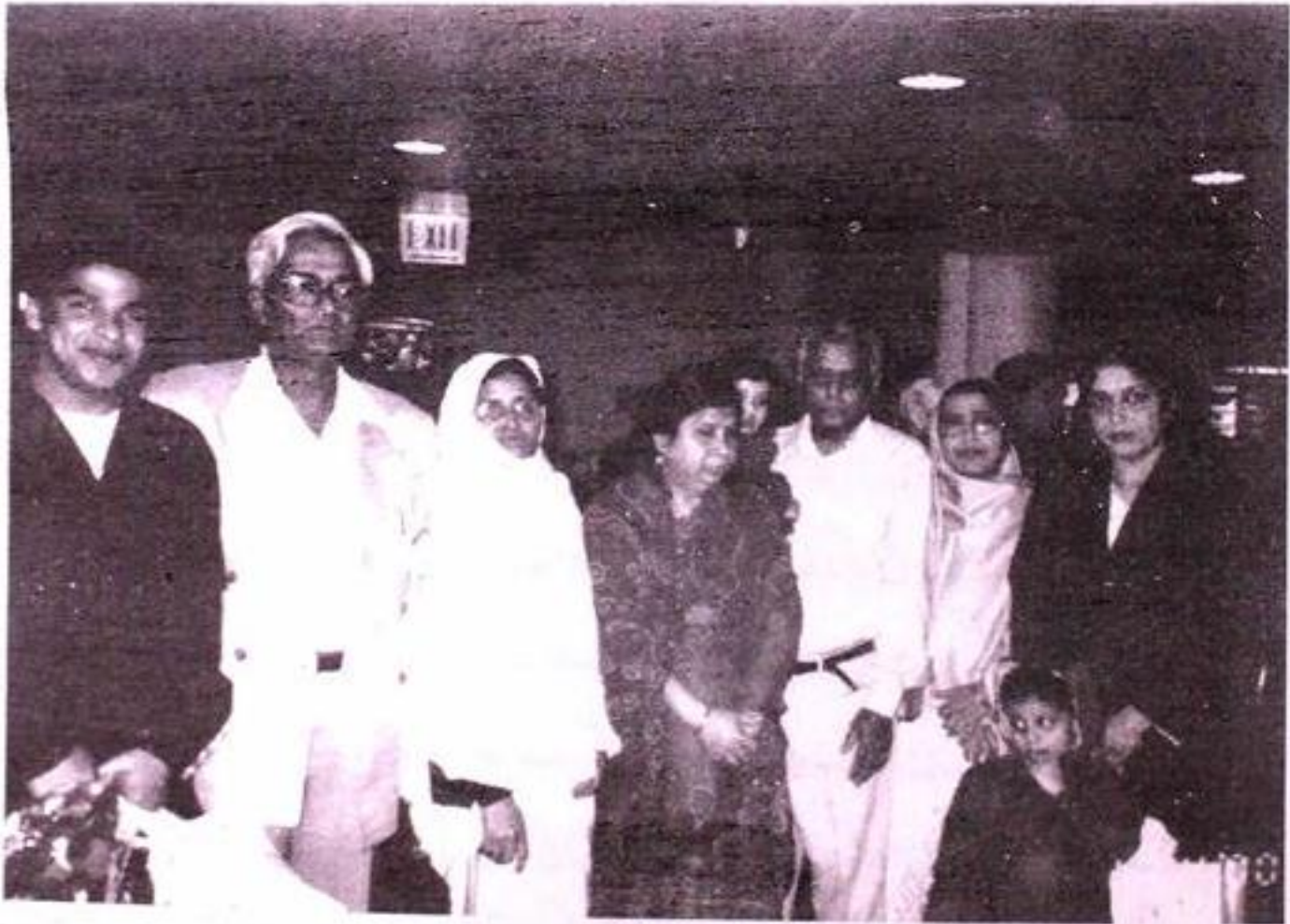
شکاگو ایئرپورٹ پر مجتبیٰ حسین اپنے امریکی ارکان خاندان اور رشتہ داروں کے ہمراہ

پن ہے۔ننگ دھڑنگ درخت جب پتوں کا لباس پہننا شروع کرتے ہیں تو امریکی اپنے لباس اُتارنا شروع کر دیتے ہیں اور لباسِ برہنگی زیب تن کر لیتے ہیں۔امریکی موسم کے حمام میں دو ننگوں کی نہیں ایک ہی ننگے کے رہنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ماشاءاللہ ہم نے بھی خاصی دنیا دیکھ رکھی ہے۔سولہ برس پہلے خود امریکہ کو بھی اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ چکے ہیں لیکن اس بار کی طرح کا لمبا ہوائی سفر کبھی نہیں کیا اور سورج کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے چوبیس گھنٹوں میں امریکہ پہنچے ہیں۔پچھلی بار لندن میں رُک کر یہاں آئے تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ چوبیس گھنٹوں کے سفر میں ہمیں چار مرتبہ بریک فاسٹ کرنا پڑا۔اصل قصہ یہ ہے کہ ہم 24 اپریل کو صبح میں سات بجے دہلی سے چلے تو ظاہر ہے کہ بریک فاسٹ کا وقت تھا۔سوکویت ایرلائنز کی ہوائی حسیناؤں نے ہمیں بریک فاسٹ سے نوازا۔تین چار گھنٹوں کی پرواز کے بعد کویت پہنچے تو وہاں بھی بریک فاسٹ کا وقت تھا۔لہٰذا ایک اچھے ہوائی مسافر کی طرح پھر بریک فاسٹ کھانے میں مشغول ہو گئے۔بعد میں جہاز دمشق کے اوپر سے پرواز کر رہا تھا تو پتہ چلا کہ وہاں بھی بریک فاسٹ کا وقت چل رہا ہے۔یہاں پھر ایک بار بریک فاسٹ پر ہاتھ صاف کیا۔ایمسٹرڈم پر رُکے تو سورج تب بھی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔شاید یہاں بھی بریک فاسٹ کا وقت رہا ہوگا۔ہم نے کھانے کی نوعیت سے اندازہ لگایا۔بہر حال راستہ بھر بریک فاسٹ کرتے کرتے شکاگو پہنچے تو سورج میاں تب بھی چھما چھم چمکے چلے جا رہے تھے۔غرض سورج کو ہم نے خوب تھکایا اور اسے ڈوبنے نہ دیا۔دوسری طرف ایرلائنز والوں نے بھی ہمیں خوب بریک فاسٹ کھلایا اور ہمارے لئے وقت کو روک دیا۔شکاگو ایرپورٹ سے باہر آئے تو تب ہماری گھڑی میں ہندوستان کی 25 اپریل کی صبح کے سات بج رہے تھے اور ہم چوبیس گھنٹے گذارنے کے بعد بھی اپریل کی 24 تاریخ کے ہی مزے لوٹ رہے تھے۔اس طرح ہماری حیاتِ مختصر میں ایک اور فاضل دن کا اضافہ ہو گیا ہے۔ہمارے ہاں جب رات ہوتی ہے تو یہاں پر دن،نتیجہ میں یہاں امریکی دن دھاڑے وہ کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو ہم عموماً رات کو انجام دیتے ہیں۔ویسے امریکہ ترقی یافتہ ملک ہے۔یہاں دن رات کی تخصیص اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ایسی تخصیص تو ہم جیسے پسماندہ ممالک کے باشندوں کے لئے ہوتی ہے۔

ہم ایمگریشن سے باہر آئے تو یوں لگا جیسے ہم شکاگو کے ایرپورٹ پر نہیں بلکہ بیگم پیٹ کے ہوائی اڈہ پر ہیں۔ایک طرف دوستوں کی بھیڑ تھی اور دوسری طرف رشتہ داروں کا جمگھٹا تھا۔

سب سے پہلے ہمارے دوست حسن چشتی نے ہمیں ایک گلدستہ پیش کیا اور بغلگیر ہوئے۔ ان سے پورے دس برسوں بعد ہماری ملاقات ہوئی۔ حسن چشتی کو ہم ان کی مستعدی، تیزی، پھرتی، عجلت اور لپک جھپک کی وجہ سے حسن چُستی کہتے ہیں۔ ستر برس کے ہو جانے کے باوجود ان کی چُستی نوجوانوں کو بھی شرمسار کر دیتی ہے۔ ان کے علاوہ ملک سعیدی، نعمت اللہ حسینی، شاہد اسحاقی، خلیل الزماں، بیگم خلیل الزماں، عباس علی خان، پرویز یداللہ مہدی، ناظم الدین سلیم، زین العابدین، احمد خان، غوثیہ سلطانہ اور ہمارے بچپن کے دوست ڈاکٹر خورشید خضر وغیرہ موجود تھے۔ کتنے ہی برسوں بعد ان بچھڑے ہوئے دوستوں کو ایک ساتھ دیکھنے کا موقعہ ملا۔

یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

شکاگو کی تنظیم 'دی عثمانین' کے خلیل الزماں اور قیسی بھائی (عزیز قیسی مرحوم) کے چھوٹے بھائی احمد خاں سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی۔ خلیل الزماں نے یہاں ایک تنظیم 'دی عثمانین' کے نام سے قائم کر رکھی ہے جس کے تحت عثمانیہ یونیورسٹی کے قدیم طلبہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جاتا ہے۔ اُن اصحاب کو ایوارڈ بھی دیئے جاتے ہیں جنھیں غلطی سے کبھی عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا تھا اور جنھیں بڑی مشکل سے عثمانیہ یونیورسٹی کی ڈگری ملی تھی، انھیں بڑی آسانی سے ایوارڈ دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم بھی ایک بار اس تنظیم کے غائبانہ ایوارڈ سے نوازے جا چکے ہیں۔ جب غائبانہ نماز جنازہ ہو سکتی ہے تو غائبانہ ایوارڈ کیوں نہ ملے۔ ہم نے اخبار میں اس ایوارڈ کے ملنے کی خبر پڑھی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس ایوارڈ سے متعلق شیلڈ ہمیں پورے تین برسوں بعد ملی تھی۔ ظاہر ہے کہ شکاگو سے دہلی کا فاصلہ بھی تو بائیس تیئیس ہزار کیلو میٹر کا ہے۔ خلیل الزماں بڑی محبت سے ملے۔ ہم نے سوچا تھا کہ وہ ہار پہنانے کے بعد لگے ہاتھوں ہمیں ایوارڈ بھی دیں گے بلکہ ہم تو ایوارڈ کے انتظار میں کچھ دیر رُک بھی گئے تھے۔ نہیں ملا تو ہم نے ایوارڈ کے بارے میں پوچھ لیا۔ بولے پہلے شکاگو میں کچھ کر دکھایئے۔ ایوارڈ کے اہل بنیں تو ضرور دیں گے۔ یہ ایوارڈ ہے الیکشن کا ٹکٹ نہیں کہ جسے جی چاہا دیدیا۔

ہم پورے سولہ برس بعد شکاگو آئے ہیں۔ جب ہم یہاں آئے تھے تو یہاں اردو کی محفلوں کا چلن اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ اردو بولنے والے بھی کم تھے اور حیدر آبادی بھی کم تھے۔ ماشاءاللہ اب تو یہاں اردو کا ماحول اتنا پھیل چکا ہے کہ کُھلے عام ایک دوسرے کی غیبت کی جانے

لگی ہے۔ ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچی جاتی ہیں۔ ادب میں مقام کے تعین کی خاطر ادیبوں اور شاعروں کو لگاتار ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ بعض تو جگہ کے انتظار میں برسوں سے کھڑے ہیں۔ غرض معاصرانہ چشمکیں عروج پر ہیں، ہمیں یہاں آئے ہوئے ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں بیتے ہیں لیکن بلا مبالغہ پچاس سے زیادہ دوستوں سے ایک دوسرے کی بُرائیاں سن چکے ہیں۔ بہت مزہ آرہا ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے ہم امریکہ میں نہیں بلکہ ابھی تک ہندوستان ہی میں ہیں۔ وطن سے ہزاروں میل دور رہ کر بھی اپنی روایات کی پاسداری کرنا کوئی ہم ہندوستانیوں سے سیکھے۔

ایر پورٹ پر ایک طرف ہمارے بیسیوں رشتہ دار کھڑے تھے اور دوسری طرف ہمارے احباب موجود تھے۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کدھر جائیں۔ اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے والا معاملہ تھا۔ لیکن ہم عادت سے مجبور پہلے دوستوں کے جھرمٹ میں ہی گئے۔ کیوں نہ جاتے۔ آخر کو ان ہی لوگوں نے لے لینا دوپٹہ میرا۔ ہمارے بھائی حامد حسین اور عارف حسین اپنے سارے امریکن بچوں اور ان بچوں کے بچوں کے ساتھ موجود تھے۔ بعض کے تو نام بھی ہمیں یاد نہ تھے۔ کتنی ہی شکلیں اب بدل چکی ہیں۔ البتہ ہمارا ایک بھتیجہ (مبین) فلمی اداکار شاہ رخ خاں سے بالکل مشابہہ ہے۔ اس مشابہت کو دیکھ کر ہمیں اس کا نام یاد نہ رہا اور جب ہم نے بے خیالی میں اسے شاہ رخ خاں کہہ کر بلایا تو اس کی باچھیں بھی بالکل شاہ رخ خان کی طرح ہی کھل اٹھیں۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے وہ ہر ایک کے آگے ہماری 'مردم شناسی' کی تعریف کئے چلا جارہا ہے۔ اور ہماری خدمت کچھ اس طرح کر رہا ہے کہ اصلی شاہ رخ خاں بھی کیا خدمت انجام دے گا۔ ہمارے بھتیجے کو کیا پتہ کہ اسی 'مردم شناسی' میں ہماری کامیابی کا راز مضمر ہے۔

ہم نے ابھی اچھی طرح آرام بھی نہیں کیا ہے کیونکہ امریکہ کے مختلف شہروں سے ہمارے احباب کے بیسیوں فون آتے چلے جارہے ہیں۔ چشتی صاحب نے ہماری آمد کی خبر جو یہاں کے اخباروں میں چھپوادی تھی۔ لیکن ہمیں خوشی اس بات کی ہے کہ یہاں پہنچنے کے بعد ہمارے لئے جو سب سے پہلا فون آیا وہ منی سوٹا سے ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی صاحب کا تھا۔ ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی جو شکاگو سے ایک ہزار میل کی دوری پر رہتے ہیں، ہمارے ان اوّلین کرم فرماؤں میں سے ہیں جنھوں نے 1962ء میں ہماری ابتدائی مزاحیہ تحریروں کو نہ صرف پسند فرمایا تھا بلکہ

اپنے جونیئر ڈاکٹروں کو بھی پابند فرماتے تھے کہ وہ ہماری تحریروں کو پسند فرمائیں۔ ایسے بے لوث کرم فرما آج کے زمانہ میں کسے ملتے ہیں۔ چنانچہ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں دو بار ان کے طویل فون آچکے ہیں۔ عابد علی خان اور محبوب حسین جگر کا جب ذکر کرنے لگے تو ہمیں یہ احساس بھی ہوا کہ فون کی دوسری طرف شاید اُن کی آنکھیں اشک بار ہوگئی ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان کا حال کئی بار پوچھ چکے ہیں۔ ہم نے ڈاکٹر عبدالمنان کا چھ مہینے پرانا حال کچھ اس طرح بیان کیا جیسے یہ ابھی پچھلے ہفتہ کا حال ہو۔ لیکن وہ پھر بھی اتنے حال سے مطمئن نہیں ہیں اور کچھ سننا چاہتے ہیں۔ ہم خود حیران ہیں کہ قدرت بعض انسانوں کو محبت اور خلوص کی اتنی وافر دولت کس طرح عطا کر دیتی ہے۔

(''سیاست''۔ ۷ رمئی ۲۰۰۰ء)

ذکر امریکیوں کی خوش اخلاقی کا

اس بار ہمیں اتنی عجلت میں ہندوستان سے نکلنا پڑا کہ اہلِ وطن سے بہت سی ضروری باتیں کہنا بھول گئے۔ جس عجلت کے ساتھ ہم ہندوستان سے روانہ ہوئے ہیں اس کے بارے میں ہمارے ایک دوست نے تبصرہ کیا تھا کہ جس عجلت میں تم امریکہ جا رہے ہو اس سے تو یوں لگتا ہے کہ تم امریکہ جا نہیں رہے ہو بلکہ فرار ہو رہے ہو۔ بہر حال ہم جب بھی ملک سے باہر جاتے ہیں تو اہل وطن کو بعض ضروری مشوروں اور نصیحتوں سے ضرور نوازتے ہیں۔ ایک مشورہ تو یہی دیتے ہیں کہ ہمارے پیچھے کفایت شعاری پر عمل ہونا چاہیئے۔ اسراف اور فضول خرچی اچھی چیز نہیں ہے۔ دنیا کی کئی قومیں اسی چکر میں برباد ہوئیں۔ توکل اور قناعت پر عمل کرنا اور غریبی میں نام پیدا کرنا بہت بڑی بات ہے۔ مگر جس طرح کے اہل وطن کو ہم عموماً ایسے مشورے دیا کرتے ہیں انہیں ہم اس بار اپنے ساتھ ہی لیتے آئے ہیں۔ ہماری مراد اپنی اہلیہ سے ہے جو خود ہماری فضول خرچی پر نظر رکھنے کے لئے بطور خاص امریکہ آئی ہیں۔ مانا کہ دو مرتبہ سعودی عرب گئے تو تب بھی انہیں ساتھ لے گئے تھے۔ مگر یہ ایک الگ معاملہ ہے۔ وہاں کے تقاضے اور وہاں کی مجبوریاں الگ نوعیت کی ہوتی ہیں۔ تاہم جب جاپان، یوروپ اور امریکہ وغیرہ گئے تو انہیں ساتھ نہیں لے گئے۔ کیونکہ ایسی جگہوں پر بیویوں کو ساتھ لے جانے کو مستحسن نہیں سمجھا جاتا۔ بہر حال مرورِ زمانہ کے ساتھ اب ہم اتنے پاکباز اور نیک انسان بن گئے ہیں کہ کُھلے عام اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے کر مغرب میں گھومنے لگے ہیں۔

وطن سے نکلنے سے پہلے عموماً ہم اہلِ وطن کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ نیکی کے راستہ پر چلیں اور نیکی کے راستہ پر چلنے کے باوجود اگر ترقی کی کوئی صورت نکل سکتی ہو تو اس پر بھی عمل کریں۔ آپسی میل ملاپ اور بھائی چارہ کے ساتھ رہیں اور پڑوسیوں وغیرہ کا خیال رکھیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب صوفی سنتوں کے ایسے ہی مشوروں پر برسوں میں عمل نہیں ہوا تو تمہارے مشوروں پر کون عمل کرے گا۔ یہ اور بات ہے کہ ایسے مشورے ہم اس لئے نہیں دیتے کہ کوئی سچ مچ ان پر عمل کرنے بیٹھ جائے۔ مگر اس بار ہم خاص طور پر اُن شہروں کے اہلِ وطن کو بعض مشورے دینا چاہتے تھے جنہیں بل کلنٹن کے دورے کے پیش نظر صاف ستھرا بنایا گیا تھا۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے آنے تک ان شہروں کی صفائی برقرار رہے تاکہ امریکہ میں ڈھائی تین مہینے گزار کر ہم واپس ہوں تو ہمیں وہاں اپنی بقیہ زندگی گزارنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ ہم بھی کلنٹن کے تعاقب میں امریکہ چلے آئے ہیں۔ اس امید میں نہیں کہ ہماری آمد کے پیش نظر اُن امریکی شہروں کو صاف کیا جائے گا جہاں ہم جانے والے ہیں۔ اپنے شہروں کی صفائی کے لئے امریکی ہم جیسوں کی آمد کے منتظر نہیں رہتے۔ ہم سولہ برس بعد امریکہ آئے ہیں اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ امریکیوں نے اپنے شہروں کو حسبِ معمول صاف ستھرا برقرار رکھا ہے۔ ہر چیز اسی قرینے سے رکھی ہوئی ہے جیسی کہ ہم اسے چھوڑ گئے تھے۔ یہاں شہروں کی صفائی رات میں تین بجے اور صبح کے پانچ بجے کے درمیان ہو جاتی ہے۔ میونسپلٹی والے سڑک کو کب صاف کر جاتے ہیں کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ ہمارے ہاں صفائی والے ہفتہ میں ایک بار آنے کا وعدہ کر جاتے ہیں تو تین ہفتوں بعد نمودار ہوتے ہیں۔ پھر کوڑے کی گاڑی جتنا کوڑا کرکٹ اُٹھاتی ہے اُس سے کہیں زیادہ کوڑا کرکٹ محلّہ میں پھیلا کر چلی جاتی ہے۔

امریکیوں کی خوش اخلاقی کے ہم شروع ہی سے قائل ہیں۔ سلام کرنے میں ہر کوئی پہل کرتا ہے۔ اس بار یہ ہوا کہ پاسپورٹ نکالنے کے چکر میں ہم شکاگو ایرپورٹ پر امریکی ایمگریشن عہدیدار کو 'گڈ ایوننگ' نہ کہہ سکے۔ نتیجہ میں بیچارے نے خود ہی 'گڈ ایوننگ' کہا۔ پھر ایک منٹ میں ضروری مہریں لگا کر پاسپورٹ واپس کرتے ہوئے بولا ''مسٹر حسین آپ کا دورہ امریکہ کامیاب ہو۔'' بعد میں کسٹم کی ایک خاتون عہدیدار نے ہم سے پوچھا ''آپ ہندوستان سے کوئی پھل وغیرہ تو ساتھ نہیں لے آئے ہیں؟''۔ اب ہم اُسے کیسے سمجھاتے کہ 'صبر کے پھل' کے سوائے

زندگی بھر کسی اور پھل سے ہمارا سروکار نہیں رہا۔غرض کسٹم سے بھی ہم دومنٹ میں فارغ کر دیئے گئے۔تاہم اس مرتبہ ہماری صبح کی چہل قدمی کی عادت کی وجہ سے امریکیوں کی خوش اخلاقی کے جوہر ہم پر کچھ زیادہ ہی کھلنے لگے ہیں۔شکاگو کے تین مختلف علاقوں میں ہم چھ دنوں تک چہل قدمی کرتے رہے۔ ہر کسی نے سلام کرنے میں پہل کی ۔اب ہم پچھلے تین دنوں سے ڈیٹرائٹ میں اپنے بھائی خورشید حسین کے ہاں مقیم ہیں۔ایک ہفتہ کے تجربے کے بعد اب ہم سامنے سے آنے والے پر سلام کا حملہ کرنے کے معاملہ میں خود مکتفی ہو گئے ہیں۔ جب کہ وطن عزیز میں سلام، پیام اور کلام کے مراحل بڑی مشکل سے طے پاتے ہیں۔کالج کے زمانہ میں ہماری ایک ہم جماعت ہوا کرتی تھی جس کے حُسن کے چرچے ساری یونیورسٹی میں تھے۔یونیورسٹی کے زمانہ میں اُسے سلام کرنے تک کی ہمت ہم میں پیدا نہ ہوسکی۔ بہت عرصہ بعد کہیں آمنا سامنا ہوا تو ہم نے ڈرتے ڈرتے سلام کرنے میں پہل کردی۔ دوایک بار ادھر اُدھر سلام کرنے کا مزید موقع ملا۔لیکن پیام اور کلام سے تب بھی محروم ہی رہے۔ابھی سات آٹھ برس پہلے ان سے ذرا اطمینان سے کلام کرنے کی نوبت آئی تو احساس ہوا کہ موصوفہ 'مجموعہ کلام' میں تبدیل ہو چکی ہیں۔مشکل یہ ہے کہ ہم لوگ اس ضمن میں 'نامہ بر' وغیرہ کی خدمات سے استفادہ کرنے کے قائل رہے ہیں۔ساون کے بادلوں، بلبلوں، چکوروں اور بادِ صبا وغیرہ سے تک نامہ بری کا کام لینے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔

ڈیٹرائٹ کی پہلے دن کی چہل قدمی کے دوران ہی ہمارا آمنا سامنا ایک امریکی لڑکی سے ہو گیا جو خود بھی پیدل راستہ پر چہل قدمی فرما رہی تھی۔ ہم نظریں نیچی کر کے اور راستہ چھوڑ کے چلنے لگے تو اس نے قریب آتے ہی ایک دلنواز 'گڈ مارننگ' ہماری طرف اُچھال دیا۔کچھ دور جا کر ہم واپس ہونے لگے تو اس نے بھی واپسی کا قصد کیا۔جس رفتار سے وہ چل رہی تھی اس رفتار سے بھلا ہم پسماندہ ممالک کے لوگ کہاں چل سکتے ہیں۔جب ہمیں احساس ہوا کہ وہ ہمارے پیچھے آرہی ہے تو ہم نے اپنی رفتار مزید کچھ کم کردی۔ محض اس خیال سے کہ وہ ہمیں 'اوورٹیک' کر کے آگے کو نکل جائے۔اس کے جواب میں اُس نے اپنی رفتار چیونٹی کی رفتار کے برابر کردی۔تب تو ہم نے ہار مان لی اور ایک جگہ رُک کر کھڑے ہو گئے تاکہ اس کی چہل قدمی میں کوئی خلل نہ واقع ہو۔قریب آکر اُس نے کہا "پلیز پہلے آپ آگے چلیں۔" جب ہم نے جھوٹ موٹ ہی کہہ دیا کہ ہماری چہل قدمی یہاں ختم ہو رہی ہے تو تبھی اُس نے آگے کی راہ لی۔اس پر ہمیں ایک لطیفہ یاد آیا کہ

ایک دفتر کی خاتون کلرک دیر سے دفتر پہنچی تو اس کے عہدیدار نے دیر سے دفتر آنے کی وجہ پوچھی۔ اس پر خاتون کلرک نے کہا ''سر! بات دراصل یہ ہوئی کہ آج جولڑکا میرا تعاقب کر رہا تھا وہ بہت آہستہ چل رہا تھا۔'' بہرحال صبح کی چہل قدمی کے دوران اب تک بیسیوں امریکیوں سے ہماری دعا سلام ہوچکی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم امریکہ میں بہت مقبول ہو چکے ہیں۔ ہماری موجودہ مقبولیت دراصل امریکیوں کی خوش اخلاقی کی مرہونِ منت ہے۔

ایک بار ہم شکاگو کے ڈاون ٹاون میں بے خیالی میں اُس راستہ پر کھڑے ہوگئے جو پیدل سڑک عبور کرنے والوں کے لئے مختص ہوتا ہے۔ نتیجہ میں ہمیں دیکھ کرکئی موٹریں اچانک رُک گئیں اور بڑی دیر تک رُکی رہیں۔ جب لوگ ہمیں راستہ عبور کرنے کا اشارہ کرنے لگے تو تب ہمیں احساس ہوا کہ ہم غلط جگہ کھڑے ہوگئے ہیں۔ فوراً پیچھے کو ہو لئے تو تب کہیں موٹریں گزریں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنے خوش اخلاق امریکیوں کی موجودگی میں کوئی ایسا امریکی بھی نکل آتا ہے جو بیٹھے بٹھائے مذاق مذاق میں لوگوں پر پستول سے گولیاں چلا دیتا ہے۔ کل رات ہی ٹیلی ویژن پر ایک مشٹنڈے امریکی کو دکھایا گیا جس نے اچانک یونہی پانچ معصوم انسانوں کی جانیں لے لی تھیں۔ ایک خاتون کے بارے میں پتہ چلا کہ پہلے تو اس نے اپنے شوہر سے طلاق حاصل کی۔ بعد میں مقدمہ لڑکر شوہر سے اپنے دو بچّوں کو حاصل کیا اور ایک دن موقع پاتے ہی ان بچّوں کو دریا میں ڈبو دیا۔ امریکی معاشرہ اتنی آسانی سے ہم جیسوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ہمارا خیال ہے کہ امریکہ کے ننانوے فیصدی شہری نہایت خوش اخلاق، وسیع القلب اور ملنسار واقع ہوئے ہیں لیکن جب ان میں سے کوئی رچرڈ نکسن، رونالڈ ریگن، جمی کارٹر، جارج بش یا بل کلنٹن بن کر ابھرتا ہے اور امریکہ کا صدر بن جاتا ہے تو تب پریشانی ہوتی ہے۔ لوگ امریکہ سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا کہ امریکہ کے صدر سے ڈرتے ہیں۔

(''سیاست۔'' ۱۴ مئی ۲۰۰۰ء)

☆☆

ہم نے واشنگٹن میں مخدوم کو یاد کیا

ہم اس وقت واشنگٹن میں اپنے چچازاد بھائی ڈاکٹر اصغر حسین کے قبضہ میں ہیں۔ پچھلے دس دنوں سے ہم اپنے ایک اور چچا زاد بھائی ڈاکٹر خورشید حسین کی صحبت میں تھے جو اب ڈیٹرائیٹ واپس جا چکے ہیں۔ ڈاکٹر خورشید حسین ہمارے اکیلے ایسے بھائی ہیں جن سے ہمارے تعلقات برادرانہ نہیں دوستانہ ہیں کیونکہ ہم عمر، ہم مکتب اور ہم مذاق وغیرہ رہ چکے ہیں۔ چونکہ ان سے ہمارے تعلقات برادرانہ نہیں دوستانہ ہیں اس لئے زیادہ استوار بھی ہیں۔ محض ہماری صحبت میں رہنے کی وجہ سے شعروادب سے بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ شعر اُن کی سمجھ میں نہیں آتے مگر سنتے تو ہیں۔ تعلقات کے معاملہ میں ہمارے ان بھائیوں کے رویئے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ہمارے ایک بھائی عارف حسین کا عالم تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے بچوں تک سے برادرانہ تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ اور اس میں بھی اس احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہیں کہ بچوں کو اپنے بڑے بھائی اور خود کو ان کا چھوٹا بھائی سمجھتے ہیں۔ برادرانہ تعلقات کی یہ انتہا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر اصغر حسین کا معاملہ بالکل جداگانہ ہے، طب والے ڈاکٹر ہیں اور اپنے پیشہ میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ یوں تو ہمارے سبھی بھائی سیلف مَیڈ ہیں لیکن اصغر حسین ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سیلف میڈ ہیں۔ ہماری نظر میں سیلف میڈ آدمی وہ ہوتا ہے جس نے اپنے کیریئر کی تشکیل میں قدرت کو زیادہ زحمت نہ دی ہو۔ تاہم اس کے باوجود یہ دن میں کم از کم پانچ مرتبہ خدا کا شکر بڑی پابندی سے ادا کرتے ہیں۔ چونکہ سیلف میڈ آدمی ہیں اس لئے ان کی

کوشش یہ ہوتی ہے کہ کوئی اور آدمی سیلف میڈ بننے نہ پائے۔ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ بنانے کی فکر میں غلطاں رہتے ہیں۔ دوست، احباب، رشتہ دار، ملنے والے غرض سب کی فکر میں ہر دم مبتلا بلکہ ملوث۔ حد تو یہ ہے کہ ہمیں بھی بناتے رہتے ہیں۔ عملاً بھی اور اصطلاحاً بھی۔ بھائی ہونے کے باوجود وہ ہمارے زبردست مدّاح ہیں، ہماری سنجیدہ باتوں پر بھی بے تحاشہ ہنستے رہتے ہیں۔ وہ گھر کی مرغی کو دال برابر نہیں سمجھتے، بلکہ گھر کی مرغی کو شتر مرغ سمجھتے ہیں۔ سولہ برس پہلے ہم احباب کی دعوت پر لندن گئے تھے تو انہوں نے زبردستی ہمیں لندن سے امریکہ بلوایا تھا اور ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ ہم مایہ ناز ادیب وغیرہ ہیں۔ اس وقت تو خیر ان کی خاطر ہم مان بھی گئے تھے۔ سولہ برس پہلے ہمیں ہندوستان کی 'عوامی ملکیت' اور 'قومی اثاثہ' سمجھتے تھے۔ اتنے لمبے عرصہ بعد ہم اُن کے پاس آئے ہیں تو ماشاء اللہ اب وہ ہمیں 'بین الاقوامی اثاثہ' سمجھنے لگے ہیں۔ گویا اس عرصہ میں ان کی سوچ نے کافی ترقی کر لی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم کسی اور زبان میں لکھ رہے ہوتے تو نہ جانے کیا ہوتے۔ اس بار بھی ان کی کوشش یہی ہے کہ ہم امریکی شہریت اختیار کر لیں اور انگریزی میں لکھنا شروع کر دیں تاکہ وہ بن سکیں جو وہ بنانا چاہتے ہیں۔ ہزار بار انھیں سمجھا چکے ہیں کہ ہم اُردو زبان کے سوائے کوئی اور زبان نہیں جانتے۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کا 'قومی اثاثہ' ہی رہنے دو 'بین الاقوامی اثاثہ' نہ بننے دو۔ مگر کیا کریں ایسی آسان باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ بہرحال واشنگٹن آنے سے پہلے ہی ڈاکٹر اصغر حسین نے ہمیں بتا دیا تھا کہ واشنگٹن میں ڈاکٹر معظم صدیقی حیدرآباد دکن ایسوسی ایشن کی جانب سے مخدوم محی الدین اور جوش ملیح آبادی کی یاد میں 6 مئی کو ایک تقریب منعقد کر رہے ہیں۔ اس میں ضرور شرکت کرو اور مخدوم کا خاکہ پڑھو۔ یوں ہم شکاگو کے حیدرآبادیوں سے بچ کر واشنگٹن آئے تو یہاں بھی حیدرآبادیوں کے نرغے میں پھنس گئے بلکہ ڈیٹرائٹ سے ہمارے بھائی خورشید حسین کے علاوہ ہمارے ساتھ ایک اور حیدرآبادی دوست وارث بیگ بھی آئے ہیں جو برسوں پہلے حیدرآباد کی ریجنل ریسرچ لیبارٹری میں کام کیا کرتے تھے۔ بے حد پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اگر آپ غلطی سے کسی موضوع پر اُن سے بات کرنا شروع کریں تو اس موضوع کی پوری تاریخ اس کے جغرافیہ کے ساتھ بیان کر دیں گے۔ پچھلے چند دنوں سے وہ خود حیدرآباد کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ وارث بیگ پکّے ہندوستانی ہیں اور بات بات پر ہندوستان کے روشن مستقبل کی پیش قیاسی فرماتے رہتے ہیں۔

کبھی کبھی تو شبہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ حکومت ہند کے وزیر تو نہیں ہیں بلکہ ان کی باتیں سن کر بار بار دل میں یہ خیال بھی آیا کہ ہم چند روز کے لئے ہی سہی بلا وجہ اپنا ملک چھوڑ کر یہاں کیوں آئے ہیں۔ پھر یہ سوچ کر اپنے آپ کو دلاسہ دیتے ہیں کہ خود وارث بیگ بھی تو آخر اپنے پیارے ملک کو چھوڑ کر برسوں سے یہاں مقیم ہیں۔ ہم اگر دوڈھائی مہینے یہاں رہ لیں گے تو کیا مضائقہ ہے۔

آپ نے آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے والا محاورہ تو ضرور سنا ہوگا۔ ہم جب بھی آسمان سے گرتے ہیں تو ہم اُس کھجور میں جا اٹکتے ہیں جس کا نام حیدرآباد ہے۔ امریکہ میں ہماری پہلی ادبی محفل کا آغاز بھی حیدرآباد دکن ایسوسی ایشن اور مخدوم محی الدین کے حوالہ سے ہی ہوا۔ ڈاکٹر معظم صدیقی امریکہ کے بڑے قدیم حیدرآبادی ہیں۔ یوں سمجھیئے کہ امریکہ میں حیدرآباد کے اولین 'ریڈ انڈین' ہیں۔ وائس آف امریکہ کے ساؤتھ اینڈ سنٹرل ایشین ڈویژن کے ڈائرکٹر ہیں۔ ادبی، سرکاری، سیاسی اور سماجی حلقوں میں بڑی عزت کے حامل ہیں۔ حیدرآباد دکن ایسوسی ایشن ان کی اور ان کے رفقاء کی سرپرستی میں پچھلے آٹھ برسوں سے واشنگٹن میں سرگرم عمل ہے اور اس کی ادبی تقاریب کا خاصا شہرہ ہے۔ مخدوم محی الدین اور جوش ملیح آبادی کی یاد میں منعقدہ یہ تقریب ایک خوبصورت آڈی ٹوریم میں آراستہ کی گئی تھی۔ بعض حیدرآبادیوں سے طویل عرصہ بعد ملنے کا موقعہ ملا۔ پروفیسر ایم ایم علی، جو کسی زمانہ میں نظام کالج میں سیاسیات کے استاد تھے اور اورینٹ ہوٹل میں زیادہ پائے جاتے تھے، پینتیس برس بعد ملے۔ زمانے نے سب کے حلیے بدل دیئے ہیں۔ کسی کی شکل یاد آتی تھی تو نام یاد نہ آتا تھا اور نام یاد آتا تھا تو اس نام کو اس شکل سے منسوب کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ وقت بھی کیا ظالم چیز ہے۔ انسان تو انسان ہے حیدرآبادیوں کے حلیے کو بھی بگاڑ دیتا ہے۔ ڈاکٹر ظہیر پرویز، اکبر یوسف، سلطانہ کمال، تسنیم زور (ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی صاحبزادی) سے سرسری سی ملاقات ہوئی۔ ہم احمد اللہ قادری سے بھی ملنا چاہتے تھے لیکن محفل میں وہ نہ جانے کہاں چھپے بیٹھے تھے۔ مخدوم کی آواز بھی بہت دنوں بعد سنی۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس محفل میں ہمارا تعارف ایک غیر حیدرآبادی دوست ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے کرایا۔ ڈاکٹر آنند ممتاز اسکالر، شاعر، ادیب اور انگریزی کے مشہور استاد ہیں۔ اگرچہ ان سے ہماری خط و کتابت رہی ہے لیکن ملاقات پہلی بار ہوئی۔ ہمارے تعارف کے سلسلہ میں انہوں نے جس مبالغہ آمیزی سے کام لیا اس سے پتہ چلا کہ وہ ہمارے بارے میں خود ہم سے کچھ زیادہ ہی جانتے

ہیں۔ بڑی محبت سے ملے۔ ہم محفل میں موجود حیدرآبادیوں سے ذرا تفصیل سے ملنا چاہتے تھے۔ البتہ شاذ تمکنت کے پرانے مدّاح اور دوست اکبر یوسف بالکل نہیں بدلے۔ اس اتفاق پر حیرت ہوئی کہ شاذ تمکنت کے دو پرانے دوست، مصحف اقبال توصیفی حیدرآباد میں اور اکبر یوسف امریکہ میں بالکل نہیں بدلے۔ جیسے کے ویسے ہیں۔ کاش شاذ بھی اسی طرح ہمارے درمیان رہ لیتا۔ جوش ملیح آبادی کے بارے میں ہم مونا شہاب کا مضمون بھی سننا چاہتے تھے۔ مونا شہاب کی تحریریں ہم امریکہ اور یوروپ کے اخباروں اور رسالوں میں اکثر پڑھتے رہتے ہیں اور ہم ان کے مدّاح بھی ہیں لیکن کیا کریں اسی شام اور عین اسی وقت علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک تقریب کہیں اور منعقد ہو رہی تھی جس میں ہمارے دوست پروفیسر مشیر الحسن اور ان کی رفیقۂ حیات پروفیسر زویا حسن ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر اظہار خیال کرنے والے تھے۔ ہم نے سوچا کہ ہندوستان میں رہ کر تو ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل ہماری سمجھ میں نہیں آئے شاید امریکہ میں سمجھ میں آجائیں۔ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سربراہ اور ہمارے دوست ڈاکٹر عبداللہ ہمیں اس محفل میں لیجانے کے لئے آ گئے تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ نہایت فعّال اور منتظم آدمی ہیں۔ علی گڑھ کے حلقوں میں بے حد مقبول ہیں۔ ہمیں تو اس لئے بھی پسند ہیں کہ سولہ برس پہلے انھوں نے واشنگٹن میں ہمارے لئے ایک تقریب آراستہ کی تھی۔ پروفیسر مشیر الحسن پچھلے چار مہینوں سے یونیورسٹی آف ورجینیا میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ پروفیسر مشیر الحسن اور زویا حسن دونوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر سیر حاصل گفتگو کی جس کی وجہ سے ہمیں مسلمانوں کے مسائل تو سمجھ میں آ گئے لیکن اُن کا حل سمجھ میں نہیں آیا۔ مسلمانوں کے مسائل کی یہی تو خوبی ہے۔ یوں اس محفل میں علی گڑھ اور دلّی کے احباب سے بھی ملاقات ہوگئی۔

(''سیاست''۔ ۲۱؍مئی ۲۰۰۰ء)

☆☆
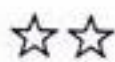
رچمنڈ کی پہلی ادبی محفل

پچھلے ہفتے ہمیں رچمنڈ کی پہلی ادبی محفل میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔ اس سے پہلے رچمنڈ میں کبھی کوئی ادبی محفل منعقد نہیں ہوئی تھی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ رچمنڈ، جو امریکہ کی ریاست ورجینیا کا صدر مقام ہے، واشنگٹن سے صرف سو میل کے فاصلہ پر واقع ہے جہاں سے لوگ بڑی

(بائیں سے دائیں) ڈاکٹر مجیب الدین ، مجتبیٰ حسین اور ڈاکٹر معین الدین علی

آسانی سے دو گھنٹوں میں واشنگٹن پہنچ جاتے ہیں۔ اکثر لوگ سبزی ترکاری، حلال گوشت،

ہندوستانی مصالحے، مٹھائیاں ، غزلوں اور نعتوں وغیرہ کے کیسٹ لینے کے لئے بے دھڑک واشنگٹن چلے آتے ہیں۔ یہی حال ادبی محفلوں کا ہے۔ چنانچہ جب بھی واشنگٹن میں کوئی ادبی محفل از قسم مشاعرہ وغیرہ منعقد ہوتی ہے تو رچمنڈ کے باذوق حضرات یہیں آ کر شعر بھی سنتے ہیں اور واپسی میں لگے ہاتھوں حلال گوشت وغیرہ بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ پھر رچمنڈ میں بڑی مشکل سے پانچ حیدرآبادی خاندان آباد ہیں اور ان میں سے بھی تین خاندان تو ہمارے ہی خاندان کی ذیلی شاخیں ہیں۔ ایک تو ہمارے بھائی فراست حسین ہیں، دوسرے ہماری بہن نجمہ مرزا اور ان کے شوہر تیر مرزا ہیں۔ تیسرے ہمارے سمدھی سمیع خاں (لائف انشورنس فیم) کے فرزند فرخ خاں رہتے ہیں۔ ان تین خاندانوں کے علاوہ دو حیدرآبادی ڈاکٹروں، ڈاکٹر مجیب الدین اور ڈاکٹر معین الدین علی کے خاندان یہاں آباد ہیں۔ ڈاکٹر معین الدین علی خاصے سینئر ڈاکٹر ہیں۔ کینسر کے خصوصی معالج ہیں۔ بہت دلچسپ، خلیق، ملنسار اور ہنس مکھ آدمی ہیں۔ ڈاکٹر مجیب الدین، حیدرآباد کی اقبال اکیڈیمی کے سربراہ ظہیر الدین احمد کے چھوٹے بھائی ہیں اور ہم سے غائبانہ طور پر بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ ہماری کتابیں بھی پڑھ چکے ہیں اور ''سیاست'' میں انٹرنیٹ پر ہمارا جو کالم آتا ہے اُسے پابندی سے پڑھتے ہیں۔ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ظہیر الدین احمد، علامہ اقبال کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں، کم و بیش ویسا ہی سلوک وہ ہمارے ساتھ کرتے ہیں۔ بھلے ہی ہمیں 'حکیم الامت' نہ سمجھتے ہوں لیکن 'نیم حکیم الامت' تو مانتے ہی ہیں۔ ان کی اہلیہ سائرہ مجیب بھی، جو سلیمان خطیب مرحوم کی بھتیجی ہیں، ادب کا اچھا ذوق رکھتی ہیں۔ ہمارے شکاگو پہنچتے ہی ڈاکٹر مجیب الدین نے ہمیں فون پر کہا کہ رچمنڈ تو آپ آتے ہی رہیں گے۔ ایک بار آپ ہمارے لئے بھی خاص طور پر آئیں تاکہ ہم رچمنڈ میں ایک ادبی محفل آراستہ کرنے کا تجربہ کرسکیں۔ ہمیں اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لئے سو میل کا فاصلہ طے کرکے واشنگٹن جانا پڑتا ہے۔ اگر یہ سہولت ہمیں یہیں دستیاب ہوجایا کرے تو کیا کہنے۔ اس طرح ہم ادبی محفلوں کے تعلق سے خودکفیل بن جائیں گے۔ تجربہ سے گذرنے کے لئے چونکہ ہم ہمیشہ تیار رہتے ہیں اسی لئے ہم نے فوراً ہاں کردی۔ تاہم ڈاکٹر مجیب الدین کی اس خواہش پر ہمیں ایک بزرگ کا وہ پُرانا قصہ یاد آ گیا کہ ایک بار یہ صوبہ سرحد میں پٹھانوں کی ایک دور دراز بستی میں پہنچ گئے۔ پٹھانوں نے ان کی بڑی خاطر مدارات کی اور بڑے احترام سے اپنے پاس رکھا۔ ان کے

کشف وکرامات کے چرچے عام ہوئے تو لوگ عقید تا جوق در جوق ان کے پاس آنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد ان بزرگ نے واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو پٹھانوں نے کہا کہ حضور! اب تو ہم آپ کو یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔ آپ کو مار کر یہیں دفن کر دیں گے۔ آپ کا عالیشان مقبرہ بنائیں گے۔ سال کے سال دھوم دھام سے آپ کے عرس کا اہتمام کریں گے۔ ہمیں نذر نیاز کے لئے بہت دور جانا پڑتا ہے۔ آپ کا مزار شریف یہاں بن جائے تو ہم نذر نیاز کے معاملہ میں خود مکتفی ہو جائیں گے۔ بہر حال رچمنڈ کی اس پہلی ادبی محفل کے انعقاد کے لئے ڈاکٹر مجیب الدین، ان کی اہلیہ، ہماری بہن نجمہ مرزا اور ان کے شوہر نیر مرزا، ڈاکٹر معین الدین علی، فرخ خان اور حنا فرخ نے نہ جانے کیا کیا پاپڑ بیلے ہمیں نہیں معلوم۔ البتہ ایک بار رچمنڈ کے اسلامک سنٹر میں ہمیں جانے کا موقع ملا تو ہمیں اس ادبی محفل کا ایک پوسٹر نظر آ گیا جس میں متوقع سامعین کو مطلع کیا گیا تھا کہ محفل کے بعد مختلف اشیائے خورد ونوش سے ان کی تواضع بھی کی جائے گی۔ گویا ادبی محفل پسند نہ آئے تو کھانا ہی کھا کر چلے جائیے۔ ہمیں یہاں آنے کے بعد پتہ چلا کہ امریکہ میں ادبی محفل کا مطلب صرف 'محفل شعر' ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے کئی شعرا یہاں ہر سال بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ بعض شعراء تو ایسے ہیں جو سال میں دو، دو چکر لگا جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے قصے بھی یہاں بہت مشہور ہیں۔ ایک صاحب مذاق میں کہہ رہے تھے کہ جو اردو شاعر امریکہ میں پچاس مشاعرے پڑھ لیتا ہے وہ امریکی شہریت حاصل کرنے کا حقدار ہو جاتا ہے۔ جب سے اردو کی نئی بستیاں خلیجی ممالک، یوروپ اور امریکہ میں آباد ہوئی ہیں تب سے برصغیر کے شعرا اپنا پُرانا کلام سنانے کے لئے ان نئی بستیوں کا رُخ کرنے لگے ہیں۔ یوں بھی مشاعرہ ہماری ایک ایسی روایت ہے جس میں شعرا کے پرانے بلکہ بوسیدہ کلام کو سننے کے لئے لوگ جوق در جوق چلے آتے ہیں۔ سولہ برس پہلے ہم یہاں آئے تھے تو اُس وقت تک یہاں مشاعروں کا چلن اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت بھی ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہم امریکہ کا دورہ کرنے والے پہلے نثر نگار ہیں۔ اب اتنے لمبے عرصہ بعد یہاں آئے ہیں تو اب بھی بتایا جا رہا ہے کہ نثر نگار کی حیثیت سے ہماری اولیت اب بھی برقرار ہے۔ رچمنڈ کی اس ادبی محفل کے منتظمین کو یہ بھروسہ نہیں تھا کہ پتہ نہیں اس 'نثری محفل' میں سامعین آتے بھی ہیں یا نہیں بلکہ ہماری بہن نجمہ مرزا نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنے تینوں بیٹوں، طٰہٰ، عادل اور صادق کو جن کی پرورش سراسر امریکی ماحول میں ہوئی ہے اور جو صرف تھوڑی

بہت اردو جانتے ہیں، داد دینے کے طریقے سکھلا دیے تھے تا کہ جب ہم مضامین پڑھنے لگیں تو محفل میں سناٹا برقرار نہ رہے۔ ان بچّوں کو غالباً سبحان اللہ، ماشاء اللہ اور مکرر ارشاد جیسے فقرے زبانی یاد کرادیئے گئے تھے۔ چنانچہ جب ہم نے اس محفل میں اپنا پہلا مضمون پڑھنا شروع کیا تو احساس ہوا کہ ان بچّوں کی بے وقت داد ہوٹنگ کی حدوں کو چھونے لگی ہے۔ نتیجہ میں ہم نے بڑی منت سماجت کر کے ان کی داد کو رکوایا۔ یوں بھی ہم داد کے معاملہ میں اپنے بل بوتے پر خود مکتفی ہو چکے تھے۔

رچمنڈ کے آر بر لینڈ نگ کلب میں منعقدہ یہ خوشگوار ادبی محفل ہمیشہ یاد رہے گی۔ بخدا ایسی بے ساختہ داد ہمیں کہیں نہیں ملی۔ کلب کا ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ رچمنڈ کے ہندوستانی اور پاکستانی اہل ذوق دونوں اُمڈ آئے تھے۔ ظہیر احمد صاحب مرحوم سابق ہندوستانی سفیر برائے سعودی عرب کی بھانجی نارتھ کیرولینا سے پانچ گھنٹوں کا سفر طے کر کے اس محفل میں شرکت کی خاطر اپنے بیٹے کے ساتھ آئی تھیں۔ بنگلور، میسور، الہ آباد، پشاور، کراچی، لاہور، حیدرآباد اور دہلی سے تعلق رکھنے والے سامعین کی کثرت تھی۔ جتنے مرد تھے اتنی ہی خواتین بھی تھیں۔ ہم چار پانچ مضامین سنا چکے تو یہ محفل، طنز و مزاح کے ایک ایسے پلیٹ فارم میں تبدیل ہو گئی جہاں خود سامعین نے نہ صرف دلچسپ لطیفے اور واقعات سنائے بلکہ میسور سے تعلق رکھنے والے ایک ڈاکٹر نے ٹھیٹ دکنی لہجہ میں سلیمان خطیب کی نظمیں بھی سنائیں۔ ڈاکٹر مجیب الدین نے ہمارے تعارف کے سلسلہ میں ایک مبالغہ آمیز مضمون بھی سنایا جس سے ہمیں بخوبی اندازہ ہوگیا کہ ڈاکٹر مجیب الدین بہت اچھی نثر لکھتے ہیں۔ شعر بھی اچھے کہتے ہیں۔ ہم نے ان کے ہاتھوں میں ان کے غیر مطبوعہ کلام کی ایک بیاض بھی دیکھی۔ اس محفل میں ہمیں جو بے ساختگی، وارفتگی اور بے تکلفی دیکھنے کو ملی اس نے ہمارا دل موہ لیا۔ ڈاکٹر مجیب الدین خوش تھے کہ رچمنڈ کی پہلی ادبی محفل کا تجربہ نہایت کامیاب رہا لیکن ہمارے امریکی بھانجے افسردہ تھے کہ انھوں نے اتنی محنت سے داد کے جو فقرے یاد کر رکھے تھے انھیں سنانے سے وہ محروم رہے۔ ہم نے انھیں سمجھایا کہ اگرچہ ہمارے ہاں بھی بنا سوچے سمجھے داد دینے کا رواج عام ہے لیکن اس کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ادھر ہم کہیں ''حضرات! ہم آپ کے شکر گذار ہیں'' تو اُدھر سامعین بول اٹھیں ''مکرر ارشاد''۔ ہم کہیں ''ہم اردو کے ایک ادنی مزاح نگار ہیں'' تو سامعین

کہیں ''یہ آپ کی ذرّہ نوازی ہے''۔ایسی ہی باتوں کی وجہ سے ہمیں اپنے بھانجوں کی رٹی رٹائی دادکو روکنا پڑا۔ڈاکٹر مجیب الدین کا اصرار ہے کہ ہم ایک بار اور رچمنڈ آئیں۔اب ہم انھیں کیسے سمجھائیں کہ ایسی خوشگوار محفلیں منعقد نہیں کی جاتیں بلکہ خود بخود ہو جاتی ہیں۔

ابھی ہم واشنگٹن میں ہی تھے کہ حضرت سعید شہیدی کے گذر جانے کی افسوسناک اطلاع ملی۔امریکہ کی محفلوں کے پس منظر میں جہاں ہم اس بات پر خوش تھے کہ حیدرآباد ساری دنیا میں پھیلتا جارہا ہے وہیں اس بات پر ملول ہو گئے کہ خود حیدرآباد دن بدن کتنا چھوٹا ہوتا جارہا ہے۔سعید شہیدی اُس رات بہت یاد آئے۔خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

(''سیاست۔''۲۸رمئی ۲۰۰۰ء)

قصّہ ہمارے امریکہ آنے کا

صاحبو! اگر ہم لاس اینجلس نہ آتے تو آپ کو پتہ ہی نہ چلتا کہ ہم زندگی کا ہر کام الٹا کرنے کے عادی ہیں۔ ہم آغاز سے انجام کی طرف نہیں جاتے بلکہ انجام سے آغاز کی طرف آتے ہیں۔ اردو شاعروں کے مجموعوں کو بھی ہم کبھی شروع سے آخر تک نہیں پڑھتے بلکہ آخر سے شروع تک پڑھتے ہیں جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شاعروں کے کلام کی بے معنویت اور بدمزگی میں کبھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ اضافہ ہی ہو جاتا ہے۔ آپ نے اُس دیہاتی کا قصہ تو ضرور سنا ہوگا جس کے سامنے سے بکریوں کا ایک جھنڈ گذرا تو کسی نے پوچھا ''بتاؤ اُس جُھنڈ میں کتنی بکریاں ہوں گی''۔ قدرے توقف کے بعد بولا ''پوری ایک سو بکریاں ہیں''۔ مخاطب نے حیرت سے پوچھا ''تم نے آخر اتنی جلدی، اتنے وثوق کے ساتھ اتنی ساری بکریوں کو کس طرح گن لیا؟''۔ بے نیازی سے بولا ''پہلے تو میں نے ان بکریوں کی ٹانگیں گنیں۔ پھر میں نے ان ٹانگوں کو چار سے تقسیم کیا تو جواب ایک سو بکریاں آیا۔ یہ تو ریاضی کا ایک ادنیٰ سا اصول ہے۔ کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے؟''

زندگی کے تعلق سے ہمارا رویہ بھی اس دیہاتی سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اس بار ہم لاس اینجلس کے احباب کی دعوت پر امریکہ آئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں امریکہ آئے ہوئے پورا سوا مہینہ بیت چکا ہے۔ ہمیں اصولاً سب سے پہلے لاس اینجلس آنا چاہئے تھا لیکن کیا کریں اس عرصہ میں امریکہ کے مختلف شہروں میں بکریوں کی ٹانگیں گننے میں مصروف رہ گئے اور اب خود اپنی ٹانگیں تڑوا کر بالآخر یہاں پہنچے ہیں۔ ہمیں تو سب سے پہلے

امریکہ کے مغرب میں آنا چاہئے تھا لیکن مشرق میں پہنچ گئے۔ ہر کام الٹا کرنے کی عادت جو پڑی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ نماز بھی پڑھتے ہیں تو دیگر نمازیوں کی طرح پہلے نماز پڑھ کر آخر میں دعا نہیں مانگتے بلکہ پہلے دعا مانگتے ہیں اور پھر نماز پڑھتے ہیں۔ یوں بھی ہندوستان لاس اینجلس سے زیادہ قریب ہے، بہ نسبت شکاگو کے۔ پھر ہمارا محبوب شہر ٹوکیو بھی، جہاں ہم نے اپنی زندگی کے چند خوشگوار دن گذارے ہیں، راستہ میں ہی پڑتا ہے۔ اسے تک بھول گئے۔ امریکہ بھی عجیب وغریب ملک ہے جس کا ایک کنارا دوسرے کنارے سے اتنی دور واقع ہے کہ یہ ملک بے کنار سا لگتا ہے۔ پھر اس کا کوئی قابل لحاظ ماضی بھی نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو پانچ سو برس سے زیادہ کا نہیں ہے۔ اتنا بڑا ملک اور اتنا چھوٹا ماضی۔ پھر جو لوگ دور دراز کے ملکوں سے آکر یہاں آباد ہونے کے لئے آتے ہیں وہ بھی تو اپنے بھاری بھرکم ماضی سے چھٹکارا پانے اور اس کے بوجھ کو اتار پھینکنے کے لئے یہاں آتے ہیں۔ ماضی کے بھاری بوجھ تلے دبے ہوئے انسانوں کو بسا اوقات اپنا مستقبل نظر نہیں آتا۔ ہمیں دیکھئے کہ ہزاروں برس کے ماضی کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں۔ ماضی کو سنبھالنے کے جتن کرتے ہیں تو مستقبل ہاتھ سے نکلتا نظر آتا ہے اور مستقبل کی فکر کرتے ہیں تو ماضی کا کمر توڑ بوجھ ہمیں اپنے حال تک سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ امریکہ میں آباد ہونے والوں نے اپنے ماضی کو بُھلا کر کتنا مستقبل پایا ہے۔ رہی ہماری بات تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ہمیں تو اپنے روشن ماضی اور نظر نہ آنے والے مستقبل کے بیچ خوش وخرم رہنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ مگر یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس پر ہم فی الحال کوئی اظہار خیال نہیں کرنا چاہتے۔

حضرات! ہم اس سے پہلے بھی امریکہ کے مشرق میں آچکے ہیں کیونکہ کولمبس بھی پہلے یہیں آیا تھا۔ ایک عرصہ سے امریکہ کے احباب کا اصرار تھا کہ ہم ایک بار اور امریکہ آئیں لیکن صرف اصرار سے کیا ہوتا ہے۔ بلاشبہ سفر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے۔ پھر ذوق سفر کی بھی ہم میں کوئی کمی نہیں لیکن سفر کرنے کے لئے جس سامان سفر کی ضرورت ہوتی ہے اور جو وسائل سفر درکار ہوتے ہیں وہ ہمارے پاس نہیں ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اردو کے کسی ادیب یا شاعر کو اگر غلطی سے ادب میں تھوڑا سا بھی مقام حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اپنے پلے سے کرایہ خرچ کر کے سفر کرنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔ ہمارے ایک شاعر دوست کا قصہ ہے کہ وہ اپنے سگے بھتیجے کی شادی میں شرکت کے لئے گئے تو اس سے نہ صرف کرایہ آمد ورفت وصول کیا بلکہ شادی کے موقع پر سہرا

پڑھنے کا اتنا ہی معاوضہ لیا جتنا کہ وہ بیرونی مشاعروں میں شرکت کا لیا کرتے ہیں۔ پھر یہ پابندی بھی عائد کی کہ کوئی اور نامحرم شاعر سہرا نہ لکھنے پائے۔ اس سہرے کی خوبی یہ تھی کہ اس کے کئی مصرعے بحر سے خارج تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ بعد خود ان کے بھتیجے کی شادی بھی بحر سے خارج ہوگئی اور وہ بیچارا اب 'آزاد نظم' بنا پھرتا ہے۔ ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ امریکہ آنے کے لئے دوستوں کا اصرار تو بڑھتا رہا لیکن سامان سفر اور وسائل سفر کا کسی نے ذکر تک نہ کیا۔ اب اگر ہم یونہی چلے آتے تو ہماری شانِ کج کلاہی کے مجروح ہونے کا اندیشہ تھا۔

دو برس پہلے 'اردو لنک' کے مدیر اور ہمارے کرم فرما عبدالرحمٰن صدیقی نے بھی اپنے ایک محبت بھرے خط میں ہمیں امریکہ بُلانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ یہ پہلا خط تھا جس میں صرف خالص محبت ہی نہیں تھی بلکہ محبت کے سوا بھی بہت کچھ تھا۔ عبدالرحمٰن صدیقی ہمارے بڑے بھائیوں کے ملنے والوں میں سے ہیں اور Chronic حیدرآبادی ہونے کے علاوہ اردو کے صاحبِ طرز شاعر بھی ہیں۔ پھر ہمارے بھائی ابراہیم جلیس مرحوم کے حوالہ سے ان سے ہماری رشتہ داری بھی بنتی ہے۔ بقول یوسفی یوں تو سارے بنی نوع انسان ہی جلیبی کی شکل اختیار کر کے کسی نہ کسی پیچیدہ سمت سے رشتہ دار بن جاتے ہیں لیکن ادب کے حوالہ سے ان سے ہمارا جو رشتہ بنتا ہے وہ زیادہ مستحکم اور پائیدار ہے۔ ''اردو لنک'' بھی ہمارے پاس آتا رہا ہے جسے ہم بے حد ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ دیارِ غیر میں رہنے والے کتنے ہی ادیب اور شاعر دوستوں کا حال 'اردو لنک' کے ذریعہ معلوم ہو جاتا ہے۔ ایک سال پہلے ہمارے حیدرآبادی دوست ڈاکٹر سید سمیع امریکہ سے ہندوستان آئے تو انہوں نے بھی ہمیں لاس اینجلس بلانے کی بات کی۔ ڈاکٹر سمیع اردو شعر و ادب کا اتنا اچھا ذوق رکھتے ہیں کہ ہم تو انہیں ابتداء میں ادب وغیرہ کے ایسے ڈاکٹر ہی سمجھتے رہے جو نت نئی بیماریاں پیدا کرنے کے لئے بڑی شہرت رکھتے ہیں مگر جب معلوم ہوا کہ یہ بیماریاں پیدا کرنے والے نہیں بلکہ بیماریوں کا علاج کرنے والے ڈاکٹر ہیں تو بے حد خوشی ہوئی۔ ڈاکٹر سمیع امریکہ کے سماجی اور ادبی حلقوں میں جتنے مقبول ہیں اُتنے ہی ہندوستان میں بھی ہر دلعزیز ہیں۔ ہمارے کرم فرما اندر کمار گجرال، سابق وزیراعظم ہند سے بھی ان کے اچھے مراسم ہیں۔ انھوں نے گجرال صاحب کو بھی بتا دیا کہ وہ ہمیں امریکہ بُلانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سمیع کا ارادہ یقیناً نیک تھا لیکن اس ارادہ پر عمل کرنے کے لئے بھی تو ایک شخصیت درکار ہوتی ہے۔ کسی

شاعر کی غزل کا ایک خوبصورت مصرعہ ہے۔

میں خیال ہوں کسی اور کا مجھے سوچتا کوئی اور ہے

ہمیں کیا پتہ تھا کہ ایک دن افسانہ نگار لالی چودھری ،ڈاکٹر سمیع اور محترم عبد الرحمٰن صدیقی کے اس نیک خیال کے بارے میں اچانک سوچنے لگ جائیں گی۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ اگر چہ ہم اس وقت امریکہ میں ہیں لیکن اس کے باوجود یقین نہیں آتا کہ ہم یہاں آچکے ہیں۔ ویسے لالی چودھری جو کام بھی کرتی ہیں اچانک ہی کرتی ہیں۔ جیسے 1996ء میں انھوں نے اچانک افسانہ نگاری شروع کردی۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ اچانک پھٹ پڑا ہو۔'اردو لنک' اور ہمارے دوست اظہر جاوید کے ماہنامہ 'تخلیق' میں ان کی کہانیاں نظر سے گذریں اور سیدھا دل میں اُتر گئیں۔ ہم نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ پاکستان میں پیدا ہونے والی اور برسوں سے امریکہ میں رہنے والی اس افسانہ نگار سے کبھی ہماری ملاقات بھی ہوگی۔ تین چار مہینے پہلے کی بات ہے۔ ایک دن اچانک لالی چودھری کا فون آیا۔ معلوم ہوا کہ دہلی آئی ہوئی ہیں۔ اصل میں ہمارے دوست کیول سوری نے ان سے خواہش کی تھی کہ امریکہ سے پاکستان جاتے ہوئے وہ دو چار دن کے لئے دہلی بھی آئیں، لیکن افسوس کہ ان کے دہلی آنے تک کیول سوری اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ان سے ہماری ملاقات کچھ اس طرح ہوئی کہ وہ اُسی دن شام کی فلائیٹ سے لاہور جانے والی تھیں۔ کہنے لگیں ''حسن چشتی اور ڈاکٹر سمیع آپ کا اکثر ذکر کرتے رہتے ہیں۔ سوچا کہ جانے سے پہلے آپ سے فون پر بات ہی کرلوں''۔ ہم نے کہا'' یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم سے ملاقات کئے بغیر ہی آپ لاہور چلی جائیں۔ لاہور کی فلائیٹ کے جانے میں ابھی چھ سات گھنٹے باقی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ دہلی کے پریس کلب آجائیں۔ ہمارے ساتھ لنچ کریں اور پھر وہیں سے ایرپورٹ چلی جائیں''۔ ہم نے جلدی جلدی میں اپنے چند احباب کے ایل نارنگ ساقی، شردوت، دیویندر اسر اور نند کشور وکرم کو بھی بلا لیا۔ لالی چودھری سے بس یہی دو تین گھنٹوں کی ملاقات رہی۔ بہت سی باتیں ہوئیں۔ جانے لگیں تو ہم نے اپنی دو تین کتابیں تحفتاً اُن کی نذر کیں۔ ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ڈھائی تین گھنٹوں کی یہ مختصر سی ملاقات ایک خوشگوار تعلق کا روپ اختیار کر لے گی۔ کچھ دنوں بعد لاس اینجلس سے ان کا ایک خوبصورت خط آیا۔ پھر فون آنے لگے۔ برسوں سے امریکہ میں رہنے کی وجہ سے وہ اردو بھی امریکی لہجہ میں بولتی

ہیں۔حد تو یہ ہے کہ پریس کلب میں انھوں نے پنجابی کے دو چار جملے بولے تو اندازہ ہوا کہ ان پر بھی امریکی لہجہ کا کلف چڑھا ہوا ہے۔حالانکہ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ پنجابی اور وکی دونوں زبانوں کا لہجہ خود اتنا بگڑا ہوا ہوتا ہے کہ امریکی لہجہ بھی ان دونوں کے لہجہ میں مزید بگاڑ نہیں پیدا کر سکتا۔یوں بھی وہ زیادہ تر انگریزی ہی بولتی ہیں اور وہ بھی خالص امریکی لہجہ میں۔اب آپ سے کیا چھپانا کہ امریکی لہجے والی انگریزی ہمارے پلے بڑی مشکل سے پڑتی ہے۔امریکی چونکہ کھانے کے بڑے شوقین ہوتے ہیں اسی لئے جتنے لفظ بولتے ہیں ان میں سے اکثر کو بولنے کے دوران میں کھاتے چلے جاتے ہیں۔بچے کھچے لفظوں کے پنجر جوڑ کر ہم حسبِ استطاعت اپنے مطلب کی بات نکال لیتے ہیں۔غرض اُن کی انگریزی سے ہم نے اتنا ہی اندازہ لگایا کہ وہ ہمیں جلد ہی لاس اینجلس بلانا چاہتی ہیں۔حیرت ہوتی ہے کہ ہر دم انگریزی بولنے والی یہ افسانہ نگار جب اردو میں افسانے لکھتی ہے تو حُسنِ بیان، لطافت اور دلنشینی کے دریا بہادیتی ہے۔چنانچہ پریس کلب کی مختصر سی ملاقات میں ہی ہم نے اندازہ لگالیا تھا کہ لالی چودھری اردو کی پہلی انگریز افسانہ نگار ہے۔

قصہ مختصر دو مہینے پہلے رات کے ساڑھے تین بجے تھے کہ لالی چودھری کا فون آیا۔ بولیں ''میں نے آپ کا ٹکٹ بھیجنے کا بندوبست کرلیا ہے۔عبدالرحمٰن صدیقی، حسن چشتی اور ڈاکٹر سمیع سے بھی بات ہو چکی ہے۔اب آپ نکلنے کا قصد کریں۔'' ہم نے گہری نیند کے خمار میں کہا ''لالی جی! آپ بھی غضب کی خاتون ہیں۔جو کام بھی کرتی ہیں انوکھا کرتی ہیں اور اس پر اپنی شخصی چھاپ چھوڑ دیتی ہیں۔بخدا چالیس برس کی ادبی زندگی میں یہ پہلا موقع ہے جب کسی نے رات کے ساڑھے تین بجے ہمیں کسی ادبی تقریب میں مدعو کیا ہے اور وہ بھی ایسی تقریب میں جو سات سمندر پار امریکہ میں منعقد ہونے والی ہے''۔اس کے بعد لالی چودھری نے نہ جانے کتنے ہی فون کئے۔

بس اتنی سی داستان ہے ہمارے امریکہ آنے کی ہگر دیکھئے کہ اس داستان میں لالی چودھری کے خلوص، اہتمام، حسنِ انتظام اور سلیقہ مندی نے کتنے رنگ بھر دیئے ہیں۔

(۲؍جون ۲۰۰۰ء کو لاس اینجلس میں منعقدہ ادبی محفل میں پڑھی گئی تحریر)

(''سیاست۔'' ۴؍جون ۲۰۰۰ء)

☆☆

امریکی بُزرگوں کے درمیان

پورے دس دنوں کی شدید مصروفیت کے بعد ہم کچھ لکھنے بیٹھے ہیں تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ بات کو کہاں سے شروع کریں اور اگر شروع کریں تو اسے ختم کہاں کریں۔ اتنے سارے موضوعات ہمارے سامنے ہیں کہ ذہن میں ان موضوعات کے گُچھے سے بن گئے ہیں۔ ہماری عادت ہے کہ کوئی ایک موضوع بھی مل جائے تو بات میں سے بات پیدا کر کے بات کا بتنگڑ بناتے چلے جاتے ہیں اور بال کی کھال نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ جب کہ موضوعات یہاں اتنے زیادہ اور اتنے پھیلے ہوئے ہیں کہ ہم خود سمٹ سے گئے ہیں۔ اصل قصہ یہ ہے کہ پچھلے دنوں میں ہم نے امریکہ کے اتنے شہروں کی سیر کی ہے کہ ان شہروں کا ایک ملغوبہ سا ہمارے ذہن میں بن گیا ہے۔ شکاگو، واشنگٹن، نیویارک، ڈیٹرائیٹ، رچمنڈ، اوہائیو، بلوفیلڈ، فلے ڈلفیا، نیو جرسی، بالٹی مور، لاس اینجلس، سان ڈیاگو، پام اسپرنگ اور نہ جانے کون کون سے شہر۔ موٹروں میں ہزاروں میل کی مسافت طے کر چکے ہیں۔ ہوائی جہازوں میں بھی اُڑتے چلے جا رہے ہیں۔ شکاگو سے لاس اینجلس گئے تو ساڑھے پانچ گھنٹوں تک ہوائی جہاز میں بیٹھے رہے۔ ظاہر ہے کہ واپسی میں بھی اتنی ہی دیر بیٹھنا پڑا۔ امریکی شہروں کی بات تو چھوڑیئے، ہمارے ایک پاکستانی دوست تابش خان زادہ، جو 'اُردو لنک' کے کالم نگار بھی ہیں، ہمیں مذاق مذاق میں میکسیکو بھی لے گئے حالانکہ ہمارے پاس میکسیکو کا ویزا نہیں تھا۔ ہم نے ویزا کے نہ ہونے کا عذر پیش کیا تو بولے "امریکہ جیسے امیر ملک کی سرحد کو عبور کر کے میکسیکو جیسے غریب ملک میں جانے کے لئے کسی ویزا کی ضرورت نہیں ہوتی۔

کوئی بیوقوف ہی ہوگا جو امریکہ کو چھوڑ کر میکسیکو جانا پسند کرے گا''۔غرض انھوں نے ہمیں خوب پہچانا اور میکسیکو کے سرحدی شہر ٹوانہ میں لے گئے۔سرحد کو عبور کرتے ہی ایک بھکاری نے ہمارے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔بے ساختہ وطن عزیز کی یاد آ گئی۔ہم نے یہ سوچا تھا کہ وہ ہمیں میکسیکو میں کسی اردو والے سے بھی ملائیں گے۔یوں بھی اردو اور غربت دونوں لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔یہ اور بات ہے کہ امریکہ میں اردو کا جو بول بالا ہے وہ غریبوں کی نہیں بلکہ کھاتے پیتوں کی دین ہے۔وہ تو ہمیں اصل میں میکسیکو کی غربت کا دیدار کرانے کے لئے لے گئے تھے۔اب ہم انھیں کیسے سمجھاتے کہ غربت کا دیدار کرنے کے لئے ہم بسا اوقات آئینہ میں اپنی شکل دیکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔پھر غربت کے معاملہ میں ہم ہندوستانی خاصے خود مکتفی ہیں۔ہمیں غربت کو دیکھنے کے لئے کسی اور ملک میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔

بہرحال پچھلے چند دنوں میں اتنے امریکی شہروں میں گئے ہیں کہ نیویارک کی سڑکوں کی ملاوٹ غلطی سے واشنگٹن کی سڑکوں میں کر دیتے ہیں۔شکاگو کی کسی عمارت کو ڈیٹرائیٹ میں تلاش کرتے ہیں۔کسی مقام کو لاس اینجلس میں قیاس کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقام تو نیوجرسی میں واقع ہے۔غرض ہمارے ذہن میں امریکی شہروں کی افراتفری ہو رہی ہے بلکہ افراتفریح کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔جو لوگ برسوں سے امریکہ میں مقیم ہیں انھوں نے بھی اتنے سارے شہر نہ دیکھے ہونگے۔لاس اینجلس کے طویل ہوائی سفر میں ہمارے ہمدم دیرینہ حسن چشتی بھی ہمارے ساتھ تھے بلکہ لاس اینجلس میں ہمارے سلسلہ میں منعقد ہونے والی ادبی محفل کے مہمان خصوصی وہی تھے۔انھوں نے انکشاف کیا کہ جس تاریخ سے وہ امریکہ آئے ہیں تب سے شکاگو شریف میں ہی مقیم رہے ہیں۔کبھی شکاگو شریف کے بلدی حدود سے باہر قدم نہیں نکالا۔وہیں بیٹھے بیٹھے اردو کی خدمت میں ایسے جُٹ گئے کہ امریکہ کے کسی اور شہر میں جانے کا موقع نہ ملا۔کہنے لگے اگر آپ امریکہ نہ آتے تو مجھے امریکہ کو دیکھنے کا موقع نہ ملتا۔ان کے اس پہلو کے بارے میں بعد میں لکھیں گے۔آج ہم فی الحال تبدیلیٔ ذائقہ کے طور پر اس تقریب کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو ریاست میری لینڈ کے ضعیفوں یا بزرگوں کے اعزاز میں بالٹی مور میں منعقد ہوئی تھی۔ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ امریکہ میں ایک محکمہ عمر رسیدگی بھی موجود ہے جو بزرگوں کے مسائل کی نگرانی کرتا ہے۔اسی محکمہ کی زیر نگرانی اور میری لینڈ کے گورنر پیریس گلینڈننگ اور لیفٹننٹ گورنر کیتھلین کینڈی کی

سرپرستی میں یہ تقریب منعقد ہوئی تھی۔اس تقریب میں میری لینڈ کے ان 75 بزرگوں کو بُلایا گیا تھا جن کی عمریں سو سال کے اوپر ہو چکی ہیں۔خیال رہے کہ ہمیں اس تقریب میں بزرگ کی حیثیت سے نہیں بلایا گیا تھا بلکہ اس تقریب میں ہم اپنے چچا مولوی محمد غوث کے ساتھ گئے تھے جو اب 101 سال کے ہو گئے ہیں۔(افسوس کہ مارچ ۲۰۰۱ء میں یہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے)۔معلوم ہوا کہ ریاست میری لینڈ میں 500 سے زیادہ بزرگ ایسے ہیں جن کی عمریں سو سال سے تجاوز کر چکی ہیں۔ان کے اعزاز میں بالٹی مور کے مارٹین ویسٹ ہوٹل میں ظہرانہ ترتیب دیا گیا تھا۔امریکہ میں سماجی تحفظ اور طبی سہولتوں کی فراہمی کی وجہ سے عام آدمی کی اوسط عمر میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔اس تقریب کے انعقاد کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ نئی نسل اپنے بزرگوں کی عزت کرنا سیکھے۔نئی نسل بزرگوں کی کتنی عزت کرتی ہے یہ ایک الگ مسئلہ ہے کیونکہ امریکہ میں جونہی بچے اٹھارہ اُنیس سال کے ہو جاتے ہیں تو اپنی دنیا الگ بسا لیتے ہیں اور بزرگوں کو اپنے آپ ضعیف ہونے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔خیر ان سنجیدہ مسئلوں سے ہمیں کیا لینا دینا ہے۔تاہم ہم نے اس دن جن بزرگوں کو دیکھا ان کی 'نوجوانی' کو دیکھ کر اپنے بڑھاپے پر رونا آیا بلکہ تقریب کے ایک منتظم نے تو ہمیں بھی سو سال کا سمجھ لیا اور ہمیں ان نشستوں کی طرف لے جانے لگا جو بزرگوں کے لئے مختص تھیں۔بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔105 سال کی ایک خاتون نے زوردار تقریر بھی کی۔معلوم ہوا کہ سو سال کی عمر میں انہوں نے ایک کتاب بڑھاپے کے موضوع پر تصنیف کی تھی اور اس کے بعد سے ہر سال ایک نئی کتاب اس موضوع پر لکھتی جا رہی ہیں۔اللہ اللہ کیا حوصلہ ہے۔

بعض بزرگوں نے سو سال کی عمر کو پار کر جانے کی جو وجوہات بتائیں وہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں تھیں۔آپ بھی چند بزرگوں کی باتیں سن لیں۔

☆ میری صد سالہ زندگی کا راز یہ ہے کہ مجھے بے حد محبت کرنے والے تین شوہر نصیب ہوئے (گویا تینوں شوہروں نے محبت کے معاملہ میں اتنی مشقت کی کہ دنیا سے ہی رخصت ہو گئے)

☆ خوب کھاؤ اور خوب سو جاؤ

☆ کبھی شادی نہ کرو

☆ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرو اور ڈنر کے ساتھ وہسکی پیو

☆ اپنے ذہن پر کسی بات کا بوجھ نہ پڑنے دو

اگر آپ خدانخواستہ ان مشوروں پر عمل کریں تو ہوسکتا ہے وقت سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ یہ عمر بڑھانے کے نہیں بلکہ عمر گھٹانے کے نسخے ہیں۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ امریکہ میں جینے کے ڈھنگ ہی نرالے ہیں۔ بہر حال امریکہ کے ان بوڑھوں کو دیکھ کر ہم شرم سے پانی پانی ہو گئے۔ بخدا بعض تو اتنے چُست اور پھرتیلے دکھائی دیئے کہ لگتا ہے دوسو برس تک جینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ایک شریر اور کھلنڈرے نیگرو بڈھے نے ہمیں دیکھ کر آنکھ بھی ماری۔ خود ہمارے چچا قبلہ جنہوں نے اپنی زندگی کے اسیّ برس حیدرآباد اور عثمان آباد میں گذارے ہیں، اب بھی دن میں تین مرتبہ چہل قدمی فرماتے ہیں۔

سو سال کی عمر یقیناً بڑی محنت سے حاصل ہوتی ہے اور اس کے برملا اظہار میں کسی جھجک کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ہندوستانیوں کی عادت ہے کہ اپنی عمر چھپاتے پھرتے ہیں۔ جہاں بالوں میں سفیدی آئی اسے خضاب سے رنگنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے ایک بزرگ دوست ہوا کرتے تھے جنھوں نے نہ جانے کیوں عمر کے آخری حصہ میں اچانک اپنے بالوں کو خضاب سے رنگنا شروع کر دیا تھا۔ ایک دن ہم نے غفلت میں ان کا تعارف ایک صاحب سے کرانا شروع کیا تو ان صاحب نے ہمیں ٹوکتے ہوئے کہا جناب! آپ ان کا تعارف ہم سے کیا کرائیں گے۔ ہم تو انھیں اُس وقت سے جانتے ہیں جب ان کے بال سفید ہوا کرتے تھے۔

بہر حال بزرگوں کے احترام میں منعقدہ یہ تقریب نہایت پرشکوہ تھی جس کی کارروائی بالٹی مور کی مشہور ٹیلی ویژن آرٹسٹ ڈونا ہیملٹن نے چلائی اور جب تک وہ کارروائی چلاتی رہیں بیشتر بزرگ (بشمول ہمارے) ٹکٹکی باندھے اور پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھنے میں مصروف رہے۔

(''سیاست۔'' ۱۱ر جون ۲۰۰۰ء)

☆☆

ذکر امریکہ کے اُردو اخبارات کا

جیسا کہ آپ جانتے ہیں امریکی معاشرہ 'صارفین کا معاشرہ' ہے۔ ہر وہ چیز جس کی ضرورت معاشرہ کو ہو وہ یہاں بیچی اور خریدی جاسکتی ہے۔ مگر ایک چیز ہمیں یہاں ایسی نظر آئی جو بیچی نہیں جاتی بلکہ مفت میں مل جاتی ہے اور وہ ہے اُردو اخبار۔ جہاں کہیں بھی ہندوستانی اور پاکستانی کرانہ مرچنٹ کی دوکانیں ہوتی ہیں، ہوٹل ہوتے ہیں اور حلال گوشت کی دکانیں ہوتی ہیں وہاں یہ اخبار تقسیم کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ سبزی ترکاری، مصالحے، حلال گوشت وغیرہ خریدیئے اور ساتھ میں اردو اخبار بھی لیتے آیئے۔ وطن عزیز میں اردو اخبار اپنے قارئین سے التجا کرتے پھرتے ہیں کہ وہ اردو اخبار خرید کر پڑھیں اور اپنی زبان کی خدمت کریں۔ ابتداء میں ہم بھی کئی دنوں تک حیران رہے کہ ایسے ضخیم اخبار آخر کس طرح مفت میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ ان کے نکالنے پر کچھ تو خرچ آتا ہوگا۔ صحافیوں اور لکھنے والوں کو معاوضہ دینے کا رواج تو ہمارے بیشتر اخبارات میں نہیں ہے۔ یہاں بھی نہیں ہوگا لیکن کاتب اور کمپوزیٹر کو تو معاوضہ دینا پڑتا ہوگا۔ بعد میں احساس ہوا کہ یہ اخبار اصل میں چیزوں کو بیچنے کا ہی ایک ذریعہ ہیں کیونکہ ان میں بڑے بڑے اشتہارات ہوتے ہیں۔ ہوٹل والوں کے، حلال گوشت بیچنے والوں کے، ہندوستانی اور پاکستانی اشیاء اور مصالحے بیچنے والوں کے، ادب کی دکانیں چلانے والوں کے۔ ان اخبارات کی معیشت کا سارا دارومدار ہی اشتہارات پر ہوتا ہے۔ اردو کا کوئی روزنامہ تو یہاں سے شائع نہیں ہوتا البتہ ہر ہفتہ یہ اخبارات نہایت پابندی سے شائع ہوتے ہیں۔ جہاں تک امریکہ کے انگریزی

اخبارات کا تعلق ہے ہر علاقے سے کوئی نہ کوئی اخبار شائع ہوتا ہے اور سب کے سب ضخیم اور لحیم شحیم۔ ’نیویارک ٹائمز‘ کی بڑی شہرت ہے۔ دو ایک بار ہم نے اسے پڑھنے کی کوشش بھی کی پھر خیال آیا کہ خدانخواستہ ہم اسے سنجیدگی سے پڑھنے میں مصروف ہوگئے تو نہ تو امریکہ کو دیکھ سکیں گے اور نہ ہی دوستوں اور رشتہ داروں سے مل پائیں گے۔ بلاشبہ ایک دن کے پورے اخبار کو پڑھنے کے لئے پورا ایک ہفتہ درکار ہوگا۔ آپ نے اس سیاح کا قصہ تو ضرور سنا ہوگا جو کسی شہر کی سیر کے لئے آیا تو اس نے ہوٹل کے بیرے سے ازراہ احتیاط یہ پوچھ لیا کہ ہوٹل میں کھانے کے کیا اوقات مقرر ہیں۔ بیرے نے کہا ’’حضور! ناشتہ صبح میں سات بجے سے گیارہ بجے تک، لنچ بارہ بجے سے چار بجے تک، شام کی چائے پانچ بجے سے سات بجے تک اور رات کا کھانا سات بجے سے رات میں بارہ بجے تک۔‘‘ اس پر سیاح نے گھبرا کر کہا ’’اگر کھانے کے یہ اوقات مقرر ہیں تو پھر میں اس شہر کی سیر کے لئے وقت کب نکال پاؤنگا۔ سارا وقت کھانا کھانے میں ہی نکل جائے گا۔‘‘ بہر حال قاری تو قاری ہے امریکہ کے اخبارات کے ایڈیٹر بھی پورے اخبار کا مطالعہ نہ کرتے ہونگے۔ ہر آدمی اپنے مطلب کی بات پڑھ لیتا ہے اور اخبار کو پرے رکھ دیتا ہے۔ امریکہ کے زیادہ تر اردو اخبارات نیویارک سے شائع ہوتے ہیں۔ کسی نے بتایا کہ ان اخبارات کی تعداد آٹھ ہے۔ اردو ٹائمز، پاکستان ایکسپریس، پاکستان پوسٹ، پاکستان نیوز، پاکستان ٹوڈے کے شمارے تو خود ہماری نظر سے گذر چکے ہیں۔ یہ سب کے سب مفت میں تقسیم ہوتے ہیں۔ البتہ ایک اردو اخبار ’اُردو لنک‘ ہے جو پاکستان لنک کے ساتھ باضابطہ فروخت ہوتا ہے۔ یہ اخبار لاس اینجلس سے شائع ہوتا ہے جس کے ایڈیٹر ہمارے کرم فرما عبدالرحمٰن صدیقی ہیں۔ ’پاکستان لنک‘ کے چیف ایڈیٹر فیض الرحمٰن صدیقی ہیں جو عبدالرحمٰن صدیقی کے فرزند ہیں۔ بے حد فعال، متحرک، ذہین اور گہری سوجھ بوجھ رکھنے والے نوجوان ہیں۔ ہمیں لاس اینجلس میں ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ نہایت کھلے دل و دماغ والے وسیع النظر آدمی ہیں۔ ان کے دفتر بھی جانے کا موقعہ ملا۔ ایسا صاف ستھرا، وسیع و کشادہ، قرینے والا اور ذرائع ابلاغ کی ساری عصری ضرورتوں سے آراستہ دفتر ہے کہ جی خوش ہوگیا۔ امریکہ کے سرکاری اور سماجی حلقوں میں بھی فیض الرحمٰن صدیقی بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، پاکستان لنک کے علاوہ اردو لنک کے کالم بھی نہایت وقیع ہوتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کی خبروں کو نہایت غیر جانبداری کے ساتھ پیش

کیا جاتا ہے۔ ادبی تخلیقات کی پیش کشی میں بھی اس بات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ برصغیر میں اردو زبان وادب کے مسائل پر اس اخبار کے صفحات پر سنجیدہ علمی بحثیں چلتی رہتی ہیں۔ عبدالرحمٰن صدیقی حیدرآبادی ہیں۔ البتہ فیض الرحمٰن صدیقی کی ساری تعلیم وتربیت پاکستان میں ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود ضرورت پڑنے پر دکنی زبان میں بھی بڑی روانی کے ساتھ اظہار خیال کر لیتے ہیں۔

نیویارک کے اردو اخبارات میں بھی خاصے دلچسپ کالم ہوتے ہیں، ادبی محفلوں کی روداد یں ہوتی ہیں، معاصرانہ چشمکوں کا بیان ہوتا ہے۔ کئی اچھے کالم نگاران اخباروں سے وابستہ ہیں۔ ادھر کچھ عرصہ سے ہمارے دوست افتخار نسیم بھی امریکہ کے اردو اخباروں میں پابندی سے کالم لکھنے لگے ہیں۔ افتخار نسیم منفرد شاعر اور افسانہ نگار ہونے کے علاوہ امریکہ میں Gay تحریک کے سربراہوں میں سے ہیں۔ بے حد ذہین، فطین بلکہ طرار اور بے حد دلچسپ باتیں کرنے والے آدمی ہیں۔ جتنا کھلا دل ودماغ رکھتے ہیں اس سے کہیں زیادہ اپنی زبان کھلی رکھتے ہیں۔ یہی ایک خرابی اُن میں ہے جسے وہ خوبی سمجھتے ہیں۔ لوگ انھیں بیباک کالم نگار کہتے ہیں مگر ہم انھیں 'بے باق کالم نگار' سمجھتے ہیں کیونکہ اپنے کالم میں وہ سب کا حساب 'بے باق' کر دیتے ہیں۔ کتابوں کی رسم اجراء کی تقریب کو 'نتھ اُترائی' کی تقریب کا نام دیتے ہیں، اردو ادیبوں اور شاعروں کو انھوں نے دو فرقوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ فرقہ تصویریہ اور فرقہ تقریریہ۔ فرقہ تصویریہ وہ جو اپنی تصویریں کھنچوانے اور ان تصویروں کو اخباروں میں چھپوانے میں دلچسپی رکھتا ہے اور فرقہ تقریریہ وہ جو تقریریں کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ ان کے کالم پر ایک نوٹ بھی لکھا ہوتا ہے کہ کمزور دل والے اصحاب اس کالم کو نہ پڑھیں۔ اکثر اصحاب از راہِ تجسس اپنے دل کی طاقت اور توانائی کا اندازہ لگانے کے لئے اس کالم کو پڑھتے ہیں اور بعد میں بڑی دیر تک اپنے کمزور دل کو تھامے رہتے ہیں۔ افتخار نسیم دوستوں میں 'افتی' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ افتی کی وجہ سے امریکہ کے ادبی حلقوں میں بڑی ہلچل سی مچی رہتی ہے۔ کچھ لوگ تو خوفزدہ بھی رہتے ہیں۔ افتی ہمارے پُرانے دوستوں میں سے ہیں۔ وہ جب بھی دہلی آتے ہیں تو ہم دونوں ایک دوسرے کو ڈھونڈ کر ضرور ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ملنے میں کم اور ڈھونڈنے میں زیادہ وقت ضائع ہو جاتا ہے۔

پرسوں شکاگو کے 'لیک شور' جیسے مہنگے علاقہ میں ان کے خوبصورت اپارٹمنٹ میں بھی جانے کا موقع ملا۔ گھر میں ہر جگہ کتابیں بکھری پڑی ہیں۔ کتابوں کے اس انبار میں ہمیں تو خود افتی بھی

ایک کتاب کی طرح ہی نظر آئے۔

ہم نے نیویارک میں بھی پانچ دن گذارے جہاں ہمارے ایک بھائی یوسف حسین اور دو بھائیوں کے حوالے سے چھ بھتیجے اور بھتیجیاں رہتی ہیں، ان سب میں پانچ دنوں کے وقت کو تقسیم کرنا بہت مشکل تھا۔ لہذا کسی نے ہمیں عصر میں ملایا تو کسی نے ظہر میں۔ کسی نے فجر میں ملایا تو کسی نے عشاء میں۔ اس وجہ سے نیویارک کے اردو اخبارات کے سربراہوں اور صحافیوں سے ملنے کا موقع نہ مل سکا۔

تاہم 'پاکستان نیوز' کے پریسڈنٹ اور پبلیشر مجیب لودھی ہمارے شاعر دوست خالد عرفان کے ساتھ ہم سے ملنے آ گئے تھے۔ بڑی محبت سے ملے۔ 'پاکستان نیوز' ہمارے اس کالم کو بھی پابندی سے شائع کرتا ہے جس پر ایک نوٹ بھی لکھا ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کمزور دل والے اصحاب اس کالم کو ضرور پڑھیں۔ سولہ برس پہلے جب ہم یہاں آئے تھے تب امریکہ سے کوئی اردو اخبار شائع نہیں ہوتا تھا۔ اب دیکھئے کہ کتنے سارے اردو اخبارات نکلنے لگے ہیں۔ کچھ لوگ اس بات کو امریکہ کی ترقی کا ثبوت گردانتے ہیں۔ 'اردو ٹائمز' کے ایڈیٹر کے بارے میں پتہ چلا کہ کسی زمانہ میں ان کا تعلق بھی حیدرآباد سے رہ چکا ہے۔ آخر میں ایک بات اور عرض کردیں کہ اردو کے عہد ساز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی بھی جلد ہی پاکستان سے امریکہ آنے والے ہیں۔ شاید واشنگٹن میں اُن سے ہماری ملاقات بھی ہو۔ وہ ایک ایسے مزاح نگار ہیں جن کی تحریروں کی بدولت اب اردو کا مزاحیہ ادب دنیا کی کسی بھی بڑی زبان کے مزاحیہ ادب سے نہ صرف آنکھ ملا سکتا ہے بلکہ آنکھ بھی مار سکتا ہے۔

(''سیاست'' ۱۸/جون ۲۰۰۰ء)

☆☆

مشتاق احمد یوسفی سے تجدید ملاقات

ہم اکثر اس بات پر سنجیدگی سے غور کرتے رہتے ہیں کہ اردو کے بیشتر سرکردہ مزاح نگار اور طنز نگار، جو اپنی تحریروں میں نہایت چوکس، زیرک، مستعد، چالاک، ہوشیار، باخبر بلکہ سفاک تک نظر آتے ہیں، وہ اپنی عملی زندگی میں اتنے ہی سادہ لوح، بے لوث، شریف، نیک، مخلص، بے نیاز، بے ریا بلکہ معصوم تک کیونکر دکھائی دیتے ہیں۔ کرشن چندر، کنہیا لال کپور، ضمیر جعفری، فکر تونسوی اور

لندن میں مشتاق احمد یوسفی کے گھر پر منعقدہ ایک تقریب میں مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین

یوسف ناظم وغیرہ سب کو نہ صرف دیکھ چکے ہیں بلکہ انھیں برت بھی چکے ہیں۔ سب کے سب نہایت سادہ دل اور مخلص بندے نظر آئے۔ رشید احمد صدیقی، ابن انشاء، شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خاں وغیرہ کے بارے میں بھی لوگوں سے سنا کہ عملی زندگی میں یونہی سے انسان تھے۔ اس تضاد پر بہت غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ طنز نگار جن برائیوں یا جن بے اعتدالیوں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتا ہے ان سے وہ اپنی عملی زندگی میں بھی اجتناب کرتا ہے اور اپنے فعل کو خود اپنے قول کے مطابق رکھتا ہے۔ اور لوگ تو اپنا ضمیر تک بیچ دیتے ہیں، یہ اپنا 'مافی الضمیر' تک بیچنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ ایسے موقعوں پر ہمیں اپنا ہی ایک جملہ اکثر یاد آتا ہے کہ ظرافت نگاری کے لئے آدمی کا ظریف ہونا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کا باظرف ہونا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔

یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ پچھلے دنوں پورے سولہ برس بعد اردو کے سب سے بڑے مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی سے واشنگٹن میں ہماری ملاقات کی سبیل نکل آئی۔ واشنگٹن امریکہ کا صدر مقام تو ہے ہی ہمارا بھی صدر مقام ہے۔ امریکہ میں کہیں بھی جاتے ہیں تو پھر لوٹ کر یہیں آجاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہاں ہمارا کوئی وہائٹ ہاوز ہے بلکہ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہاں ہمارے چھوٹے بھائی ڈاکٹر اصغر حسین رہتے ہیں۔ یوسفی جلسوں، محفلوں اور بھیڑ بھڑکوں سے ہمیشہ دور رہتے ہیں۔ نہایت کم آمیز، کم گو، اپنے آپ میں بند چھوئی موئی سی شخصیت ہیں۔ ایک مہینہ پہلے جب ہمیں پتہ چلا تھا کہ یوسفی واشنگٹن کی تین تنظیموں آواز ٹیلی ویژن، بزمِ ادب اور کراچی المنائی ایسوی ایشن کی دعوت پر واشنگٹن آنے والے ہیں تو خود ہمیں بھی اس معجزے پر حیرت ہوئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ امریکہ میں ان کی ایک صاحبزادی بھی رہتی ہیں۔ یوسفی برطانیہ میں، جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے گیارہ برس گزارے ہیں اور جہاں ان کی ایک اور صاحبزادی رہتی ہیں، کچھ دن قیام کرنے کے بعد اپنی اہلیہ کے ہمراہ امریکہ آئے ہیں۔ لندن میں ہی ہمارے احباب نے انھیں بتادیا تھا کہ ہم ان دنوں امریکہ میں ہیں۔ واشنگٹن میں ہم ایک عام تماشائی اور ان کے ایک ادنیٰ پرستار کے طور پر ان کے اعزاز میں منعقد ہونے والی تقریب میں شرکت کرنا چاہتے تھے۔ تقریب سے ایک دن پہلے وائس آف امریکہ کے ڈاکٹر معظم صدیقی سے تقریب کی داعی فیروزہ صلاح الدین کا فون نمبر حاصل کر کے مشتاق احمد یوسفی کی آمد کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگیں ''یوسفی صاحب آچکے ہیں۔ اس وقت میرے گھر پر ہیں اور آپ کے بارے

میں دریافت کر رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آج رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں۔''
افسوس کہ اُس رات ہمیں چند گھنٹوں کے لئے رچمنڈ جانا تھا۔ غرض یوسفی صاحب سے سولہ برس بعد فون پر بات ہوئی۔ کہنے لگے'' اگر آپ کل تقریب سے کچھ دیر پہلے ہی آ جائیں تو وہاں بھی ملاقات ہوسکتی ہے۔'' اتفاق سے اس وقت ہمارے دو عزیز دوست افتخار عارف اور امجد اسلام امجد بھی فیروزہ صلاح الدین کے ہاں موجود تھے جو اسی وقت پاکستان سے امریکہ پہنچے تھے۔ دونوں سے بھی فون پر باتیں ہوئیں۔ افتخار عارف جو مقتدرہ قومی زبان پاکستان کے چیرمین ہیں اب اکادمی ادبیات پاکستان کے چیرمین بھی بن گئے ہیں۔

امجد اسلام امجد نے کہا'' یار تم اسی وقت کیوں نہیں آ جاتے۔'' اس پر ہم نے امجد سے کہا '' یار! تم تو کئی بار امریکہ آ چکے ہو۔ تم تو جانتے ہو کہ باہر سے جو کوئی بھی یہاں آتا ہے تو وہ 'میّت' میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ باہر سے یہاں آنے والے کی حالت بالکل میّت جیسی ہو جاتی ہے کیونکہ جب تک میّت کو اٹھایا نہ جائے وہ کہیں جا نہیں سکتی۔'' امجد نے اس بات پر زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر کہا'' یہاں چار کندھوں کے بجائے موٹر کے چار پہیوں کی حاجت تو ضرور پیش آتی ہے۔'' طے یہ ہوا کہ دوسرے دن علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ڈاکٹر عبداللہ ہمیں اور ڈاکٹر اصغر حسین کو لے کر پہلے آواز ٹیلی ویژن کے سربراہ ندیم خان کے گھر جائیں گے جہاں افتخار عارف اور امجد اسلام امجد مقیم ہیں، پھر وہیں سے جلسہ گاہ کی طرف جائیں گے۔ یوسفی صاحب کا قیام ایک ہوٹل میں تھا۔ ۱۷ جون کو ہم وقت سے پہلے جلسہ گاہ میں پہنچے تو منتظمین نے کہا کہ یوسفی صاحب کب کے آ چکے ہیں اور آپ کو پوچھ رہے ہیں۔ سولہ برس بعد یوسفی صاحب سے مل کر، انھیں دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی اس کا حال ہم کیسے بیان کریں۔ لندن میں ان کے ساتھ گزارے ہوئے سارے لمحے یاد آئے۔ اتنے طویل عرصہ بعد یوسفی ہمیں تو بالکل صحیح سالم نظر آئے۔ اگر چہ کچھ دبلے ہو گئے ہیں۔ بال بھی کچھ زیادہ کالے ہو گئے ہیں البتہ چہرہ پر وہی تازگی اور بشاشت برقرار ہے۔ یوسفی اپنی تحریروں میں اپنی کمزور صحت اور اپنی علالتوں کا بڑی محبت کے ساتھ اکثر ذکر کرتے رہتے ہیں۔ خیال آیا کہ ایسی صحت مند بیماریاں سب کو نصیب ہوں تو کیا کہنے۔ یوسفی بہت محبت سے ملے اور ہمیں گلے سے لگالیا۔ یوسفی اس بات سے بہت رنجیدہ تھے کہ پچھلا سال اردو طنز و مزاح کے حق میں بہت بُرا ثابت ہوا کیونکہ ضمیر جعفری، کرنل محمد خاں اور شفیق الرحمٰن دیکھتے ہی دیکھتے چل بسے۔

شفیق الرحمٰن کے بارے میں یہ انکشاف بھی کیا کہ نوجوانی میں میری عین تمنا یہ رہتی تھی کہ کاش میں بھی شفیق الرحمٰن کی طرح تحریر لکھ سکوں۔ بہت کوشش کی لیکن ان کی طرح لکھ نہیں پایا۔ نتیجہ میں چھ سات برس تک کوئی تحریر نہیں لکھی (اب ہم یوسفی کو کیسے بتاتے کہ شروع میں ہماری بھی عین تمنا یہ تھی کہ ہم یوسفی کی طرح لکھ سکیں۔ نتیجہ میں آج تک کچھ نہیں لکھ پائے۔) طنز و مزاح کی موجودہ عالمی صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے جارج میکش کا قول دہرایا کہ مغرب میں مزاح مر چکا ہے۔ اس پر ہم نے کہا ''لیکن مشرق میں تو آپ نے اسے اب تک زندہ رکھا ہوا ہے۔'' حسبِ معمول مُسکرا کر خاموش ہو گئے۔ پھر خود ہی ہمارے بارے میں فرمانے لگے ''حضرت! آپ کی تحریریں نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ آپ میں تین خوبیاں ہیں۔ اوّل تو یہ کہ آپ قلم برداشتہ لکھتے ہیں، دوسرے یہ کہ آپ کے ہاں تکرار کا عمل نہیں ہے اور تیسرے یہ کہ آپ کی تحریروں میں تر و تازگی برقرار ہے۔'' ہم شرم سے پانی پانی ہونے لگے تو بولے ''میری ایک بات مانئے اپنی تحریروں کا ایک ضخیم مگر کڑا انتخاب شائع کیجئے۔'' (یہ ایک اتفاق ہے کہ ابھی پچھلے ہفتہ ہمارے دوست حسن چشتی نے ہماری تحریروں کا ایک انتخاب شائع کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے)۔ یوسفی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم رہ چکے ہیں۔ لہٰذا علی گڑھ کا حال پوچھا۔ اپنے ہم جماعت مظفر حسین برنی، سابق گورنر ہریانہ کی خیریت بطور خاص پوچھی۔ یوسفی نے اب تک اردو ادب کو چار کتابیں دی ہیں۔ ان کی لازوال کتاب 'آبِ گم' کو چھپے ہوئے دس برس بیت چکے ہیں۔ یوسفی نے بتایا کہ ان دنوں وہ ایک ناول لکھنے میں مصروف ہیں۔ یہ کب مکمل ہوگا اس کے بارے میں ہم نے کچھ نہیں پوچھا کیونکہ یوسفی جس اہتمام کے ساتھ لکھتے ہیں اس کے لئے بڑا حوصلہ چاہیے۔ ایک ایک لفظ نپا تلا، ہر جملہ سجا سجایا، ہر پیراگراف کسا کسایا۔ ان جیسا انشاء پرداز اب اردو میں کوئی اور نہیں ہے۔ یوسفی اپنی ہر کتاب کے بیچ کم از کم دس برس کا وقفہ ضرور دیتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنے آپ سے مخلص ہیں بلکہ اپنے فن سے بھی مخلص ہیں اور اس کے بعد اپنے معاشرہ اور ساری عالمی برادری سے بھی مخلص ہیں۔ کراچی المنائی ایسوسی ایشن کی یہ تقریب نہایت پر شکوہ تھی جس میں امریکہ میں پاکستان کی سفیر محترمہ ملیحہ لودھی کے علاوہ امریکہ میں مقیم پاکستان کی کئی مقتدر ہستیاں بھی موجود تھیں۔ اس تقریب میں یوسفی نے ہم جیسے ادنیٰ مزاح نگار کی ہمت افزائی یوں فرمائی کہ جب حاضرین کو مخاطب کرنے آئے تو سب سے پہلے اس کمترین کا نام لیا۔ کیسے بتائیں کہ یوسفی کی اس

بڑائی کے آگے ہم نے اپنے آپ کو کتنا چھوٹا محسوس کیا۔ یہ ان کی اعلاظرفی کا ثبوت تھا۔ یوسفی نے سوا گھنٹہ تک اپنی تحریر کا جادو جگایا اور اپنے مختلف مضامین کے اقتباسات سنائے۔ سامعین نے ان کے ہر جملہ پر اس طرح داد دی جیسے شعر پر دیتے ہیں۔ امریکہ کے اردو داں حضرات جو آئے دن کے مشاعروں میں شاعروں کے برسوں پرانے کلام کو سن سن کر اب چکے ہیں سوچنے لگے ہیں کہ کیوں نہ اب نثری محفلوں کے انعقاد کا اہتمام کیا جائے۔ یوسفی ان انشاء پردازوں میں سے ہیں جو اپنی زندگی میں ہی ایک 'لیجنڈ' (Legend) بن چکے ہیں۔ فراق گورکھپوری کی ایک غزل کا مقطع ہے۔

آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی اے ہم عصرو
اُن کو جب معلوم یہ ہوگا، تم نے فراقؔ کو دیکھا تھا

یوسفی کو ہم نے دیکھا، اُن سے باتیں کیں، یہ ہمارے لئے ایک اعزاز نہیں تو اور کیا ہے۔

(''سیاست۔'' ۲۵/جون ۲۰۰۰ء)

☆☆

ہمارے چاہنے والے

واشنگٹن میں ہمارا یہ چوتھا پھیرا ہے اور اگر یہ پھیرا نہ ہوتا تو ہمیں پتہ ہی نہ چل پاتا کہ امریکہ میں بھی ہوائی جہاز لیٹ ہوجاتے ہیں۔ ہمیں پرسوں ساوتھ ویسٹ ایرلائنس کی دن میں ڈیڑھ بجے والی فلائیٹ سے شکاگو کے مڈوے ایرپورٹ سے واشنگٹن آنا تھا۔ ہمارے دوست جلیل قادری، جو کبھی فائن آرٹس اکیڈیمی اور زندہ دلان حیدرآباد کے سرگرم کارکن رہ چکے ہیں اور ولا اکیڈیمی حیدرآباد کے معاملوں میں حسن الدین احمد کے دست راست بھی رہ چکے ہیں، ہمیں ایرپورٹ لیجانے کے لئے دس بجے ہی پہنچ گئے تھے۔ جلیل قادری کو جب زندہ دلان شکاگو کی سربراہ غوثیہ سلطانہ سے پتہ چلا کہ ہم شکاگو میں ہیں تو اپنے سارے کام چھوڑ کر اب ہمارے دستِ راست بن گئے۔ حیدرآباد میں ہم پر جس طرح کی محبت نچھاور کیا کرتے تھے یہاں بھی اسی طرح کی محبت نچھاور کررہے ہیں، حالانکہ شکاگو میں رہ کر حیدرآبادیوں کی طرح محبت کرنا ناممکن سی بات ہے۔ شکاگو کے چپہ چپہ سے واقف ہیں۔ ہرروز اپنی موٹر لے کر شکاگو کی سیر کرانے کے لئے آجاتے ہیں۔ ہمارے سارے اُمور ان ہی کی معرفت انجام پارہے ہیں۔ ہمارے بھتیجے ڈاکٹر مجاہد حسین نے ہمارے میڈیکل چیک اپ کا اہتمام کیا تو یہ ہمیں وہاں بھی لے گئے بلکہ ہمارا چیک اپ کرنے والے امریکی ڈاکٹر کو بڑی تفصیل اور اصرار کے ساتھ یہاں تک کہا کہ اگر چیک اپ کے دوران ہمیں کوئی تکلیف ہوتو وہ اس تکلیف کو خود سے برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اللہ اللہ اب ایسے دوست کہاں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر عابد اللہ غازی، خواجہ ریاض الدین عطش،

حسن چشتی، افتخار نسیم، راشد علی خان، غوثیہ سلطانہ، خورشید خضر، ہمارے بھائیوں اور نہ جانے کتنے ہی دوستوں کے پاس یہ ہمیں لے گئے۔ کبھی راستہ نہیں بھٹکے۔ ہمارے بچپن کے دوست ڈاکٹر خورشید خضر تو صرف نام کے خضر ہیں بلکہ یہ تو ہمیں ادب میں زیادہ سے زیادہ بھٹکانے کا کام انجام دیتے ہیں۔ جلیل قادری سچ مچ خضرِ راہ ہیں۔ لیکن پرسوں ہمیں مڈوے ایرپورٹ لے جانے کے لئے آئے تو بولے ڈیڑھ بجے کی فلائیٹ پکڑنے کے لئے ابھی سے ایرپورٹ جانے کی کیا ضرورت ہے۔ چلو اتنی دیر میں شکاگو کے کچھ اور علاقوں کی سیر کرتے ہیں۔ اُس دن نہ جانے کیا ہوا کہ وہ اچانک راستہ بھٹک گئے۔ نقشہ دیکھ رہے ہیں، لوگوں سے پوچھ رہے ہیں لیکن ایرپورٹ کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی ہمیں دو مرتبہ یہ مڈوے ایرپورٹ پر چھوڑ چکے ہیں۔ جب فلائیٹ کے چھوٹنے میں صرف بیس منٹ باقی رہ گئے تو ہم نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔ ’’قادری صاحب آج تو فلائیٹ کو پکڑنا ناممکن سا نظر آتا ہے۔‘‘ بولے ’’میاں مجتبیٰ کیا تم نہیں جانتے کہ تم جلیل قادری کے ساتھ ہو۔ ضرورت پیش آئے تو میں بارہ گھنٹوں کا سفر طے کر کے تمہیں اپنی گاڑی میں واشنگٹن چھوڑ سکتا ہوں لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی کیونکہ مجھے اپنی روحانی طاقت پر پورا بھروسہ ہے۔ میں اچھے اچھے ہوائی جہازوں کی پروازوں کو روکنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔‘‘ بہرحال ہم بھاگم بھاگ فلائیٹ کے وقت سے صرف چند منٹ پہلے مڈوے پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ شکاگو اور واشنگٹن کے خراب موسم کی وجہ سے پرواز ایک گھنٹہ تاخیر سے جائے گی۔ اب جو جلیل قادری اپنی روحانی کرامت پر خوش ہوئے تو خوش ہوتے ہی چلے گئے۔ جن پروازوں کو وہ ماضی بعید میں مختلف وجوہات کی وجہ سے روک چکے تھے یا جن کی روانگی کو ملتوی کرا چکے تھے ان کی تفصیل مزے لے لے کر بیان کرنے لگے۔ پھر کہنے لگے ’’امریکی ہوائی جہازوں میں کھانا نہیں ملتا۔ اب چل کر کہیں کھانا کھالو‘‘۔ ہم نے کہا ’’ایک گھنٹہ بعد تو ہمیں جانا ہی ہے۔ اب کیوں خطرہ مول لیں۔‘‘ بولے ’’اگر ایسی بات ہے تو میں تمہارے لنچ کی خاطر اس فلائیٹ کو مزید ایک گھنٹہ کے لئے رُکوا دیتا ہوں۔‘‘ اور یہ ایک اتفاق ہے کہ ادھر وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگے اور اُدھر اعلان ہوا کہ پرواز اب ساڑھے تین بجے جائے گی۔ بہرحال جلیل قادری کی روحانی کرامت کی وجہ سے ہمیں پیٹ بھر کھانا کھانے کا موقع بھی مل گیا۔ کئی پروازوں کے ملتوی ہو جانے کی وجہ سے مڈوے ایرپورٹ پر کسی ہندوستانی ریلوے اسٹیشن کا گمان ہو رہا تھا۔ مسافر تھک ہار کے راہداریوں

میں تک بیٹھ گئے تھے۔ ہمیں بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں مل رہی تھی تو جلیل قادری نے پھر اپنی روحانی کرامت کے ذریعہ دو مسافروں کو کرسیوں سے اُٹھا دیا جن پر ہم فوراً بیٹھ گئے۔ بہر حال ان کی روحانی کرامت سے ہم نے خوب فائدہ اٹھایا۔ تاہم ان کے قریبی اور مخلص دوست ہونے کے ناطے ہم نے انہیں مخلصانہ مشورہ دیا ہے کہ وہ ہوائی جہازوں کی پروازوں کو روکنے کے معاملہ میں اپنی اس غیبی طاقت کا کسی اور سے ذکر نہ کریں۔ امریکی نظم ونسق کو پتہ چل گیا تو کہیں ان کی امریکی شہریت، جسے انہوں نے اپنی روحانی طاقت کے بل بوتے پر بڑی مشکل سے حاصل کیا ہے، خطرہ میں نہ پڑ جائے۔ غرض ان دنوں ہم ایسے ہی چاہنے والوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ واشنگٹن میں بھی ہمارے ایک ایسے ہی چاہنے والے موجود ہیں۔ اُمیش اگنی ہوتری۔ ہندی کے ادیب ہیں۔ وائس آف امریکہ سے بھی متعلق رہے ہیں۔ تھیٹر کے آدمی ہیں اور واشنگٹن میں ہندوستانیوں کی ایک تنظیم 'پرواسی کلا منچ' قائم کر رکھی ہے جس کی جانب سے یہاں ہندوستانی تہذیبی پروگرام منعقد کئے جاتے ہیں۔ ان کی اہلیہ پشپا اگنی ہوتری بھی غزلیں گاتی ہیں اور ڈراموں میں کام کرتی ہیں۔ یہ ہمارے پرانے مدّاح ہیں۔ بہت عرصہ پہلے دہلی ٹیلی ویژن کے دفتر میں ہم اپنے دوست شرودت کے کمرہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صاحب پہنچے۔ معلوم ہوا کہ امریکہ سے آئے ہیں۔ کچھ دیر بعد شرودت سے کہنے لگے ''میں ہندی کے ایک مزاح نگار مجتبیٰ حسین سے ملنا چاہتا ہوں۔ سنا ہے کہ دہلی میں رہتے ہیں۔ برسوں سے میں 'دھرم یگ' 'ساریکا' اور 'ہنس' میں ان کے مضامین پڑھتا رہا ہوں۔ اگر ان سے ملاقات کی کوئی صورت نکل آئے تو کیا کہنے۔'' شرودت نے ہنس کر کہا ''میاں! یہ تمہارے سامنے تو بیٹھے ہیں۔'' اس جملہ کو سن کر اُمیش اگنی ہوتری جس طرح ہم سے بغلگیر ہوئے اس کی حرارت اب تک ہمارے ذہن میں تازہ ہے۔ کتنے ہی مضامین جنہیں ہم بھول چکے ہیں ان کا حوالہ دیا۔ ہندی میں ہماری جتنی بھی کتابیں چھپی ہیں وہ سب کی سب ان کے پاس محفوظ ہیں۔ کئی رسالوں کے تراشے بھی سنبھال کر رکھے ہیں۔ واشنگٹن آنے کے بعد علیگڑھ اولڈ بوائز اسوسی ایشن کے ڈاکٹر عبد اللہ نے بتایا کہ واشنگٹن کے ادب دوست حضرات اُمیش اگنی ہوتری کے توسط سے ہماری تحریروں سے بخوبی واقف ہیں کیونکہ جب بھی ہندی میں ہمارا کوئی مضمون چھپتا ہے تو وہ اسے ہمارے ہی حوالے سے ادبی محفلوں میں سنا دیتے ہیں۔ شکا گو آتے ہی ہم نے اُمیش اگنی ہوتری کو فون پر بتا دیا تھا کہ ہم واشنگٹن آ رہے ہیں۔ امریکہ کے جس

شہر میں بھی ہم گئے وہاں وہ فون کر کے ہماری خیریت پوچھتے رہے۔ انھوں نے ایک ہی دن کی نوٹس پر واشنگٹن میں 'پرواسی کلامنچ' کی جانب سے انڈین جمخانہ کلب میں ہمارے لئے ایک محفل آراستہ کی۔ ہندی کے کئی ادیبوں، شاعروں، دانشوروں کے علاوہ اردو کے ادب دوستوں کو بھی بُلایا۔ معلوم ہوا کہ 'پرواسی کلامنچ' کی جانب سے ہندوستان کے کئی ڈرامے اسٹیج کئے جا چکے ہیں۔ اگلے مہینہ حضرت آوارہ کا ڈرامہ 'بیویوں کا مدرسہ' بھی پیش کیا جانے والا ہے۔ اُمیش اگنی ہوتری واشنگٹن ٹیلی ویژن سے ہر ہفتے ہندوستانی تارکان وطن کے مسائل کو لے کر بڑے خوبصورت پروگرام پیش کرتے ہیں۔ بڑے مزیدار، گدگدانے والے اور پھلجھڑیاں بکھیرنے والے پروگرام ہوتے ہیں۔ ان کی محفل میں واشنگٹن کے کئی ہندی اہل قلم حضرات سے ملاقات ہوگئی۔

ہمارے ایک ایسے ہی چاہنے والے ڈاکٹر ریاض الدین ہیں جو ویسٹ ورجینیا کے شہر بلوفیلڈ میں رہتے ہیں۔ جس دن سے ہم امریکہ آئے ہیں ان کا اصرار تھا کہ ہم بلوفیلڈ ضرور آئیں۔ اُردو سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ ایک دن کہنے لگے" میں نے آرٹس کے مضامین کے ساتھ اُردو میں طب کی تعلیم حاصل کی ہے۔" حیدرآباد میں مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس کے انعقاد کے وقت وہ عثمانیہ میڈیکل کالج کے طالب علم تھے۔ ہمارے بھائی ڈاکٹر اصغر حسین کے ہم جماعت بھی رہ چکے ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے ہمیں اسی کانفرنس میں سنا تھا۔ ان کے پاس اُردو کی بے شمار کتابیں ہیں۔ ان کی اہلیہ بھی ادب کا بے حد اچھا ذوق رکھتی ہیں۔ غرض ہم ڈاکٹر اصغر حسین کے ساتھ ہی چھ گھنٹوں کی مسافت طے کر کے بلوفیلڈ پہنچے۔ ویسٹ ورجینیا کی خوبصورت وادیوں نے ہمیں مسحور سا کر دیا۔ اگر ہم یہاں نہ جاتے تو قدرت کے اس دلفریب حسن کو دیکھنے سے محروم رہ جاتے۔ بلوفیلڈ ویسٹ ورجینیا کا ایک چھوٹا سا شہر ہے جو خوبصورت پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ ڈاکٹر ریاض الدین ایک محل نما مکان میں رہتے ہیں۔ رات انھوں نے ایک پر تکلف عشائیہ ترتیب دیا اور اپنے ڈاکٹر دوستوں کو بلایا۔ ان ہی میں ایک ڈاکٹر رضا بھی ملے جو حیدرآبادی ہیں اور پیٹ کے امراض کے ماہر ہیں۔ ہم نے شکل سے اندازہ لگایا تو احساس ہوا کہ یہ تو احمد رضا قادری مرحوم کے فرزند ہیں۔ بے حد عقیدت سے ملے۔ احمد رضا قادری، عابد علی خان اور محبوب حسین جگر کے ہم جماعت تھے اور کچھ عرصہ روزنامہ "سیاست" میں بھی کام کیا تھا۔ وہ ہمارے کرم فرما تھے اور ہمیں بے حد عزیز رکھتے تھے۔ اور ینٹ ہوٹل میں ان کے ساتھ

گزاری ہوئی محفلیں اوران کی دلچسپ باتیں اس رات بہت یاد آئیں۔ دنیا بھی عجیب جگہ ہے۔ چاہنے والوں کو کہاں کہاں بکھیر دیتی ہے۔ اردو کے ادیب کی حیثیت سے جب ہم کچھ لکھتے ہیں تو یہ سوچ کر لکھتے ہیں کہ پتہ نہیں ہماری تحریروں کو کوئی پڑھتا بھی ہے یا نہیں لیکن امریکہ آنے کے بعد احساس ہوا کہ لوگ تو ہمیں بڑے جتن کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ہمارے کالموں کے تراشے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ انٹرنیٹ پران کی کاپیاں نکالی جاتی ہیں۔ پچھلے ہفتے ''سیاست'' میں ہمارا کالم انٹرنیٹ پر دیر سے آیا تو نیویارک، لاس اینجلس کے علاوہ شکاگو کے کئی دوستوں کے فون آئے۔ بہرحال ان دنوں ہم اپنے چاہنے والوں میں گھرے ہوئے ہیں۔

(''سیاست''۲/جولائی ۲۰۰۰ء)

گڈ مارننگ کو گڈ بائی

صاحبو! امریکہ میں لگ بھگ ڈھائی مہینوں کے قیام کے بعد اب بالآخر وہ مرحلہ آ ہی گیا جب ہمیں بادلِ ناخواستہ ہی سہی 'گڈ مارننگ' کو 'گڈ بائی' کہنا پڑ رہا ہے۔ اس سارے عرصہ میں ایک دن بھی ایسا نہیں گذرا جب ہماری صبح کی چہل قدمی کا ناغہ ہوا ہو اور انجان امریکیوں اور ہمارے درمیان 'گڈ مارننگوں' کا تبادلہ عمل میں نہ آیا ہو۔ ہماری چہل قدمی کا ناغہ تو وطن عزیز میں بھی نہیں ہوتا لیکن وطن والی چہل قدمی میں وہ بات کہاں جو امریکہ والی چہل قدمی میں پائی جاتی ہے۔ چاروں طرف پھیلا ہوا سبزہ، ترشی ترشائی ہریالی سے لبالب بھرے ہوئے وسیع وکشادہ میدان، انواع واقسام کے پیڑ پودے جن کے نام ہی جاننے کے لئے بیٹھ جائیں تو حیات مستعار کے بچے کھچے دن یونہی بیت جائیں۔ ان پودوں پر پھول بھی عجب انداز کے کھلتے ہیں۔ بے حد خوشنما، دلنشین، دلفریب، آنکھوں کو نور اور دل کو سرور عطا کرنے والے۔ ہمارے بیشتر پھولوں میں ایک ہی رنگ ہوتا ہے۔ یہاں کے ایک ایک پھول میں کئی کئی رنگ ہوتے ہیں۔ ہم تو چہل قدمی کے دوران ازراہ تشکیک ان پھولوں کو چھو کر بھی دیکھ لیتے تھے کہ کہیں پلاسٹک کے نہ بنے ہوئے ہوں۔ وہ ہمیشہ اصلی پھول ہی نکلے۔ جگہ جگہ جھیلیں بہہ رہی ہیں اور تالابوں کی سطح آب ہے کہ چھپھمار ہی ہے۔ بطخیں تیر رہی ہیں۔ پھر اس سارے ماحول میں انواع واقسام کے پرندے ہیں کہ چہچہائے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی آوازیں بھی ہمیں نامانوس سی لگتی ہیں۔ غالباً انگریزی میں چہچہاتے ہیں اور وہ بھی امریکی لہجہ والی انگریزی میں۔ یہاں کی میناؤں کو بھی دیکھا کہ عجب انداز

سے نغمہ سرا ہوتی ہیں۔ پھر روح کو طراوت بخشنے والے اس دلنشین ماحول میں چہل قدمی کرتے وقت جب کوئی امریکی مرد یا خاتون چلتے چلتے اپنی دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ 'گڈ مارننگ' سے ہمیں نواز دیتی تھی تو لگتا تھا کہ ہم بھی اسی ماحول کا حصہ ہیں اور یہ کہ اس ہرے بھرے ماحول میں رہنے کا ہمیں بھی گرین کارڈ مل چکا ہے۔ امریکہ میں ہم چہل قدمی کم کرتے تھے اور 'گڈ مارننگوں' کو زیادہ سمیٹتے پھرتے تھے۔ اب یہاں سے کوچ کرنے کا وقت آرہا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ ہماری یادوں کی جھولی میں ہزاروں 'گڈ مارننگیں' جمع ہوگئی ہیں۔ نہ جانے وہ کون لوگ تھے، کیا کرتے تھے، ان کے حالات کیا تھے، ہمیں کیا معلوم۔ نہ وہ 'گڈ مارننگ' سے آگے بڑھے اور نہ ہی ہم نے اپنی 'گڈ مارننگ' کو کبھی اُن کی 'گڈ ایوننگ' اور 'گڈ نائیٹ' تک لیجانے کی ضرورت محسوس کی۔ صبح کی چہل قدمی کے وقت انسانیت کی اتنی سی بھی ملاوٹ ہو جائے تو یہی کیا کم ہے۔ اب ہمیں جلد ہی وطن عزیز کی غیر انسانی چہل قدمی کی طرف پھر سے واپس جانا ہے جہاں کوئی اجنبی آپ کو سلام کرنے کو ضروری نہیں سمجھتا اور اگر اتفاق سے کوئی شناسا دور سے چہل قدمی کرتا ہوا آتا دکھائی دیتا ہے تو وہ اور آپ دونوں ہی کچھ اس طرح کا راستہ اختیار کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کا آمنا سامنا نہ ہونے پائے۔ گویا ہم چہل قدمی نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے سے منہ چھپانے کا کھیل کھیلتے ہیں۔ پھر ایسی سرسبز، ہری بھری اور مسطح روشیں ہمارے ہاں کہاں، ہمارے ہاں پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ چہل قدمی کے دوران ہمیں کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے اور ہم کسی گہرے کھڈ میں نہ گر جائیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس اہتمام کی وجہ سے چہل قدمی کرنے والے کی جسمانی ورزش زیادہ ہو جاتی ہے۔ ہم تو خیر صرف چہل قدمی کے ارادہ سے گھر سے نکلتے ہیں لیکن ہمارے ہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے کی خاطر چہل قدمی کی عادت اختیار کر لیتے ہیں، لہذا ہمیں اپنی چہل قدمی کے دوران اس احتیاط کو بھی ملحوظ رکھنا پڑتا ہے کہ ہماری چہل قدمی سے مذکورہ بالا افراد کی چہل قدمی مجروح اور خود ہماری چہل قدمی مکروہ نہ ہونے پائے۔ آپ سمجھیں گے ہم بھی عجیب آدمی ہیں۔ ڈھائی مہینے امریکہ میں کیا گذار لئے اپنا دماغ خراب کر لیا۔ آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔ ہمیں ایسا نہیں سوچنا چاہئے۔ ایک سچے محب وطن کی طرح ہمیں اپنے وطن کی ہر چیز سے پیار ہے۔ اس کے گرد و غبار سے، اس کی فضائی آلودگی سے، کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں سے، جھگی جھونپڑیوں سے، بھیک مانگتے ہوئے مفلوک الحال انسانوں سے، برتی کے ان

قمقموں سے جن میں اکثر بجلی غائب رہتی ہے، ان مین ہولوں سے جن کے ڈھکن ہمیشہ غائب رہتے ہیں، ان نلوں سے جن میں پانی کم آتا ہے اور بھاپ زیادہ نکلتی ہے۔ اپنی حب الوطنی کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے ہم ایسی اشیا کی فہرست کو کیوں طول دیں جن سے ہمیں پیار ہے۔ ڈھائی مہینوں سے اپنا تھوک اپنے ہی منہ میں لئے گھوم رہے ہیں۔ سڑکوں پر تھوکنے کی جو آزادی ہمارے ہاں حاصل ہے وہ یہاں کہاں۔ جابجا کوڑا کرکٹ پھینکنے کا رواج بھی یہاں نہیں ہے، صاف ستھری ہوا کو پھیپھڑوں میں لگا تار پہنچانے کی وجہ سے بھی عجیب سی بے چینی محسوس ہونے لگی ہے بلکہ دم گھٹنے لگا ہے۔ ملاوٹی چیزیں استعمال کرنے کی عادت اتنی پُرانی ہے کہ ادھر جو خالص چیزیں استعمال کرنے لگے ہیں تو اس سے پیٹ بھی خراب رہنے لگا ہے۔ اس عرصہ میں ہمیں جو بھی موضوع آسانی سے ہاتھ آ گیا اس کے بارے میں جیسے تیسے لکھ کر بھیجتے رہے۔ کتنے ہی موضوعات ہیں جن کے بارے میں ہمیں ذرا اطمینان اور فراغت کے ساتھ لکھنا ہے۔ اب تو وطن واپس جا کر ہی لکھیں گے مگر وطن میں فراغت کہاں۔ سولہ برس پہلے ہم یہاں آئے تھے تو اس وقت اسلام یہاں اتنا دکھائی نہیں دیتا تھا اب ہر جگہ دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر عابد اللہ غازی نے 'اقرا فاونڈیشن' کے زیر اہتمام یہاں جو تاریخ ساز کام شروع کیا ہے وہ بھی تفصیل کا طلب گار ہے۔ ہمیں ان کے شاندار دفتر میں بھی جانے کا موقع ملا۔ لاس اینجلس، ہالی وڈ، نیویارک اور خود شکاگو کی سیر کا حال بھی ہم نے اب تک نہیں لکھا۔ کتنی ہی محبوب ہستیوں کے ذکر کو ہم نے اب تک روک رکھا ہے۔ ہمدم دیرینہ حسن چشتی کی محبتوں اور رفاقتوں کا خیال آتا ہے تو اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا احساس کچھ اور بھی سوا ہو جاتا ہے۔ شکاگو کے علاقہ ڈیون (Devon) کا حال بھی ہم نے اب تک نہیں لکھا۔ حیدرآبادی اسے 'دیوان' کہتے ہیں۔ یہاں جتنے خالص حیدرآبادی ہمیں ملے اتنے تو کبھی حیدرآباد میں بھی نہیں ملے۔ یہاں جا کر اکثر ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اگر اتنے سارے حیدرآبادی یہاں آباد ہیں تو پھر وہ کون لوگ ہیں جو ان دنوں حیدرآباد میں رہتے ہیں۔ کتنے ہی دوستوں سے پینتیس چالیس برس بعد ملاقات ہوئی۔ اُردو کی منفرد اور ممتاز افسانہ نگار رضیہ فصیح احمد سے بھی شکاگو میں ہماری ملاقات ہوئی۔ بہت شفقت سے پیش آئیں۔ ان سب کی یادوں کو اب وطن واپس ہو کر ہی سمیٹیں گے۔

امریکہ آ کر ہم نے پہلا کالم چہل قدمی کے حوالہ سے ہی لکھا تھا اور یہاں سے جاتے

ہوئے آخری کالم بھی چہل قدمی کے حوالہ سے ہی لکھ رہے ہیں۔اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہو کہ امریکہ میں ہمارے کئی طبی معائنے ہوئے اور اب ڈاکٹر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہماری چہل قدمی اب ختم ہوا چاہتی ہے۔ہمارے گھٹنوں کی ہڈیاں اب اتنی از کار رفتہ اور خستہ حال ہو چکی ہیں کہ مزید چہل قدمی کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتیں۔امریکی ڈاکٹروں، ہمارے بھائیوں اور بہی خواہوں کا اصرار ہے کہ ہم اپنے گھٹنے جلد از جلد تبدیل کروالیں۔امریکہ میں گھٹنوں کی تبدیلی کا آپریشن ایک عام سی بات ہے مگر اس کے بعد از سر نو چہل قدمی کرنے میں دو تین مہینے لگ جاتے ہیں۔لیکن ہمارا اب اتنے دنوں تک یہاں رُکنا ممکن نہیں رہا۔لہٰذا ایک امکان بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ کچھ عرصہ بعد ہم پھر امریکہ آئیں۔لیکن ایک خیال یہ بھی آتا ہے کہ اپنے پرانے گھٹنوں کی مدد سے اتنی ساری دنیا تو دیکھ چکے ہیں۔اب نئے گھٹنے لگا کر کتنی دنیا دیکھ لیں گے۔ ہمارا چال وچلن تو پہلے ہی سے خراب تھا۔اب صرف چال کو ٹھیک کر کے کیا کریں گے۔زندگی کے سفر میں ہم سفر ہی ساتھ نہیں چھوڑتے بلکہ اپنے ہی جسم کے اعضا بھی ساتھ دینا چھوڑ دیتے ہیں۔ بھلے ہی آدمی نہ چل پائے قدرت کا کارخانہ اسی طرح تو چلتا ہے۔بلکہ قدرت کا کارخانہ چلتا ہی اس لئے ہے کہ ایک منزل پر آدمی چلتے چلتے رُک جاتا ہے۔

(''سیاست''۔ ۹؍جولائی ۲۰۰۰ء)

ہم نے امریکہ میں گلبرگہ کو دریافت کیا

جس دن ہم دہلی سے امریکہ روانہ ہو رہے تھے عین اُسی دن گلبرگہ کے ہمارے چند احباب نے ہمارے دورۂ امریکہ کے لئے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے ایک بیان اخبار میں چھپوایا تھا اور ساتھ میں ہمارے دورۂ امریکہ کی کامیابی کے لئے اپنی تمناؤں کا اظہار کچھ اس طرح کیا تھا جیسے ہمارا دورہ ایک ادیب کا دورہ نہ ہو بلکہ کسی سیاستدان کا ہو۔ سیاستدانوں کے بیشتر دورے یقیناً ناکام ہو جاتے ہیں لیکن ادیبوں کے دورے ناکام نہیں ہوتے۔ پھر بھی گلبرگہ کے احباب کے اس ردعمل پر ہماری رائے یہ تھی کہ انھیں اس طرح کا بیان دینے کی کیا ضرورت تھی۔ مانا کہ آج سے 65 برس پہلے ہم گلبرگہ میں پیدا ہوئے تھے اور اس میں ہماری مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اگر یہ بات ہمارے اختیار میں ہوتی تو بھلا ہم گلبرگہ میں کیوں پیدا ہوتے شکاگو میں جا کر نہ پیدا ہو جاتے۔ سچ تو یہ ہے کہ شہروں کو ہم تاش کے پتوں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ جب بھی جس شہر کی ضرورت لاحق ہو اس کا پتہ پھینکتے ہیں۔ مہاراشٹر سے تعلق رکھنے والا کوئی مل جائے تو ہم اس وقت عثمان آباد کا پتہ پھینکتے ہیں، جو ہمارا آبائی وطن رہ چکا ہے۔ کسی حیدرآبادی سے واسطہ پڑ جائے تو ہم اُس حیدرآباد کا پتہ پھینکتے ہیں جہاں ہم نے اپنی زندگی کے بیس بہترین سال گذارے ہیں۔ اب تو ماشاء اللہ ہم بوقت ضرورت دہلی اور ٹوکیو کے پتے بھی پھینکنے لگے ہیں۔ اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود ایک بار ہم نے یونہی مذاق مذاق میں اپنی اس دلی تمنا کا اظہار کیا کہ ہم بالآخر حیدرآباد کی مٹی کا حصہ بننا چاہتے ہیں تو حیدرآبادیوں نے شور مچا دیا کہ میاں یہ کیا کرتے ہو، اس کام کے لئے کسی اور شہر کی طرف جاؤ۔ ہماری مٹی کیوں پلید کرتے ہو۔ بہرحال

اس ذہنی پسِ منظر کے ساتھ ہم امریکہ پہنچے تو دوسرے ہی دن 'دی عثمانین' کے صدر خلیل الزماں نے ہمیں فون کیا کہ "جناب آپ کے تین مدّاح ایم۔ کے۔ معین، حامد علی اور حامد بخاری آپ سے ملنے کے لئے بے چین ہیں اور میں انھیں لے کر خود آپ کے پاس آ رہا ہوں۔" ان میں سے ایک حامد علی تھے جو شکاگو کے بے مثال فوٹو گرافر اور لا جواب انسان ہیں۔ یہ ایسے فرد نہیں جن کا ذکر یوں سرسری انداز میں کر دیا جائے۔ ان کا حال ہم الگ سے لکھیں گے۔ دوسرے حامد بخاری تھے جو ہمارے کرم فرما ولی اللہ بخاری مرحوم، سابق جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ ملاپ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ان سے ہماری پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔ البتہ تیسرے جو صاحب تھے وہ عجز و انکسار اور شرافت کا پیکر بنے ایک کونہ میں چپ چاپ کھڑے تھے۔ ان سے ملنے کی باری آئی تو بے ساختہ ہمارے ہاتھ کو چومتے ہوئے بولے "آپ سے ملنے اور آپ کو دیکھنے کی عرصہ سے تمنا تھی۔ آج یہ تمنا پوری ہو رہی ہے۔" ہم نے پوچھا "شکاگو میں آپ کی مصروفیات کیا ہیں؟"۔ بولے "مصروفیت تو بس یونہی سی ہے مگر میری اصل پہچان یہ ہے کہ میرا تعلق بھی گلبرگہ سے ہے۔" ہم نے کہا "گلبرگہ سے اپنے تعلق کا اظہار آپ کچھ اس طرح کر رہے ہیں جیسے گلبرگہ کوئی بڑی کوالیفکیشن ہو"۔ بوکھلاہٹ میں فوراً بول پڑے "حضور! گلبرگہ تو آپ کی بھی کوالیفکیشن ہے"۔ ہم نے دل ہی دل میں سوچا کہ گلبرگہ بھی عجیب شہر ہے شکاگو میں بھی ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔ ایم۔ کے۔ معین برسوں پہلے گلبرگہ کے مومن پورہ میں رہا کرتے تھے۔ پھر سعودی عرب سے ہوتے ہوئے شکاگو آ گئے۔ کڑی محنت کے بعد آج وہ شکاگو کے ایک خوبصورت علاقہ میں واقع فرسٹ چوائس مارٹیگج کارپوریشن کے پریسیڈنٹ ہیں۔ ایک دن ہمیں اپنے عالیشان دفتر بھی لے گئے جو بہت بڑا ہے لیکن پھر بھی گلبرگہ سے چھوٹا ہے۔ ان ہی کے دفتر میں اتفاق سے ہماری ملاقات عطیہ سلطانہ سے ہوئی جو کسی کام کے سلسلہ میں ان سے ملنے آئی تھیں۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ یہ تو رفیعہ آپا (ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ) اور ہمارے دوست سکندر توفیق کی بہن ہیں۔ بڑی محبت اور حیرت کے ساتھ ملیں اور بولیں "دنیا بھی کتنی چھوٹی جگہ ہے۔" ہم نے دل ہی دل میں سوچا دنیا بھلے ہی چھوٹی ہو جائے لیکن گلبرگہ تو پھر بھی بڑا ہے۔ غرض شکاگو میں قیام کے دوران معین صاحب نے ہمارے تئیں جس محبت اور عقیدت کا مظاہرہ کیا وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ بعد میں وہ اپنے دو بھائیوں کو بھی ہم سے ملانے کے لئے لے آئے۔

شکاگو جانے سے پہلے ہم نے سوچا تھا کہ امریکہ میں ہماری ملاقات ایک ہی گلبر گوی سے ہوگی اور وہ ہیں حضرت نیاز گلبر گوی۔ لیکن یہاں تو نہ جانے کہاں سے اتنے سارے گلبر گوی نکل آئے۔ حضرت نیاز گلبر گوی شکاگو کے ادبی اور سماجی حلقوں میں بڑی عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ شکاگو کے بابائے اردو کا درجہ رکھتے ہیں۔ مستند اور کہنہ مشق شاعر ہونے کے علاوہ بہترین نثر نگار بھی ہیں۔ اخباروں میں فرضی نام سے کالم بھی لکھتے ہیں۔ ان سے کئی ملاقاتیں رہیں۔ بڑی شفقت سے پیش آئے۔ ہمیں ان کے نواسے کی شادی میں بھی شرکت کا موقع ملا جہاں ان کے سارے افراد خاندان سے ملاقات ہوگئی۔ ماشاء اللہ کئی بیٹے، داماد، نواسے، پوتے اور پوتیاں ہیں اور سب کے سب نہایت کامیاب و کامران زندگی گزار رہے ہیں۔ غرض بہت بڑا خاندان ہے لیکن پھر بھی گلبر گہ سے چھوٹا ہے۔

شکاگو سے نکل کر ہم واشنگٹن گئے اور امریکہ کی پہلی ادبی محفل میں شرکت کی تو دیکھا کہ کرسیٔ صدارت پر ڈاکٹر ظہیر پرویز براجمان ہیں۔ ہم سے آہستہ سے پوچھا ”آپ نے مجھے پہچانا؟“ اب ہم انہیں کیسے بتاتے کہ پچھلے دنوں ایک صاحب نے ایک تصویر دکھا کر ہم سے پوچھا ”ذرا پہچانئے تو یہ کون حضرت ہیں؟“۔ ہم نے معذوری ظاہر کی تو بولے ”حضور! ذرا غور سے دیکھئے۔ یہ تو آپ ہی ہیں۔ یہ پچاس برس پرانی تصویر ہے جب آپ گلبر گہ میں پڑھا کرتے تھے۔“ ڈاکٹر ظہیر پرویز نے، جو واشنگٹن کی حیدرآباد دکن ایسوسی ایشن کے صدر بھی ہیں، ہمیں بتایا کہ وہ گلبر گہ کے کہنہ مشق شاعر حضرت منہاج الدین شوکت مرحوم کے فرزند ہیں۔ برسوں پہلے وہ ہمیں گلبر گہ کالج کے گلوکار اور اداکار کی حیثیت سے جانتے تھے۔ کہنے لگے ”جناب آپ نے گانا چھوڑ کر مزاح نگاری کب سے شروع کر دی؟“ ہم نے کہا ”کیا کریں۔ پیٹ بڑا بدکار ہے۔ آدمی سے طرح طرح کے کام کرواتا ہے۔“

تقریب کے دوسرے دن ایک صاحب کا فون آیا۔ کہنے لگے ”میرا نام سید حسین ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک میں امریکہ کے پاکستانی سفارت گھر میں فرسٹ سکریٹری تھا۔ اب ریٹائر ہو چکا ہوں اور امریکہ میں سکونت پذیر ہوں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ساٹھ برس پہلے جب میں پانچ چھ برس کا تھا تو ابراہیم جلیس کے ایک چھوٹے بھائی سے میری دوستی تھی۔ ہم دونوں محبوب گلشن میں کھیلا کرتے تھے۔ میرا گھر محبوب گلشن کے بالکل سامنے تھا۔ اور آپ لوگ پچھلی والی گلی میں رہتے

تھے۔کہیں یہ آپ تو نہیں ہیں؟''۔

ہم نے اپنے دو بھائیوں کے نام بتائے تو بولے'' جی نہیں! میرا خیال ہے کہ میں آپ ہی کا دوست تھا''۔ہم نے کہا'' کوئی اور پہچان بتایئے۔''بولے'' آپ اکثر کھیل میں ہار جانے کے باوجود اپنی ہار ماننے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔''ہم نے کہا'' بس بس۔اب مزید وضاحت نہ کیجئے۔یہ ہم ہی تھے اور ہیں''۔بعد میں سید حسین ،مشتاق احمد یوسفی کے جلسہ میں ہم سے ملے۔ہمارے دوست اکبر یوسف بھی اس جلسہ میں موجود تھے جو کسی زمانہ میں شاذ تمکنت کے ساتھ اکثر اور ینٹ ہوٹل میں آیا کرتے تھے۔ان کے ساتھ ایک باوقار خاتون بھی کھڑی تھیں جن کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔'' یہ میری نصف بہتر ہیں۔آپ کی تحریروں کی مداح ہیں۔آپ نے ان کے برادر محترم کو اپنے ایک کالم میں سرسید دکن قرار دیا تھا۔اس کالم کو انھوں نے بڑے جتن کے ساتھ رکھ چھوڑا ہے''۔

ہم نے کہا'' ویسے تو ان دنوں دکن میں کئی چھوٹے موٹے سرسید پیدا ہو گئے ہیں لیکن ہماری نظر میں اصلی سرسید دکن تو ہمارے گلبرگہ کے حضرت سید شاہ محمد محمد الحسینی ،سجادہ نشین درگاہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ہیں''۔بولے'' حضرت! یہ ان ہی کی ہمشیرہ تو ہیں۔''ہمیں یہ جاننے کے لئے کہ ہمارے دوست اکبر یوسف ہمارے کرم فرما سید شاہ محمد محمد الحسینی کے برادرِ نسبتی ہیں امریکہ جانا پڑا۔ہم نے بتایا کہ جس دن ہم دہلی سے چلے ہیں اسی دن حضرت قبلہ کا فون گلبرگہ سے ہمارے پاس آیا تھا اور ہم یہاں ان کی دعاؤں کے ساتھ آئے ہیں۔غرض امریکہ میں گلبرگہ سے ہر جگہ سابقہ پڑتا رہا۔نیو جرسی میں سلیمان خطیب کے سارے بیٹوں اور ان کے ارکان خاندان سے ملاقات ہوگئی۔شکا گو کی 'یاد خطیب' والی تقریب کا حال ہم بعد میں لکھیں گے۔البتہ لاس اینجلس میں ہم لالی چودھری کی موٹر میں کہیں جانے کے لئے سوار ہو رہے تھے کہ ایک صاحب نے موٹر کی کھڑکی میں اپنا ہاتھ داخل کر کے ہم سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا'' حضرت! میرا تعلق بھی گلبرگہ سے ہے۔''لیکن گاڑی اس اثنا میں چل پڑی اور ہم یہ پوچھتے پوچھتے رہ گئے کہ جناب اگر آپ کا تعلق گلبرگہ سے تھا تو آپ نے اسے توڑا کیوں اور اگر توڑا تھا تو اب اسے پھر سے جوڑنے کے جتن کیوں کر رہے ہیں۔

☆☆ ('' سیاست'' ۱۸ر جولائی ۲۰۰۰ء)

ذِکر حسن چشتی اور اُن کے شکاگو کا

صاحبو! شکاگو سے ہندوستان آئے ہوئے ہمیں دس دن بیت چکے ہیں۔ تبدیلی آب و ہوا کی وجہ سے یہاں آتے ہی ہم بیمار پڑ گئے بلکہ اب تک پڑے ہوئے ہیں۔ مگر اس عرصہ میں شکاگو اور شکاگو کے احباب بے پناہ اور ہر دم یاد آتے رہے۔ امریکہ کے سارے شہروں کے مقابلہ میں سماجی اور ثقافتی اعتبار سے شکاگو ہمیں بہت پسند ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہاں اردو بولنے

حسن چشتی ـــــ اور مجتبیٰ حسین

والوں کی جتنی بہتات ہے اس سے کہیں زیادہ بہتات حیدرآبادیوں کی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ میں قیام کے دوران میں ہمیں یہ شہر جتنا پسند آیا، اتنا ہی اس سے خوفزدہ اور خائف بھی رہے۔ جہاں اتنے سارے اردو بولنے والے اور اتنے سارے حیدرآبادی آباد ہوں وہاں ہم جیسے کم سواد کا اپنی عزت اور ناموس کو بچا کر صحیح و سالم واپس چلے آنا ایسا ہی ہے جیسے چراغ لے کر ہوا کے سامنے چلنا۔ ہمارے امریکہ پہنچنے سے پہلے ہی ہمدم دیرینہ حسن چشتی نے 'دی عثمانین' کے تعاون سے ہمارے جشن کے انعقاد کا اعلان کر دیا تھا جس کی رودادیں اخباروں میں چھپ چکی ہیں۔

پطرس بخاری نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ دوستی جب بہت پرانی ہو جاتی ہے تو دو دوستوں کے بیچ تبادلۂ خیال کی کوئی حاجت باقی نہیں رہ جاتی۔ حسن چشتی سے ہماری دوستی کی عمر بھی اب نصف صدی کا قصہ بنتی جا رہی ہے۔ ایسے دوستوں کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ جیسا چاہیں سلوک کریں۔ آپ جشن کی بات کرتے ہیں ہم تو ایسے دوستوں کے کہنے پر آتش نمرود میں بھی کود پڑنے کو تیار رہتے ہیں۔ بہرحال حسن چشتی اور ان کے رفقا نے ایک کامیاب محفل منعقد کی اور ہمارے بکھرے ہوئے سیکڑوں احباب کو جمع کیا۔ لیکن ہمیں یہ احساس ہر دم ستاتا رہا کہ حسن چشتی ہماری خاطر بلا وجہ ایک کھکیڑ میں پھنس گئے ہیں۔ ہم تو دوستوں کی محبتوں کو سمیٹنے کے لئے گئے تھے لیکن وہاں جاتے ہی ہمیں شکاگو کے حیدرآبادیوں اور اردو بولنے والوں کی آپسی رنجشوں کو سننے اور سمیٹنے کا کام انجام دینا پڑا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر کوئی اپنی محبت ہم پر نچھاور کرنے کو بیتاب تھا۔ ایک بار تو حد ہو گئی کہ بعض احباب ایک ایوارڈ لے کر ہمارے بھائی کے گھر پر آ گئے کہ صاحب آپ کی سہولت کے پیش نظر ہم کسی خاص تقریب میں ایوارڈ دینے کے بجائے آپ کو آپ کے گھر میں ہی ایوارڈ سے سرفراز کرنا چاہتے ہیں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ تھوڑی دیر کے لئے ہم نے بھی سوچا اور جائز طور پر سوچا کہ بہرحال جو ایوارڈ محفل میں دیا جاتا ہے اُسے آخر کار ڈھو کر گھر تو لانا ہی پڑتا ہے۔ کیوں نہ ایوارڈ کو قبول کر لیا جائے تاکہ گھر کی بات گھر میں ہی رہے۔ لیکن افسوس کہ اُس دن ہمارے بھائی کے گھر میں پہلے ہی سے کوئی خوشگوار تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ چنانچہ ہمارے بھائی نے برملا معذرت کی کہ وہ ایک خوشگوار تقریب میں ایک ناخوشگوار تقریب کی ملاوٹ کرنا نہیں چاہتے۔ یہ اُن کی مجبوری تھی۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بہرحال ہمارا ایک ایوارڈ شکاگو میں اب بھی رکھا ہوا ہے۔ کبھی جانا ہوا تو ساتھ لیتے آئیں گے۔ تاہم حسن چشتی کے

بارے میں ہم اتنا ہی عرض کرتے چلیں گے کہ پچھلی نصف صدی میں ہم نے جب بھی حسن چشتی کو دیکھا نہ صرف دوست احباب اور رشتہ داروں بلکہ اجنبیوں تک کے کاموں میں سرگرداں اور غلطاں پایا۔ قدرت نے خدمتِ خلق کا جو جذبہ انھیں ودیعت کیا ہے وہ بہت کم کو نصیب ہوتا ہے۔ ہم جیسے تو دوستوں کے سکھوں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں لیکن حسن چشتی اکیلے ایسے دوست ہیں جو دوستوں کے دُکھوں میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی شریک رہا کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوستوں کے دُکھوں میں تو کمی واقع ہو جاتی ہے لیکن خود حسن چشتی کے دُکھوں میں ضرور اضافہ ہو جاتا ہے۔

حسن چشتی ،مجتبیٰ حسین کو شال پیش کرتے ہوئے .ساتھ میں عابد اللہ غازی اور مجتبیٰ حسین کے بھائی یوسف حسین کو بھی دیکھا جاسکتا ھے

حسن چشتی ہمارے اُن دوستوں میں سے ہیں جو پچھلے بیس اکیس برسوں سے رہتے تو دیارِ غیر میں ہیں۔ لیکن کچھ اس ڈھنگ سے رہتے ہیں کہ کبھی ہمیں یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ ہم سے ہزاروں میل دور رہنے لگے ہیں۔ اس عرصہ میں شاید ہی کوئی مہینہ ایسا گزرا ہو جب ان کا کوئی خط نہ آیا ہو اور اگر خط نہ آیا ہو تو ان کا کوئی فون نہ آیا ہو اور اگر فون نہ آیا ہو تو ان کا کوئی دوست نہ آیا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں جب حیدرآباد میں رہتے تھے تو ان سے گہرے مراسم کے باوجود ہمارا

ربط ضبط اتنا نہیں تھا جتنا کہ ان کے باہر چلے جانے کے بعد رہنے لگا ہے۔ جینے کی یہ ادا، پُرانے دوستوں پر محبت نچھاور کرنے کا یہ سلیقہ، ہزاروں میل دور رہ کر بھی دوستوں کو اپنی رگِ جاں سے قریب رکھنے کا یہ اہتمام کتنا اچھا لگتا ہے۔ لیکن ہے ذرا مہنگا کام۔ ہمارے سینکڑوں قریبی دوست دنیا کے مختلف ملکوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں پتہ نہیں رہتا کہ اب کس ملک میں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ پانچ چھ برسوں میں کبھی خیریت کی اطلاع مل جاتی ہے تو خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ابھی تک بقید حیات ہیں (وہ بھی اور ہم بھی)۔ رشتے جب فاصلوں میں بٹ جاتے ہیں تو پہلے موہوم سے ہونے لگتے ہیں اور پھر وقت کے سمندر میں معدوم ہو جاتے ہیں۔ حسن چشتی ہمارے ان معدودے چند دوستوں میں سے ہیں جو برسوں پرانے رشتوں کو اسی طرح چمکا کر رکھنا جانتے ہیں جس طرح کوئی سلیقہ مند خاتون اپنے دیوان خانہ کے شوکیس میں سجی ہوئی نادر اشیاء کو ہر روز بڑے چاؤ سے جھاڑ پونچھ کر پھر وہیں رکھنا جانتی ہے۔ رشتہ کو ایک نادر اور نایاب شئے سمجھنے کا گُر حسن چشتی کو خوب آتا ہے۔ ڈیڑھ برس پہلے ہمیں حسبِ معمول حسن چشتی کے دو تین خط ملے تھے جن میں انھوں نے شکاگو میں 'سیاست فورم' کے قیام کی اطلاع دینے کے بعد ہم سے خواہش کی تھی کہ ہم اس فورم کے لئے اور اس فورم کے ذریعہ امریکہ میں اُردو کی ترویج و ترقی کے لئے ضروری مشورے دیں۔ حسن چشتی کو معلوم ہے کہ خط نہ لکھنا ہماری پرانی ہابی ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد اُنھوں نے شکاگو سے فون کر کے شکایت کی۔ "بھئی! تمہارے مشورے اب تک نہیں آئے۔ اردو کی ترقی رُکی ہوئی ہے۔" ہم نے کہا "برادرم اگر ہم نے غلطی سے آپ کو صحیح مشورہ دیدیا تو آپکا کیا ہوگا اور اگر ہمارے مشورے پر عمل کرنے سے اُردو کی سچ مچ ترقی ہو گئی تو ایسی صورت میں ہمارا کیا ہوگا، ہم تو دونوں صورتوں میں مارے جائیں گے۔ کیونکہ ہم نے تو اب اُردو کی زوال آمادگی کو منکوحہ کی طرح قبول کر لیا ہے۔ راضی بہ رضا رہنے لگے ہیں۔ جب سے ہم نے یہ پڑھا ہے کہ آپ امریکہ میں اُردو کی ترقی کے لئے کمر بستہ ہو گئے ہیں تب سے ہم تشویش میں مبتلا ہیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ آپ کی عملی دلچسپی سے کہیں سچ مچ اُردو کی ترقی نہ ہو جائے کیونکہ آپ جس کام کا بھی بیڑہ اٹھاتے ہیں اُسے پورا کر کے رہتے ہیں۔ کیا ہم آپ سے واقف نہیں ہیں۔ پھر آپ جیسے ایماندار، دیانتدار، مخلص اور بے لوث آدمی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اُردو کی ترقی کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے۔ یہ کام تو ہم جیسوں کے لئے چھوڑ دیجئے جو اُردو کی ترقی کا کام کچھ

اس ڈھنگ سے انجام دیتے ہیں کہ بالآخر ہماری اپنی شخصی ترقی کی راہیں خود بخود ہموار ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کے ادیب، شاعر اور پروفیسر تو بدستور ترقی کرتے جارہے ہیں اور بیچاری اُردو جہاں کی تہاں ہے۔"

ہنس کر بولے "ہنسی مذاق کی تمہاری عادت کبھی نہیں جائے گی۔ یار کبھی تو سنجیدہ ہو جاؤ۔ مجھے تمہارے مشورے جلد از جلد درکار ہیں۔" اس کے جواب میں ہم حسبِ عادت ہنس کر خاموش ہو گئے تھے۔

ہمیں یہ بھولی بسری بات اس لئے یاد آ گئی کہ ہم اپنے مشوروں کی حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم کیا اور ہمارے مشورے کیا۔ اب اگر ہم صدق دل سے حسن چشتی کو یہ مشورہ دیں کہ وہ امریکہ میں اُردو کے فروغ کی خاطر ہر گھر میں ہماری تصانیف رکھوادیں تو کیا وہ رکھوا دیں گے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ امریکہ سے نکلنے والے ہر اُردو اخبار کا ایک خصوصی نمبر ہمارے بارے میں شائع کرائیں تو کیا وہ شائع کرادیں گے۔ حالانکہ ایسے مشوروں سے ہمارا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ہماری پیاری اُردو زبان کی ترقی ہو اور یہ پھلے پھولے۔ لیکن کیا کریں ہم جانتے ہیں کہ حسن چشتی ایسے بے لوث اور مخلصانہ مشوروں پر کبھی عمل نہیں کریں گے کیونکہ ہمارے دوست ہونے کے باوجود ایک جہاندیدہ اور مردم شناس آدمی ہیں۔ ہم جیسوں کو خوب پہچانتے ہیں۔ کوئی بھی کام کرتے ہیں تو تن من دھن سے کرتے ہیں۔ بیس برس پہلے یہ سعودی عرب گئے تھے۔ وہاں جاتے ہی ایک 'بزم اُردو' قائم کی۔ ادبی محفلیں آراستہ کیں۔ مشاعرے کئے اور کیا کیا نہ کیا مگر ہمیں نہ بلایا۔ عرب کے صحرا کی فضاؤں میں جہاں اذانیں گونجا کرتی تھیں وہاں "مکرر ارشاد"، "توجہ چاہتا ہوں"، "عرض کیا ہے" "ذرہ نوازی کا شکریہ" جیسی صدائیں گونجنے لگیں۔ حیدرآباد میں رہنے والے غریبوں کا خیال آیا تو ان کے لئے سعودی عرب سے استطاعت رکھنے والے اصحاب کے استعمال شدہ کپڑوں کی گٹھریاں باندھ باندھ کر حیدرآباد بھیجنے لگے۔ سنا ہے کہ اُس زمانے میں اچھے بھلے لوگ بھی اس ڈر کے مارے اُن سے نہیں ملتے تھے کہ کہیں وہ ان کے کپڑے اتار کر غریبوں کے حوالہ نہ کردیں۔ حیدرآباد اور جدہ کے درمیان راست فضائی سرویس شروع کرانے میں بھی موصوف کا ہاتھ رہا ہے۔ بعد میں وہ امریکہ گئے تو وہاں بھی خدمت میں لگ گئے۔ نتیجہ میں وہاں بھی وہ اعزازات اور انعامات سے نوازے جانے لگے۔ انھیں ملنے والے دو ایک اعزازات کی

مبارکباد تو ہم نے انھیں ضرور دی مگر بعد میں جب دیکھا کہ یہ اعزازات ان کے لئے روزمرہ کا معمول بنتے چلے جارہے ہیں تو ہم نے اپنی مبارکبادیوں کا ہاتھ کھینچ لیا۔ بھلے ہی اعزازات کو وصول کرنے والا اُنھیں وصول کرتے ہوئے نہ تھکتا ہو لیکن مبارکباد دینے والا تو تھک جاتا ہے۔ پھر دونوں میں فرق بھی تو ہوتا ہے۔

مانا کہ ادھر دس گیارہ برسوں میں حسن چشتی سے ہماری کوئی شخصی ملاقات نہ ہوسکی تھی لیکن اس کی تلافی اس طرح ہو جاتی تھی کہ آئے دن اُن کی تصویریں اخباروں اور رسالوں میں چھپتی رہتی ہیں۔ مخفی مباد ہم حسن چشتی کو 'باتصویر حسن چشتی' کہتے ہیں۔ جب کتابیں باتصویر ہوسکتی ہیں، رسالے باتصویر ہوسکتے ہیں تو حسن چشتی باتصویر کیوں نہیں ہوسکتے۔ پھر وہ ایک ایسی وجیہہ وشکیل، جامہ زیب اور دیدہ زیب شخصیت ہیں کہ ان کی جتنی بھی تصویریں چھپیں وہ کم ہیں۔ ذرا بتایئے یہ سلمان خان، شاہ رخ خان، اکشے کمار وغیرہ کی اتنی ساری تصویریں آئے دن اخباروں میں آخر کیوں چھپتی رہتی ہیں۔ پھر حسن چشتی تو واقعی کام بھی کرتے ہیں صرف کام کرنے کی اداکاری نہیں کرتے۔ جو لوگ حسن چشتی کی تصویروں کی اشاعت پر ناک بھنوں چڑھاتے ہیں انھوں نے یا تو حسن چشتی کو نہیں دیکھا یا پھر خود آئینہ میں اپنی شکل نہیں دیکھی۔ وہ اُن شاعروں میں سے ہیں جن کا نہ صرف کلام قابل اشاعت ہوتا ہے بلکہ تصویر بھی قابل اشاعت ہوتی ہے۔ ماشاءاللہ رنگ بھی ایسا سرخ وسپید پایا ہے کہ جو بھی اُنھیں پہلی بار دیکھتا ہے اُنھیں انگریز ہی سمجھ بیٹھتا ہے۔ برسوں پرانی بات ہے، حیدرآباد میں ہمارے ایک دوست نے حسن چشتی کو پہلی بار دیکھ کر کہا تھا۔ ''یار! سارے شریف انگریز تو کب کے ہندوستان سے چلے گئے لیکن یہ انگریز اب تک یہاں کیا کر رہا ہے؟'' غالباً حسن چشتی نے ہمارے دوست کی بات سن لی تھی۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد سچ مچ ہندوستان کو چھوڑ کر چلے گئے۔

حسن چشتی کی خوبی یہ ہے کہ وہ بلا لحاظ مذہب وملت وجنس ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ ہمارے شاعر دوست افتخار نسیم، جو اصلاً پاکستانی ہیں، جب بھی شکاگو سے دہلی آتے ہیں اور ہم اُن سے اپنے حیدرآبادی احباب کے بارے میں پوچھتے ہیں تو حسن چشتی کے سوائے کسی اور حیدرآبادی دوست کا ذکر نہیں کرتے۔ ان کی یہ شان محبوبی قابل رشک ہے۔

شکاگو میں ہمارے قیام کے آخری دنوں میں ہمارے پرانے دوست مصلح الدین سعدی

بھی حیدرآباد سے وہاں آ گئے تھے۔ اُن سے چونکہ حیدرآباد میں ہماری ملاقات نہیں ہو پاتی اس لئے سوچا کہ کیوں نہ شکاگو میں ان سے مل لیا جائے۔ حسن چشتی کا ذکر آیا تو انھوں نے ایک بہت اچھی بات کی جو وہ اکثر کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حسن چشتی نے اپنی زندگی میں جو کارنامے انجام دئے ہیں ان کا صرف بیس فیصد احاطہ ہی ان کی شائع شدہ تصویروں میں ہو سکا ہے۔ ان کے اسّی فیصد کارنامے ایسے ہیں جن کا تحریری طور پر ذکر ہونا اب بھی باقی ہے۔ غرض حسن چشتی ہمارے اُن دوستوں میں سے ہیں جن کا خیال ذہن میں آتے ہی فاصلے کسی ویزا کے بغیر سمٹنے لگ جاتے ہیں اور وقت کسی گھڑی کی مدد کے بغیر پھیلنے لگ جاتا ہے۔

بہر حال شکاگو میں مختلف اوقات میں ہمیں کئی دنوں تک رہنے کا موقع ملا۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ شکاگو میں ہمارے لئے الگ سے کوئی اور محفل منعقد ہو۔ لیکن بھلا ہو عزیزی غوثیہ سلطانہ کا کہ انھوں نے بالآخر زندہ دلان شکاگو کے حوالے سے ایک تقریب کا اہتمام کر ہی ڈالا۔ انھوں نے کہا کہ شکاگو میں آپ کا جشن تو ہو چکا ہے۔ اب آپ کی روسٹنگ Roasting بھی ہونی چاہئے۔ روسٹنگ انگریزی اصطلاح ہے جس کے لغوی معنی بُھنائی اور کھنچائی وغیرہ کے ہوتے ہیں۔ خیر اس محفل میں ہماری روسٹنگ تو نہیں ہوئی البتہ حسب معمول Boosting ضرور ہوئی۔ ہم نے اور ہمارے دوست جلیل قادری نے تجویز رکھی تھی کہ زندہ دلان شکاگو کی اس محفل میں ہماری کھنچائی کے علاوہ سلیمان خطیب مرحوم کو بھی یاد کیا جائے۔ ضمیر جعفری مرحوم نے غوثیہ سلطانہ کے بارے میں کہا تھا کہ یہ اردو ادب کی چاند بی بی سلطانہ ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ چاند بی بی سلطانہ کو اگر آج کے حالات میں شکاگو میں کسی ادبی محفل کے انعقاد کے لئے کہا جاتا تو وہ یقیناً ناکام ہو جاتی۔ اس محفل کے انعقاد کا سہرا غوثیہ سلطانہ کے حسنِ انتظام کے علاوہ ہمارے دوست جلیل قادری کی انتھک دوڑ دھوپ اور شکاگو کی ممتاز سماجی شخصیت راشد علی خاں کی عملی دلچسپی کے سر جاتا ہے۔ برسوں پہلے ہمارے دوست محمود الحسن خاں صوفی کی معرفت راشد علی خاں سے حیدرآباد میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ راشد علی خاں نے زندہ دلانِ شکاگو کی خاطر ڈیون پر واقع اپنا وسیع اور شاندار آڈیٹوریم مفت میں دیدیا تھا۔ راشد علی خاں کا شمار شکاگو کی ذی حیثیت ہستیوں میں ہوتا ہے اور وہ ایسے کاموں کی آئے دن سرپرستی کرتے رہتے ہیں۔ ہم سے جب بھی ملے بڑی محبت اور گرمجوشی سے ملے۔ اس محفل میں نیاز گلبرگوی،

حسن چشتی، ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی ، مصلح الدین سعدی، پرویز ید اللہ مہدی، سید مصطفےٰ (ایڈوکیٹ)، شاہد اسحاقی، واجد ندیم، خورشید خضر، احسن قریشی اور کئی احباب نے اظہارِ خیال کیا۔

شکاگو کی ایک تقریب میں (بائیں سے) غوثیہ سلطانہ ،مجتبیٰ حسین
نیاز گلبرگوی اور حسن چشتی

ہمیں شخصی طور پر اس بات کی خوشی ہے کہ اس محفل میں سلیمان خطیب مرحوم کو یاد کیا گیا۔ خطیب مرحوم ہمیں بے حد عزیز رکھتے تھے اور ان کے بچوں نے بھی اس تعلقِ خاطر کو برقرار رکھا ہے۔ امریکہ پہنچتے ہی ان کے فرزند شاہین خطیب اور بیگم سلیمان خطیب سے ہماری بات ہوگئی تھی بلکہ تقریباً روز ہی بات ہوتی رہی۔ نیویارک جانے سے پہلے ہم بطور خاص فلے ڈلفیا سے نیوجرسی گئے جہاں سلیمان خطیب کے پانچوں بیٹوں سے ہماری ملاقات ہوگئی۔ وہ اتوار کا دن تھا۔ سلیمان خطیب کے بڑے فرزند شاہین خطیب کے گھر ان کے باقی چاروں بیٹے یامین خطیب، تمکین خطیب، متین خطیب، اور تحسین خطیب اپنے اہل وعیال کے ساتھ جمع تھے۔ ہم مذاق مذاق میں خطیب بھائی سے کہا کرتے تھے کہ انھوں نے چھٹا بیٹا محض اس ڈر سے پیدا نہیں کیا کہ کہیں اس کا نام 'نمکین خطیب' نہ رکھنا پڑ جائے۔ تاہم وہ مساوات کے قائل تھے۔ پانچ بیٹے پیدا کئے تو پانچ بیٹیاں بھی پیدا کیں۔ ان بچوں کی خوشحال زندگی کو دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی اس کا حال ہم کیسے بیان

کریں۔ خیال آیا کہ کاش سلیمان خطیب آج زندہ ہوتے اور اپنے بچوں کی خوشیوں کو دیکھ پاتے۔ ان کی اولاد میں ڈاکٹر شمیم ثریا اور تحسین خطیب کو ادب سے گہرا شغف رہا ہے۔ تحسین خطیب تو ایک زمانہ میں لکھا بھی کرتے تھے۔ اس بار بھی تحسین خطیب نے باتوں باتوں میں ایک دلچسپ بات کہی۔ کہنے لگے کرکٹ میں 'میچ فکسنگ' تو اب شروع ہوئی ہے لیکن ہمارے اردو ادب میں تو ہمارے نام نہاد نقادوں کے ہاتھوں اس طرح کی 'فکسنگ' پرانی بات ہے۔ جسے جی چاہا منصب عطا کر دیا اور کسی کو ان کے خلاف کچھ کہنے کی توفیق عطا نہیں ہوئی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ تحسین خطیب

اس موضوع پر کچھ لکھیں۔

سلیمان خطیب کے بچے جس طرح بیگم خطیب کی نگہبانی اور خدمت کرتے ہیں وہ نئی نسل کے لئے ایک قابل تقلید بات ہے۔

('' سیاست ''۲۳/ جولائی ۲۰۰۰ء)

☆☆

لالی چودھری کالاس اینجلس

لاس اینجلس کو ہم برسوں سے امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا کے اُس عظیم شہر کی حیثیت سے جانتے رہے ہیں جہاں ہالی وڈ کے شہرہ آفاق نگار خانے واقع ہیں اور جو فلم، آرٹ اور کلچر کا بین الاقوامی مرکز رہا ہے۔ جہاں کی فضاؤں میں گلیمر ہی گلیمر ہے۔ چمکتی دھوپ، سنگتروں،

لاس اینجلس کی محفل میں (بائیں سے) حسن چشتی ،لالی چودھری، نوشی گیلانی موسیقارِ اعظم نوشاد (مہمانِ خصوصی) ڈاکٹر سیّدسمیع اور مجتبیٰ حسین

انگوروں اور انواع واقسام کے پھلوں کی سرزمین اور بحرالکاہل کے کنارے واقع خوبصورت ساحلوں کے شہر کی حیثیت سے اس کی دھاک ہم پر پہلے ہی سے بیٹھی ہوئی ہے۔ مارلین منرو، انتھونی کوئین، فرینک سناترا، گریگوری پیک، ایلزبتھ ٹیلر، صوفیہ لارین، جینا لولو برجیدا اور نہ جانے کتنی ہی محبوب ہستیوں کا تصور اس شہر سے وابستہ ہے۔ ایک زمانہ میں اس شہر کا نام سنتے ہی ہمارے دل کی دھڑکن تیز ہو جایا کرتی تھی۔ ہالی وڈ کی فلموں کے کتنے ہی مناظر اور کتنے ہی کرداروں کے مکالمے ہمیں اب بھی زبانی یاد ہیں۔ اٹلانٹک کے کنارے واقع امریکہ کے تقریباً سارے ہی مشرقی شہروں میں ہم پہلے جا چکے ہیں لیکن امریکہ کے مغرب میں بحرالکاہل کے کنارے واقع اس عظیم الشان شہر میں جانے کا ہمیں کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ وہ تو بھلا ہو افسانہ نگار لالی چودھری، ڈاکٹر عبدالرحمٰن صدیقی مدیر 'اردو لنک'، حسن چشتی اور ڈاکٹر سید سمیع کا کہ ہمیں اس بار ان ہی احباب کی دعوت پر امریکہ جانے کا موقع ملا۔ ہمارے امریکہ پہنچنے سے پہلی لالی چودھری نے ہماری آمد کے سلسلہ میں اتنے فون کئے اور کچھ ایسے تعلق خاطر کے ساتھ کیے کہ اب سالم لاس اینجلس سراسر لالی چودھری کا شہر نظر آنے لگا ہے۔

ہم اور حسن چشتی چھ گھنٹے کی فلائیٹ میں جب شکاگو سے براہ کنساس لاس اینجلس روانہ ہوئے ہیں تو اس سفر کے اشتیاق کا حال ہم کیسے بیان کریں۔ دن کا سفر تھا تو ہم نے کھڑکی کے برابر والی نشست پر قبضہ جمالیا۔ دو ڈھائی گھنٹوں تک تو نیچے کے مناظر کی یکسانیت برقرار رہی۔ وہی تیرتے ہوئے بادل اور ہرے بھرے درختوں کے جُھنڈ اور ان کے بیچ خوبصورت شہروں کے آثار۔ مگر ڈھائی تین گھنٹوں کے بعد رفتہ رفتہ منظر تبدیل ہونے لگا تو یوں محسوس ہوا جیسے چاروں طرف صحرا ہی صحرا پھیلا ہوا ہے۔ پھر پہاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ ان پہاڑوں کے دامن میں ایک طرف تو صحرا کا گمان ہوتا تھا اور دوسری طرف ان پہاڑوں کی بیشتر چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ایسا خوبصورت منظر ہم نے کہیں نہیں دیکھا۔ لاس اینجلس کے ہوائی اڈہ پر لالی چودھری، عبدالرحمٰن صدیقی اور ان کے فرزند فیض الرحمٰن صدیقی ہمارے منتظر تھے۔ لالی نے پہلے ہی طے کر رکھا تھا کہ لاس اینجلس کے چھ روزہ قیام کے دوران میں کم از کم دو دن ہم اُن کے گھر میں رہیں گے۔ لاس اینجلس ہمیں امریکہ کے دیگر شہروں سے بالکل مختلف نظر آیا۔ کُھلا کُھلا، وسیع اور کشادہ۔ اس کے رہائشی علاقوں میں اونچی عمارتیں نہیں ہیں۔

لکڑی کے گھر تو یہاں بھی ہیں لیکن ان کی تعمیر میں اینٹوں کا استعمال بھی ہوتا ہے ۔ اصل لاس اینجلس تو ساڑھے چار سو مربع میل کے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے اور اگر اس کے مضافاتی علاقوں کو شامل کیا جائے تو یوروپ کے بعض ممالک سے بھی بڑا ہے ۔ اس کے موسم کا حال بھی عجیب و غریب ہے ۔ ستر۷۰ اسی۸۰ میل کے احاطہ کے اندر جہاں آپ کو ریگستان ملے گا وہیں برف پوش چوٹیاں بھی ملیں گی ۔ شدید گرمی کے علاقے بھی ملیں گے اور معتدل آب و ہوا والے علاقے بھی ۔ لاس اینجلس میں کبھی برفباری نہیں ہوتی ۔ گورے بھی یہاں کم آباد ہیں ۔ اسپین کے ابتدائی تارکان وطن کی نسلوں کے علاوہ چینی، جاپانی اور سیاہ فام لوگ یہاں مل جائیں گے ۔ شام کا سہانا وقت تھا ۔ چمکیلی دھوپ اُترنے لگی تھی ۔ آسمان صاف وشفاف اور روشن تھا ۔ ہم لالی چودھری کے گھر کے آنگن میں پہنچے تو یوں لگا جیسے ہم قدیم حیدرآباد کے کسی وسیع مکان کے آنگن میں پہنچ گئے ہیں ۔ امریکہ کے مشرقی شہروں کے بیشتر گھروں میں وسیع لان تو ہوتے ہیں لیکن انھیں دیکھ کر آنگن کا احساس نہیں ہوتا ۔ لاس اینجلس کے اکثر گھروں میں آنگن کے اطراف اونچی اونچی دیواریں ہوتی ہیں ۔ لالی کے گھر کے آنگن میں سنگتروں سے لدے ہوئے پیڑوں کے علاوہ آم کا ایک پیڑ بھی نظر آیا جسے وہ کبھی لاہور سے لے آئی تھیں ۔ امرود کا بھی ایک بڑا درخت موجود ہے ۔ ہم نے اس خوبصورت آنگن کو دیکھ کر کہا ہمیں تو یوں لگ رہا ہے جیسے ہم حیدرآباد کے کسی قدیم گھر کے آنگن میں پہنچ گئے ہیں ۔ عبدالرحمٰن صدیقی بولے مجھے تو یہ آنگن کراچی کی کسی کوٹھی کا نظر آتا ہے، لالی نے کہا مجھے تو اس آنگن میں پہنچ کر لاہور کی یاد آتی ہے ۔ حسن چشتی نے کہا میں نہیں بتاؤنگا کہ اس آنگن کو دیکھ کر کس شہر کی یاد آرہی ہے ۔ غرض لالی چودھری کے گھر کے آنگن کی وسعت اور خوبی یہ ہے کہ یہ دنیا کے ہر اچھے شہر کے کسی اچھے گھر کا آنگن نظر آتا ہے ۔ گویا لالی کی کشادہ دلی اور وسیع النظری ان کے گھر کے آنگن میں بھی نظر آتی ہے ۔ اس وسیع آنگن کے ایک گوشے میں اتنا بڑا سوئمنگ پول ہے کہ اس میں بیک وقت دس پندرہ افراد پیرا کی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں ۔ کچھ عرصہ پہلے احمد ندیم قاسمی لاس اینجلس آئے تھے تو وہ بھی لالی چودھری کے گھر میں مقیم رہے تھے ۔ ہم نے بیٹھنے کے لئے امرود کے پیڑ کے نیچے کرسی رکھی تو لالی نے کہا '' قاسمی صاحب کو بھی یہ جگہ بہت پسند تھی ۔ '' بعد میں حسن چشتی عبدالرحمٰن صدیقی اور ہم نے اپنی کرسیاں اٹھا کر کہیں اور رکھیں تو لالی نے کہا '' قاسمی صاحب اکثر

صبح اُٹھ کر یہیں بیٹھنا پسند کرتے تھے۔'' بعد میں دو چار جگہوں کے حوالہ سے پھر قاسمی صاحب کا ذکر آیا تو ہم نے چپکے سے حسن چشتی سے کہا '' ہمیں تو اس گھر میں یہ سوئمنگ پول ہی ایسی جگہ نظر آرہی ہے جس میں قاسمی صاحب نہ اُترے ہونگے۔'' ہماری بات پر حسن چشتی ہنسنے لگے تو لالی نے ہنسی کا سبب پوچھا۔ مگر لالی کو ہنسنے کا سبب جاننے کی فرصت ہی کہاں تھی کیونکہ انھوں نے رات میں کچھ احباب کو کھانے پر بُلا رکھا تھا۔ شام کو ڈاکٹر سید سمیع اور دیگر احباب آ گئے تو ہم لالی کے خوبصورت گھر کے ڈائننگ ہال میں چلے آئے۔ باورچی خانہ کے اوپر انگریزی میں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی '' مجھے پکوان سے نفرت ہے۔'' مگر جب اس عبارت کے پس منظر میں کھانا کھایا تو بے حد لذیذ کھانے کے ذائقہ نے ثابت کر دیا کہ پکوان سے نفرت کس کو کہتے ہیں۔ لالی چودھری ایسی ہی عبارتوں اور اعلانات کے ذریعہ لوگوں کو پریشان کر دیتی ہیں۔ چار پانچ سال پہلے انھوں نے اچانک اردو میں کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ بے حد خوبصورت، دلنشین اور کھری کھری۔ لیکن اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں اعلان کرتی ہیں کہ وہ کہانی لکھنا بالکل نہیں جانتیں۔ رات دیر گئے تک احباب کی محفل جمی لیکن اس دوران بھی لالی چودھری جلسہ کے انتظامات کے سلسلہ میں لگاتار مصروف رہیں۔

دوسری صبح ہم حسب عادت چہل قدمی سے واپس آئے تو لالی نے کہا '' آپ لوگ ناشتہ سے فارغ ہو جائیں۔ میں نے اپنے ایک دوست ارشاد احمد صدیقی کو کہہ رکھا ہے کہ وہ دس بجے تک آ جائیں تاکہ آپ لاس اینجلس کی سیر کر لیں۔'' ارشاد احمد صدیقی ناول نگار ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ شعر بھی کہتے ہیں۔ صبح کو ہم، حسن چشتی اور لالی چودھری، ارشاد احمد صدیقی کے ساتھ لاس اینجلس کی سیر کو نکلے۔ صدیقی صاحب کچھ عرصہ پہلے تک فلوریڈا میں رہا کرتے تھے۔ لہٰذا لاس اینجلس کے جغرافیہ سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ ہم لوگوں نے ان کی موٹر میں لاس اینجلس کی سیر تو بہت کی لیکن پتہ نہیں چلا کہ کس علاقہ سے گذر رہے ہیں۔ ہم ہالی وڈ کے مشہور بیورلی ہلز کے علاقہ کو دیکھنا چاہتے تھے لیکن ارشاد صاحب ذرا سے فاصلہ سے اصل راستہ بھٹک جاتے تھے۔ اگرچہ لالی چودھری بھی ایک عرصہ تک اس علاقہ میں رہ چکی ہیں لیکن انہوں نے حسب عادت اعلان کر دیا تھا کہ وہ بیورلی ہلز کے بہت سے راستوں سے واقف نہیں ہیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ دوسرے دن ڈاکٹر سید سمیع اور بیگم سمیع لاس اینجلس کی

سیر کرانے کے لئے آ گئے تو تب ہمیں ہالی وڈ کو تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا۔ تاہم لاس اینجلس کی اس غیر منصوبہ بند طویل سیر کا فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں لاس اینجلس کے بہت سے علاقوں کو دیکھنے کا موقع مل گیا۔ یوں بھی ان علاقوں کے نام جان کر ہم کیا کرتے۔ ہم تو لاس اینجلس کو لالی چودھری کے حوالہ سے جانتے ہیں۔

(''سیاست''، ۳۰؍جولائی ۲۰۰۰ء)

فیملی دھوبی سے فیملی مزاح نگار تک

ہمدمِ دیرینہ مزاح نگار پرویز یداللہ مہدی نے شکاگو کی ایک محفل میں ہمارے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس طرح فیملی ڈاکٹر، فیملی دھوبی اور فیملی حجام وغیرہ ہوتے ہیں اسی طرح مجتبیٰ حسین بھی حیدرآبادیوں کے فیملی مزاح نگار ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جب بھی کسی محفل میں ہماری شرکت کا اعلان ہوتا ہے تو حیدرآبادی ہمیں سننے کے لئے اپنے ارکانِ خاندان کے ساتھ جوق در جوق چلے آتے ہیں۔ ہم نے سوچا تھا کہ پرویز یداللہ مہدی بھی تو آخر کو ہماری ہی طرح کے مزاح نگار ہیں جو مزاح پیدا کرنے کی خاطر ضرورتاً ایسے فقرے تراش لیتے ہیں جن کا اصلیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ مگر بہت بعد میں احساس ہوا کہ پرویز یداللہ مہدی تو بڑے نکتہ رس، نکتہ سنج اور مردم شناس آدمی ہیں اور اپنے مزاح میں کام کی باتیں بھی کر جاتے ہیں۔ ان کی اس بات کا تجربہ ہمیں اُس وقت ہوا جب ہم شکاگو سے لاس اینجلس گئے اور اپنے حیدرآبادی دوست ڈاکٹر سید سمیع کے گھر مقیم ہوئے۔ ڈاکٹر سمیع امراضِ قلب کے ممتاز ماہر ہیں اور اپنے پیشہ میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ مانا کہ خود ڈاکٹر سید سمیع کو کئی گھرانوں کے فیملی ڈاکٹر بننے کا شرف حاصل رہا ہوگا لیکن وہ کبھی ہمارے فیملی ڈاکٹر نہیں رہے۔ البتہ ہم نے اپنے آپ کو ان کا فیملی مزاح نگار ضرور پایا۔ یادش بخیر کسی نے فیملی ڈاکٹر کی توضیح اس طرح کی تھی کہ فیملی ڈاکٹر وہ ہوتا ہے جو اپنے مریض کے خاندان کا ہی ایک فرد ہوتا ہے اور اس کی آمدنی اور جائیداد میں برابر کا حصہ دار بھی ہوتا ہے۔

عبدالرحمٰن صدیقی، مدیر 'اردو لنک' کے گھر ہم ایک رات گذار چکے تو دوسرے دن ڈاکٹر

سمیع اپنی اہلیہ شمیم سمیع کے ساتھ ہمیں اور حسن چشتی کو اپنے ہاں لیجانے کے لئے آ پہنچے۔ دونوں کو اس بات کا علم تھا کہ ایک دن پہلے ہم نے لاس اینجلس کی سیر تو بہت کی لیکن یہ پتہ نہ چلا سکے کہ کن علاقوں سے گذرے ہیں۔ کیونکہ جن صاحب کے ہمراہ ہم لاس اینجلس کو دیکھنے کے لئے نکلے تھے وہ خود لاس اینجلس میں نئے نئے آئے تھے۔ انھیں خود معلوم نہیں تھا کہ وہ بیورلی ہلز سے گذر رہے ہیں یا 'یونیورسل اسٹوڈیؤ' کے سامنے موجود ہیں۔ ڈزنی لینڈ کے قریب ہیں یا محمد علی کلے کے گھر کے پاس ہیں، گویا ہم ان کے ساتھ لاس اینجلس کی سیر کو نہیں نکلے تھے بلکہ وہ خود ہماری آڑ میں لاس اینجلس کی سیر کا ارادہ رکھتے تھے۔ بہر حال دوسرے دن ہم اور حسن چشتی ڈاکٹر سمیع اور ان کی بیگم شمیم سمیع کے ہمراہ لاس اینجلس کی سیر کو نکلے تو احساس ہوا کہ دونوں میاں بیوی کا شمار بھی مثالی جوڑوں میں کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح وِلس سگریٹ کے اشتہار میں Made for each other کے نعرے کے ساتھ ایک خوبرو اور خوش باش جوڑے کو دکھایا جاتا ہے بالکل اسی طرح کے دکھائی دیئے۔ بے حد مہذب، شائستہ، بااخلاق، جامہ زیب، پرخلوص اور محبت والے۔ دونوں میں ہم آہنگی اور مفاہمت کچھ ایسی ہے کہ لگتا ہے سید سمیع نے اپنی بیگم کی پسند کی اور مسز شمیم سمیع نے اپنے شوہر کی پسند کی شادی کی ہے۔ دونوں میں ایک قدر مشترک یہ بھی نظر آئی کہ دونوں نہایت سخن فہم، ادب شناس اور ادب دوست واقع ہوئے ہیں۔ گھر میں اردو کی بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ دو تین برس پہلے ڈاکٹر سمیع دہلی آئے تھے تو انھوں نے جامعہ ملیہ اور پرانی دہلی میں گھوم گھوم کر ہمارے ساتھ اردو کی کئی کتابیں خریدی تھیں۔ اہلِ علم کو اکثر مشورہ دیا جاتا ہے کہ علم کی تلاش میں اگر چین کو بھی جانا پڑ جائے تو ضرور چلے جانا۔ اس دن ہم نے ڈاکٹر سمیع سے کہا تھا کہ حضرت آپ تو علم کی تلاش میں چین تو کجا پرانی دہلی جیسے دشوار گذار اور کٹھن مقام تک بھی جانے سے نہیں چوکتے۔ اس کے جواب میں وہ مسکرا کر خاموش ہوگئے تھے۔ لیکن جب لاس اینجلس میں ان کی اہلیہ سے ملاقات ہوئی تو ہمیں شبہ سا ہوا کہ اُس دن علم کی تلاش میں وہ پرانی دہلی تک اپنے ذوقِ علم سے کہیں زیادہ اپنی بیگم کے حکم کی تعمیل میں تو نہیں گئے تھے کیونکہ جو کتابیں وہ ہندوستان سے لے گئے تھے وہ سب کی سب بیگم شمیم سمیع کی نظر سے نہ صرف گذر چکی تھیں بلکہ وہ ان کی پسندیدہ کتابیں بھی نکلیں۔ اب ہم یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ ڈاکٹر سمیع کو بھی وہی کتابیں پسند ہیں جو بیگم سمیع کو پسند ہیں یا بیگم سمیع وہی کتابیں پسند کرتی ہیں جو ڈاکٹر سمیع کو پسند ہیں، بہر حال یہ ایک نجی

معاملہ ہے جس کے بارے میں ہم کوئی رائے دینا نہیں چاہتے۔تاہم ادبی ذوق کے معاملہ میں اس طرح کی 'پتی ورتا' یا 'پتنی ورتا' کی مثالیں ذرا کم ہی ملتی ہیں۔ایک فرمانبردار شوہر اتنا فرمانبردار بھی ہوسکتا ہے یا ایک اطاعت گذار بیوی اتنی بھی اطاعت گذار ہوسکتی ہے یہ ہم نے نہ سوچا تھا۔دونوں میاں بیوی کو علم وادب اور سخن فہمی سے گہرا شغف ہے اور از راہِ کرم دونوں ہی ہمارے مدّاح ہیں۔ڈاکٹر سید سمیع کے گھر ٹھہر کر ہی ہمیں پرویز یداللہ مہدی کے اس بلیغ تبصرہ پر ایمان لانا پڑا کہ ہم حیدرآبادیوں کے فیملی مزاح نگار ہیں۔ہم نے جتنا لاس اینجلس بھی دیکھا وہ اسی خوش مذاق اور باذوق جوڑے کی صحبت میں دیکھا۔لاس اینجلس کے شہرہ آفاق لگونا ساحل کی سیر بھی اسی جوڑے نے کرائی۔ہم نے بیس برس پہلے یوکوہاما کے ساحل پر بحرالکاہل کے مشرقی کنارے کو دیکھا تھا اور اتنے برس بعد لگونا کے ساحل پر اس کے مغربی کنارے کو دیکھ رہے تھے۔بے شمار لوگ ساحل پر لیٹے غسل آتشیں فرمارہے تھے۔کچھ سمندر میں تیر رہے تھے۔تیز رفتار کشتیاں ہوا اور سطح سمندر کے بیچ پرواز کرتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔بڑا دلکش منظر تھا۔پھر نیلے پانیوں والے اس ساحل کے ساتھ ہم بہت دور تک چلے گئے۔ہالی وڈ کی خوبصورت پہاڑیوں کے بھی کئی چکر کاٹے۔دوسرے دن ہم نے ہالی وڈ کے مرکز میں واقع اس مشہور فٹ پاتھ پر بھی چہل قدمی کی جسے اسٹارواک کہا جاتا ہے۔اس فٹ پاتھ پر کئی مشہور فلمی ہستیوں کے ناموں سے منسوب ٹائلیں (تختیاں) لگی ہوئی ہیں جن پر ان کے نام ان کے دستخط کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔بعض جگہوں پر تو اُن کے ہاتھوں اور قدموں کے نشان بھی محفوظ ہیں۔فٹ پاتھ پر لوگ اس طرح چلتے ہیں جیسے اپنے محبوب فلمی ستاروں کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کررہے ہوں۔غرض ڈاکٹر سمیع اور ان کی بیگم کے ہمراہ ہم نے اور حسن چشتی نے لاس اینجلس کی جی بھر کے سیر کی۔ڈاکٹر سمیع ایک کامیاب ڈاکٹر ہونے کے علاوہ سماجی، تہذیبی اور دینی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔امریکن فیڈریشن آف انڈین مسلمس کے اہم کارکنوں میں سے ہیں۔ہندوستان کے کئی اہم سیاسی قائدین جیسے وی۔پی۔سنگھ، اندر کمار گجرال، رام ولاس پاسوان وغیرہ کے علاوہ ہندوستانی آرٹ اور کلچر سے وابستہ کئی نامور ہستیوں سے ان کے گہرے مراسم ہیں۔مگر ادب بالخصوص اردو ادب سے انھیں گہری دلچسپی ہے۔

یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ لاس اینجلس کی آخری رات بھی ہم نے ایک ایسے حیدرآبادی

خاندان کے ساتھ گذاری جہاں ہمیں پھر سے اپنے 'فیملی مزاح نگار' ہونے کا یقین ہوگیا۔ ہمارے دوست اکبر علی سے پورے اڑتیس برس بعد ملاقات ہوئی۔ یہ ۱۹۶۲ء میں انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد امریکہ آ گئے تھے۔ ان کی اہلیہ بھی ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتی ہیں اور ہمارے کالموں کے کئی تراشے ان کے پاس محفوظ ہیں۔ دونوں میاں بیوی لاس اینجلس کی حیدرآباد دکن ایسوسی ایشن کی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اکبر علی عین اُس وقت حیدرآباد سے چلے گئے تھے جب ہم نے مزاح نگاری بھی شروع نہیں کی تھی لیکن اس کے باوجود ہماری کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جو ان کے پاس موجود نہ ہو بلکہ ہر کتاب میں انھوں نے کچھ شخصی نشانات بھی لگا رکھے ہیں۔ اکبر علی امریکہ کے ایک نہایت حساّس ادارے میں اہم عہدہ پر فائز ہیں جس کی وجہ سے ان کا ہندوستان آنا جانا کم ہی ہوتا ہے۔ بچے سب اپنے پیروں پر کھڑے ہو چکے ہیں اور یہ اپنے عالیشان مکان میں اپنے چار دہے پرانے ماضی کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ اکبر علی نے ہمیں اور حسن چشتی کو اڑتیس برس پُرانی ایک تصویر بھی دکھائی۔ یہ تصویر اُس مخصوص وداعی محفل موسیقی سے متعلق ہے جو ان کے اعزاز میں ان کے قریبی دوستوں نے ترتیب دی تھی۔ اس محفل میں حیدرآباد کی ایک خوش جمال اور پری پیکر گلوکارہ نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہمیں بھی بے ساختہ اس گلوکارہ کی یاد آ گئی۔ اس زمانہ میں ہمیں ریس کھیلنے کا شوق تھا اور یہ گلوکارہ بھی کبھی کبھی ریس کھیلنے آ جاتی تھی۔ ہمارا اصول یہ تھا کہ جس دن بھی یہ گلوکارہ ریس کورس آتی تھی تو ہم اُس دن ریس نہیں کھیلتے تھے کیونکہ ہمیں گمان سا ہو جاتا تھا کہ اُسے دیکھ کر نہ صرف جاکی ٹھیک ڈھنگ سے اپنے گھوڑے نہیں بھگاتے بلکہ خود گھوڑے بھی دوڑ میں ڈھنگ سے نہیں بھاگتے۔ یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ کس کس کو یاد کریں اور کتنا یاد کریں۔ گلوکارہ اب نہ جانے کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ تاہم وقت کا سرکش گھوڑا ہے کہ سرپٹ دوڑا چلا جا رہا ہے۔

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

("سیاست" ۲۰ راگست ۲۰۰۰ء)

☆☆

امریکی کانگریس کی عمارت میں نمازِ جمعہ

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہم بڑے دیندار آدمی ہیں، چنانچہ پچھلے ساٹھ برسوں میں آج تک عیدین کی ہماری کوئی نماز قضاء نہیں ہوئی۔ کئی برس پہلے کی بات ہے کہ ہم ٹوکیو میں تھے تو عیدالفطر آگئی اور ہم نے ٹوکیو گرین ہوٹل کی چھت پر چڑھ کر بذاتِ خود چاند کو دیکھنے کی کوشش کی تھی تاکہ رویت ہلال جیسے نازک معاملہ کو جاپان کے غیر مستند علماء اور مشائخ کے صوابدید پر چھوڑا نہ جائے۔ بعد میں کسی نے بتایا کہ جاپان میں رویت ہلال والے معاملے کو حل کرنے کے لئے ہمارے ہاں کی طرح علماء اور مشائخ کو زحمت نہیں دی جاتی بلکہ اس سلسلے میں کوبے کے امام صاحب اکیلے ایسے فرد ہیں جنھیں مستند سمجھا جاتا ہے۔ وہ کہہ دیں کہ چاند نکل گیا تو سمجھو کہ نکل گیا۔ ہمیں یہ بات اچھی لگی کہ ایک چاند کے پیچھے ایک ہی عالم کو لگایا جائے، یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ بے چارے ایک چاند پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں علماء و مشائخ کو چھوڑ دیا جائے۔ فتحپوری مسجد کے امام صاحب کچھ کہہ رہے ہیں، جامع مسجد کے امام صاحب کا بیان کچھ اور ہے، حیدرآباد کی رویت ہلال کمیٹی کچھ کہہ رہی ہے اور کالی کٹ کی جامع مسجد کے امام صاحب کوئی اور بات کہہ رہے ہیں۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ بعض اوقات تو چاند ان علماء کی کثرت کی وجہ سے گھبرا کر نہیں نکلتا، کیونکہ چاند بہرحال چاند ہے، کوئی حسینۂ عالم تو ہے نہیں کہ جسے اپنے حُسن کا جلوہ دکھانے کا شوق اور ہوکا ہو۔ ہم نے ایک بار یہ تجویز بھی رکھی تھی کہ کیوں نہ جاپان کی طرح یہاں بھی رویت ہلال کے معاملہ کو ایک عالم پر چھوڑ دیا جائے۔ بتایا گیا کہ ہمارے بیشتر علماء سال بھر تو بیکار رہتے ہیں، ان سے اگر یہ ایک دن کی مصروفیت بھی چھین لی جائے تو بے چارے سال بھر کیا کریں گے۔ چنانچہ

اسی کثرتِ کار کی وجہ سے بعض اوقات ایک ہی شہر کے دو مختلف علاقوں میں عید الفطر دو مختلف دنوں میں منائی جاتی ہے۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ رمضان کا جو چاند یہاں علماء اور مشائخ کے سواء کسی اور کو دکھائی نہیں دیتا، وہ ٹوکیو میں ہمیں بالکل صاف دکھائی دے گیا تھا۔ چنانچہ دوسرے دن ہم نے شبخو کو میں جاپان اسلامک کانگریس کی مسجد میں عید الفطر کی نماز ادا کی تھی۔ یہ پہلی نمازِ عید تھی جسے ادا کرنے کی خاطر ہم لفٹ میں سوار ہو کر گئے تھے اور جس مسجد میں گئے تھے وہ پوری طرح ایئر کنڈیشنڈ تھی۔ اس اعتبار سے یہ ہماری پہلی 'ایر کنڈیشنڈ نماز' بھی تھی۔ مسجد کے وضوء خانہ کی صفائی کا یہ عالم تھا کہ وضوء کرتے ہوئے یہ ڈر نہیں ہوا کہ کہیں وضوء کرنے کی کوشش میں ہمارا دامن کسی نئی غلاظت سے آلودہ نہ ہو جائے۔

دوسری دفعہ ایک بقر عید نے ہمیں تاشقند میں آن گھیرا اور ہم نے وسط ایشیاء اور قزاقستان کے مسلمانوں کے ادارہ دینیات کی مسجد میں نمازِ عید ادا کی۔ اگر چہ ان دنوں ازبکستان میں سوویت نظامِ حکومت رائج تھا لیکن تاشقند بہر حال صدیوں سے ایک اسلامی شہر رہا ہے۔ عید کی رونق بھی ہمیں نظر آئی۔ تاہم بقر عید کے دن یہاں سرِ عام قربانی کے جانوروں کی جو ریل پیل ہوتی ہے، وہ دکھائی نہیں دی تھی۔ سوچا کہ شاید سوویت معاشرہ میں قربانی کے جانور چپ چاپ قربان ہو جانے کو زیادہ ضروری سمجھتے ہوں، تاہم ازبکستان میں روزانہ جتنا گوشت کھایا جاتا ہے، اس کے اعتبار سے لگتا ہے کہ ازبکستان والوں کے لئے ہر روز 'روز بقر عید' ہے۔

اس تمہید کو یہاں ذرا تفصیل سے بیان کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ ہم میں شاید ایمان کی وہ حرارت موجود نہ ہو جس کی طرف علامہ اقبال اپنے ایک شعر میں اشارہ کر گئے ہیں ......

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے

من اپنا پُرانا پاپی تھا برسوں میں نمازی بن نہ سکا

پچھلے دنوں ہم امریکہ گئے تو دیکھا کہ یہاں کے مسلمانوں کا من اب ہماری طرح پاپی نہیں رہا۔ سولہ برس پہلے جب ہم امریکہ گئے تھے تو تب بھی یہاں کے اسلامک سنٹرس میں بھلے ہی عید کی نماز نہ پڑھی ہو، البتہ جمعہ وغیرہ کی نمازیں ضرور پڑھی تھیں۔ تاہم اس بار امریکہ میں ہمیں 'اسلام' جگہ جگہ نظر آیا، پہلے اتنا نظر نہیں آتا تھا۔ سولہ برس پہلے اسلام کو ڈھونڈنا پڑتا تھا، اب اسلام خود آپ کو ہر موڑ پر ڈھونڈ لیتا ہے۔ حلال گوشت کی دوکانیں بھی اب بہت بڑھ گئی ہیں، لیکن

ان سے کہیں زیادہ اسلامک سنٹرس کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ امریکہ کے چھوٹے سے چھوٹے شہر میں بھی ہمیں کوئی نہ کوئی اسلامک سنٹر ضرور دیکھنے کو ملا۔ جا بجا حجاب اوڑھی ہوئی خواتین بھی نظر آئیں، بلکہ اکثر تو موٹریں چلاتی ہوئی بھی پائی گئیں۔ مسلمان اپنے مخصوص لباس اور حلیہ میں بھی ہر جگہ نظر آئے۔ یہاں ہمارا اشارہ اُس لباس کی طرف نہیں ہے جس کے تحت آدمی چھوٹے بھائی کا پاجامہ اور بڑے بھائی کی قمیص پہن کر اچانک پکّا مسلمان بن جاتا ہے۔ سلیقہ سے تراشی ہوئی داڑھیوں کے ساتھ اپنے بیسائز کے مغربی لباس میں بھی امریکہ کے مسلمان الگ سے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ امریکہ میں اب مسلمانوں کی تعداد یہودیوں کی تعداد سے بھی زیادہ ہوگئی ہے اور ان کا شمار امریکہ کی سب سے بڑی اقلیت میں ہونے لگا ہے۔ آج ہم اصل میں یہ انکشاف کرنا چاہتے ہیں کہ اس بار ہم نے امریکی پارلیمنٹ کی تاریخی اور پرشکوہ عمارت میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ واشنگٹن کے Capitol Hill میں واقع امریکی کانگریس کی عمارت وہ تاریخی عمارت ہے جہاں برسوں سے امریکہ کی تاریخ کے اہم فیصلے کئے جاتے رہے ہیں۔ وہ جمعہ کا دن تھا اور ہم گھر میں بیٹھے کچھ لکھنے میں مصروف تھے کہ ہمارے بھائی ڈاکٹر اصغر حسین کا فون آیا۔ بولے ''دوپہر میں آپ کو امریکی کانگریس کی عمارت میں چلنا ہے، آپ باوضو رہیں، میں آپ کو پک اپ کرنے کے لئے آرہا ہوں''۔ امریکی کانگریس کی عالیشان عمارت کو بیسیوں بار باہر سے دیکھ رکھا تھا، لیکن کبھی اس کے اندر جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ تاہم اس عمارت میں باوضو جانے کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ پھر سوچا کہ امریکہ کی اس عہد ساز عمارت میں جانے کے لئے احتراماً وضو کرلیا جائے تو کیا قباحت ہے، یوں بھی باطہارت رہنا اچھی بات ہے۔ اور کچھ دیر بعد ہم اس عظیم عمارت کی کئی راہداریوں سے گزرنے کے بعد کمرہ نمبر H.C-6 کے ایک وسیع ہال میں موجود تھے، جہاں جمعہ کی نماز کا اہتمام کیا گیا تھا۔ پتہ چلا کہ ہر جمعہ کو امریکی کانگریس اور اطراف میں واقع مرکزی حکومت کے دفاتر میں کام کرنے والے مسلم ملازمین کی سہولت کے لئے یہاں نماز کا بندوبست کیا جاتا ہے۔

اصل میں اس انتظام کے محرّک عاصم غفور ہیں، جو امریکی کانگریس کے شعبہ قانون میں کارگزار ہیں۔ اگرچہ ان کی پیدائش امریکہ میں ہوئی ہے، لیکن وہ بنیادی طور پر حیدرآبادی ہیں۔ ان کے والد جو خود بھی بڑے عالم رہے ہیں برسوں پہلے حیدرآباد میں رہا کرتے تھے۔ عاصم

غفور ٹکساس کے کانگریس مین، مسٹر راڈ ریکس Rod Rigus کے مشیر قانونی ہیں۔ انھوں نے جمعہ کے دن نماز کے سلسلے میں مسلم ملازمین کو پیش آنے والی مشکلات کا ذکر جب مسٹر راڈ ریکس سے کیا تو انھوں نے کانگریس کے اسپیکر سے کہہ کر اس ہال کا بندوبست کرادیا۔ اب یہاں ہر جمعہ کو پابندی سے نماز ہوتی ہے۔ جس میں آس پاس کے دفاتر سے بھی لوگ جوق در جوق چلے آتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہال نمازیوں سے بھر گیا۔ افریقہ، یوروپ، عرب ممالک، ہندوستان، پاکستان اور مشرق بعید وغیرہ کے کئی مسلمان ہمیں یہاں نظر آئے۔ امام صاحب نے، جو نفیس سوٹ میں ملبوس تھے، انگریزی زبان میں 'ہم جنسی' کی لعنت کے بارے میں ایک بلیغ خطبہ دیا۔ اُن دنوں امریکی کانگریس میں 'ہم جنس جوڑوں' کو ازدواجی حقوق عطاء کئے جانے کے بارے میں بڑی بحث چل رہی تھی۔ یہاں کی مسجدوں میں خطبے ہمیشہ انگریزی زبان میں ہی دیئے جاتے ہیں۔ ابتداء میں تو ہمیں عجیب سا لگا، لیکن سب سے بڑا فائدہ یہ نظر آیا کہ خطبہ ہماری سمجھ میں آسانی سے آجاتا تھا۔ گویا اب انگریزی بھی اسلامی زبان بنتی جارہی ہے۔ نماز کے بعد نمازیوں کے لئے لنچ کا انتظام بھی تھا۔ عاصم غفور صاحب سے بھی لنچ کے دوران ملاقات ہوئی، نہایت خلیق، ملنسار، مستعد اور ذہین نوجوان نظر آئے۔

امریکی کانگریس کی عمارت میں داخلہ کے لئے پہلے سے اجازت لینا ضروری ہوتا ہے، لیکن ہر جمعہ کو نمازیوں کی ضروری جامہ تلاشی کے بعد انھیں اندر جانے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ یہاں کی جامہ تلاشی ہمارے یہاں کی جامہ تلاشی سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ بعض دفعہ ہمارے یہاں جامہ تلاشی کچھ اس اہتمام اور لگن سے انجام دی جاتی ہے کہ جامہ تلاشی کے بعد ہم شرم سے پانی پانی ہو جاتے ہیں، کیونکہ اس طرح کی جامہ تلاشی کا حق صرف محرم کو ہی پہنچتا ہے۔ اس پر ہمیں ایک بات یاد آگئی۔ ہمارے پاس ایک ایسا اجازت نامہ ہے جسے دکھا کر ہم کسی رسمی اجازت کے بغیر دہلی کے ہوائی اڈے کے اندر جاسکتے ہیں، تاہم جامہ تلاشی کے مرحلے سے ہمیں گزرنا پڑتا ہے۔ ایسی ہی سہولت ہمارے ایک اور دوست کو بھی حاصل ہے۔ ایک دن ہم کسی کے استقبال کے لئے ہوائی اڈہ گئے تو ہمارے مذکورہ دوست بھی وہاں موجود تھے جو بار بار ہوائی اڈہ کے باہر جارہے تھے اور پھر اندر آرہے تھے۔ ہم نے یونہی پوچھ لیا کہ قبلہ آپ یہاں کسی کو چھوڑنے آئے ہیں یا کسی کا استقبال کرنے کے لئے آئے ہیں۔ بولے ''بھیا! میں تو یہاں اصل میں اپنی

جامہ تلاشی کروانے کے لئے آتا ہوں۔ جب حفاظتی عملہ اپنے مخصوص ڈھنگ سے میری جامہ تلاشی لیتا ہے تو یقین مانو ایک عجیب سی گدگدی اور سنسنی سارے بدن میں دوڑ جاتی ہے، جو مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ اسی لئے تو بار بار اندر آتا ہوں اور باہر چلا جاتا ہوں''

بہر حال ہم برادرم عاصم غفور کے ممنون ہیں کہ ان کی اس بے لوث کوشش کی وجہ سے ہمیں امریکی کانگریس کی عمارت کو اندر سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔

(''سیاست۔'' ۲۷/اگست ۲۰۰۰ء)

ڈاکٹر عابداللہ غازی اور اقراء فاؤنڈیشن

پچھلے سال کی بات ہے، دہلی کے سنٹر فار اسلامک کلچر میں ڈاکٹر عابداللہ غازی کا ایک لیکچر مقرر تھا۔ اُن کے نام اور کام سے تو ہم پہلے ہی واقف تھے لیکن اُنھیں نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ ہی سنا تھا۔ ہم نے سوچا کہ جہاں ہم نے اتنے سارے غازی جیسے گفتار کے غازی، اخبار کے غازی، اشتہار کے غازی اور افطار کے غازی وغیرہ دیکھ رکھے ہیں وہاں ڈاکٹر عابداللہ غازی کو بھی دیکھ لیں تو کیا مضائقہ ہے۔ چنانچہ ہم نے انھیں وہیں پہلی بار دیکھا اور سنا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں ان کی تقریر اتنی سلجھی ہوئی، متوازن اور مدلّل تھی کہ کسی مسلمان عالم دین کی تقریر نہ لگتی تھی۔ ہمارے بیشتر علماء جوشِ خطابت میں اپنے ہوش گنوا بیٹھتے ہیں اور سامعین کے جذبات کو خواہ مخواہ مشتعل کر کے خود تو مطمئن ہو جاتے ہیں لیکن اپنے سننے والوں کو بے چین اور مضطرب کر کے چلے جاتے ہیں۔ عابداللہ غازی نے اپنی تقریر کے دوران میں پاسبانِ عقل کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا اور اسے اپنی تقریر کے ذریعہ تار تار نہ ہونے دیا۔ ان کی تقریر کے بعد جی چاہا کہ ان سے مل لیا جائے لیکن اُس وقت تک وہ اپنے مدّاحوں میں گھر چکے تھے۔ پچھلے دنوں ہم شکاگو گئے تو ہمارے دوست حسن چشتی نے 'دی عثمانین' کے تعاون سے ہمارے لئے ایک محفل آراستہ کر رکھی تھی جس کی صدارت ہمارے کرم فرما ہاشم علی اختر کو کرنی تھی لیکن انھیں اچانک نیویارک جانا پڑ گیا۔ معلوم ہوا کہ ان کی غیر موجودگی میں یہ فریضہ ڈاکٹر عابداللہ غازی انجام دیں گے۔ ممتاز افسانہ نگار رضیہ فصیح احمد نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔

ڈاکٹر عابداللہ غازی اُن علمائے دین میں سے ہیں جنھیں مذہب کے علاوہ ادب،

مشاعروں، آرٹ اور کلچر میں بھی بہ آسانی فٹ کیا جاسکتا ہے۔ شہ نشین پر بیٹھے بیٹھے ان سے تعارف ہوا اور اُتنی ہی باتیں ہوئیں جتنی کہ شہ نشین پر ایک مقرر کے جانے اور دوسرے مقرر کے آنے کے درمیان ہوسکتی ہیں۔ سوچا تھا کہ محفل کے بعد اُن سے ملاقات ہوگی لیکن کیا کریں اس بار ہم اپنے مدّاحوں میں گھر گئے۔ یہ مدّاح بھی عجیب ہوتے ہیں۔ دو دلوں کو ملنے ہی نہیں دیتے۔

دوسرے دن ہم نے ان کے گھر فون کیا تو پتہ چلا کہ غازی صاحب موجود نہیں ہیں۔ البتہ اُن کی اہلیہ محترمہ تسنیمہ غازی سے بات ہوئی۔ کہنے لگیں ''اگر آپ بارہ بجے کے بعد اقرا فاؤنڈیشن کے دفتر آجائیں تو ڈاکٹر صاحب بھی وہیں موجود ہونگے اور آپ اقرا فاؤنڈیشن کو بھی دیکھ لیں گے۔''

کچھ دیر بعد ہم، حسن چشتی، جلیل قادری اور ہمارے بڑے بھائی یوسف حسین شکاگو کے خوبصورت علاقہ اسکوکی میں واقع اقرا فاؤنڈیشن کے دفتر میں تھے۔ ہمیں یہ تو پتہ تھا کہ ڈاکٹر عابداللہ غازی کوئی بڑا کام کررہے ہیں لیکن اتنا بڑا کام کررہے ہیں اس کا ہمیں اندازہ نہ تھا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ یہ کام عابداللہ غازی کے سوائے کوئی اور انجام نہیں دے سکتا تھا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ڈاکٹر غازی کا تعلق ہندوستان کے ممتاز علمی گھرانے سے ہے۔ ان کے والد حامد الانصاری غازی عالمِ دین ہونے کے علاوہ 'مدینہ' بجنور کے ایڈیٹر بھی رہے۔ اردو صحافت کے لئے ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ ڈاکٹر عابداللہ غازی نے ابتدائی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی۔ بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، لندن اسکول آف اکنامکس اور ہارورڈ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز اُستاد کی حیثیت سے کیا۔ کچھ عرصہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دہلی کالج میں خدمات انجام دینے کے بعد وہ لندن، ہارورڈ، منی سوٹا کی یونیورسٹیوں اور جدہ کی شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی سے بھی وابستہ رہے۔ ان کی اہلیہ ڈاکٹر تسنیمہ غازی نے بھی علی گڑھ اور الہ آباد میں تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ لندن، ہارورڈ وغیرہ میں تعلیم حاصل کی۔ تسنیمہ غازی بچوں کی نشوونما اور ان کے تعلیمی نصاب کی تدوین و ترتیب کی ماہر ہیں۔ ڈاکٹر عابداللہ غازی اور ان کی اہلیہ نے ۱۹۶۷ء سے امریکہ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ دونوں نے اِس بات کو محسوس کیا کہ اجنبی معاشرہ میں رہنے والے مسلم طلبہ کے لئے ایسے تعلیمی مواد اور نصاب کی کمی ہے جو ان طلبہ کی ضروریات کو پورا کرسکے۔ انھوں نے ۱۹۸۳ء میں ہی اس سلسلہ میں کام شروع کردیا تھا اور نصاب کی ابتدائی صورت تشکیل پانے لگی تھی۔ بالآخر ۱۹۸۳ء میں انھوں نے 'اقرا' کے نام سے
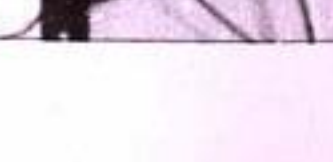
(دائیں سے) ڈاکٹر توفیق احمد انصاری، عبدالحکیم، حسن چشتی، یوسف حسین، مجتبیٰ حسین، عابداللہ غازی، رضیہ فصیح احمد

ایک تعلیمی ٹرسٹ قائم کیا جس کا مقصد منافع کمانا نہیں بلکہ خالصتاً اصلاحی تھا۔'اقرا' نے کنڈر گارٹن سے لے کر بارہویں جماعت تک اسلامی اسکولوں کے طلبہ کے لئے نصاب اور کتابیں تیار کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اس نصاب کی بنیاد اسلامی فلسفہ پر رکھی جاتی ہے اور اس کا مقصد اسلامی نقطہ نظر سے طالب علم کے روحانی اور اخلاقی کردار کی تشکیل ہے۔ اس کام میں کئی ماہرین تعلیم جٹے ہوئے ہیں اور مختلف مدارج کے لئے انھوں نے جو کتابیں تیار کی ہیں وہ بے مثال ہیں۔ اس نصاب کی خوبی یہ ہے کہ ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے طالب علم عالمِ دین بن جاتا ہے۔ امریکہ کے بیشتر اسلامی اسکولوں کے نصاب میں 'اقرا' کی تیار کردہ کتابیں ہی شامل ہیں۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ جہاں مسلمان اپنے مذہب کے تعلق سے نہایت جذباتی واقع ہوا ہے وہیں یہ بھی سچ ہے کہ وہ اپنے ہی مذہب کے بارے میں مناسب اور ضروری معلومات نہیں رکھتا۔ دوسری طرف سیکولر تعلیم اور مذہبی تعلیم کے درمیان صدیوں سے ایک کش مکش سی جاری ہے جس کے باعث مسلمانوں کا تعلیمی نظام بھی دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دار العلوم دیو بند اس کی دو مثالیں ہیں۔ 'اقرا' نے نہایت غور وخوض کے بعد مسلمانوں کی تعلیم کے ان دونوں دھاروں کے درمیان ایک خوبصورت امتزاج اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔'اقرا' نے اس پس منظر کے ساتھ اب تک سو سے زائد کتابیں تیار کی ہیں۔ ان کتابوں کی تیاری میں اس بات کا بطور خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ کسی مذہب یا فرقہ کی دل آزاری نہ ہونے پائے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اقراء کی تیار کردہ کتابیں نہ صرف امریکہ بلکہ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، فجی، گیانا، ہندوستان، ملیشیا، سنگاپور، ہانگ کانگ وغیرہ کے اسلامی اسکولوں میں لگائی گئی ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انگریزی میں اسلام کے بارے میں بیشتر کتابیں غیر مسلم یونیورسٹیوں اور اداروں کی جانب سے شائع کی گئی ہیں۔ خود مسلم اسکالروں اور اداروں نے اس سلسلہ میں کوئی قابل لحاظ کام نہیں کیا ہے۔ اقرا فاؤنڈیشن نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کی تاریخ اور ثقافت کا جائزہ لینے کی خاطر ایک پراجکٹ شروع کرنے کا منصوبہ بھی بنایا ہے۔ جنوبی ایشیا میں تین بڑے اسلامی ممالک بنگلہ دیش، پاکستان اور جزائر مالدیپ ہیں جن میں ۳۰۰ ملین مسلمان رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں ۲۰۰ ملین مسلمان آباد ہیں۔ عابداللہ غازی چونکہ خود ہندوستانی نژاد ہیں اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے انھیں خصوصی دلچسپی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ

امریکہ اور ہندوستان دو ایسے ممالک ہیں جہاں دستوری طور پر اقلیتوں کو مذہبی اور تعلیمی حقوق حاصل ہیں۔ مسلمانوں کو اس دستوری حق سے پورا استفادہ کرنا چاہیئے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمان نہ صرف اپنے مذہب کو اچھی طرح سمجھیں بلکہ دوسرے مذاہب کا بھی احترام کریں۔

دیکھا جائے تو اقرا فاؤنڈیشن نے اجنبی معاشروں میں اسلام کو صحیح ڈھنگ سے پیش کرنے، اسلامی شخصیتوں کا تعارف کرانے، مسلمانوں کی تاریخ اور ثقافت کا ایک مبسوط جائزہ پیش کرنے کا بیڑہ اُٹھایا ہے۔ یہ مواد نہ صرف مسلمانوں کے ذہن اور کردار کی تشکیل کرے گا بلکہ غیر مسلم اصحاب کو بھی اسلام کو سمجھنے کا موقع فراہم کرے گا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ 'اقرا' نے جو کتابیں شائع کی ہیں وہ نہایت دیدہ زیب ہیں اور طباعت واشاعت کے سارے عصری تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔ اس وقت اقرا فاؤنڈیشن کا سالانہ بجٹ دو ملین ڈالر ہے اور اس کی جائیداد کی مالیت بھی دو ملین ڈالر سے کم نہیں۔ ہر سال کتابوں کی فروخت سے انھیں ایک ملین ڈالر حاصل ہوتے ہیں۔ اگر چہ اقرا فاؤنڈیشن کے صدر دفتر میں کام کرنے والے ملازمین کی تعداد ۲۸ ہے لیکن سینکڑوں ریسرچ اسکالرز اور اہل علم ان کی کتابوں کی تیاری اور ان کے مختلف پراجکٹس میں سرگرم عمل ہیں۔ عابد اللہ غازی کے ہمراہ ہمیں تین چار گھنٹوں تک ان کے دفتر کو تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا۔ بعد میں انھوں نے ایک مصری ریستوران میں لنچ کا اہتمام کیا جہاں انھوں نے اقرا فاؤنڈیشن کی بات بالکل نہیں کی۔ البتہ اردو شعر وادب کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ خود بھی بہت اچھے شاعر اور نثر نگار ہیں۔ اردو ادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ عابد اللہ غازی نے اجنبی معاشروں میں رہنے والے مسلمانوں کی آنے والی نسل کے مستقبل کو ذہن میں رکھ کر اقرا فاؤنڈیشن کے ذریعہ جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ لائق صد ستائش ہے۔ بعد میں ہم نے ڈیون میں واقع ان کے شاندار شوروم کا معائنہ بھی کیا جہاں اقرا فاؤنڈیشن کی تیار کردہ ساری کتابیں اور تعلیمی مواد فروخت کے لئے رکھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر عابد اللہ غازی کے ساتھ 'اقرا فاؤنڈیشن' میں ہمارا جو دن گذرا وہ ایک یادگار دن تھا۔

(''سیاست''، ۳ر ستمبر ۲۰۰۰ء)

☆☆
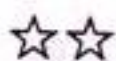
امریکہ کے ماضی میں ہمارے ماضی کی ملاوٹ

جیسا کہ ہم نے آپ کو بتایا تھا امریکہ اگر چہ بہت بڑا ملک ہے لیکن اس کا ماضی بہت چھوٹا ہے، بالکل شتر مرغ کے سر کی طرح جو شتر مرغ کی مجموعی جسامت کے اعتبار سے اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر دکھائی دیتا ہے۔ امریکہ کے ماضی بعید کا حال بھی تفصیل سے کم ہی لوگوں کو معلوم ہے۔ چار پانچ سو برسوں کے ماضی پر اتراتا پھرتا ہے۔ غالباً ماضی کی اسی قلت کی وجہ سے امریکہ بڑی ہوشیاری سے اپنے ماضی میں دوسروں کے ماضی کو بھی شامل کر لیتا ہے۔ حد ہوگئی کہ اس نے ہمارے شخصی ماضی کو بھی نہیں چھوڑا۔ چنانچہ ہمیں وہاں اپنا بھولا بسرا ماضی بھی نظر آیا۔ یہاں ہم اپنے اُس شخصی ماضی بعید کی بات کر رہے ہیں جو پچاس ساٹھ برس پرانا ہو چکا ہے۔ امریکہ جانے کے بعد ہی ہمیں احساس ہوا کہ ہمارے بچپن اور نوجوانی کے زمانہ کے بیشتر دوست اب ہندوستان میں باقی نہیں رہے۔ سب کے سب یا تو ملک سے باہر چلے گئے یا پھر اس دنیا کو ہی چھوڑ کر چلے گئے۔

شکاگو میں ہمارے ایک ایسے دوست رہتے ہیں جو پانچویں یا چھٹی جماعت میں ہمارے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ وہ ہمارے اس ماضی سے واقف ہیں جب ریاضی کے گھنٹے میں ہم اسکول سے بھاگ کر برابر میں واقع آموں کے باغ میں چلے جاتے تھے اور باغ کے مالی کی نظر بچا کر آموں کو توڑا کرتے تھے۔ ایک بار مالی نے ہمیں پکڑ لیا تھا اور سزا کے طور پر ہماری ریاضی کی کتاب ضبط کر لی تھی۔ آج جو ہم ریاضی میں کمزور ہیں تو اس کی بنیاد اسی تاریخی واقعہ پر رکھی ہوئی ہے۔ اگر مالی نے یہ کتاب ضبط نہ کی ہوتی تو ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمارا شمار ماہرین ریاضی

میں ہوتا لیکن اتنا تو ہوتا کہ اگر کبھی ۶۳ روپیوں میں ۶۴ روپیوں کو جمع کرنے کا مرحلہ درپیش ہوتو ہم خود ہی جمع کے قاعدے کا استعمال کر کے جواب حاصل کر لیتے ۔اس کے لئے اپنے نواسے کی خدمات سے تو استفادہ نہ کرتے ۔چونکہ ہمارے یہ دوست ریاضی میں ہماری کمزوری کا بنیادی سبب جانتے ہیں لہٰذا شکاگو میں جب بھی ملتے پچاس ساٹھ برس پُرانے ہمارے اس ماضی کو نہ صرف کریدنے کی کوشش کرتے بلکہ دیگر احباب کو بھی اس ماضی سے واقف کرانے کی سعی فرماتے۔ ہم نے اُنھیں کسی طرح روکا کہ بھیّا ہماری زندگی کے آخری حصہ میں اب اس پُرانے راز کو دیگر احباب پر منکشف کرنے کا کیا فائدہ ۔یوں بھی ہماری حیثیت اب دوسری ہے۔ہم یہاں باغوں میں آم چرانے کے لئے نہیں آئے ہیں بلکہ اردو زبان وادب کی خدمت وغیرہ کرنے کے ارادے سے آئے ہیں۔جب امریکہ کے اتنے بڑے ماضی پر راز کے پردے پڑے ہوئے ہیں تو ہمارے اس چھوٹے سے ماضی کو بھی راز ہی رہنے دو بلکہ ہمارے شخصی ماضی کو بھی امریکہ کا ہی ماضی سمجھو۔ ہمارے یہ دوست چونکہ شریف آدمی ہیں اس لئے پرانی دوستی کے ناتے اس راز کو اپنے سینہ میں دفن رکھا ورنہ لوگ ہماری مزاح نگاری کے بارے میں نہ جانے کیا رائے قائم کرتے۔تاہم مشکل یہ ہوئی کہ بعد میں ہم امریکہ کے جس شہر میں بھی گئے وہاں کچھ ایسے احباب ضرور مل گئے جو ہمارے ماضی بعید کے کسی نہ کسی ایسے واقعہ یا سانحہ سے واقف تھے جسے ہم آج کے بدلے ہوئے حالات میں بر بنائے مصلحت دنیا سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔واشنگٹن کی ایک ادبی محفل میں ہم اپنے چہرے پر گہری متانت، بُردباری، سنجیدگی بلکہ بزرگی تک کے آثار طاری کر کے پہنچے اور محفل کے صدر کے برابر مہمان خصوصی بن کر بیٹھے تو جناب صدر نے چپکے سے ہمیں پوچھا'' حضور! آپ نے مجھے پہچانا ؟۔'' ہم نے معذوری ظاہر کی تو بولے'' نصف صدی پہلے جب آپ گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج میں پڑھتے تھے تو میں آپ سے ایک سال جونیئر تھا۔ان دنوں تو کالج میں آپ گلوکار اور اداکار کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ مجھے تو وہ گانے بھی یاد ہیں جنھیں آپ اکثر گایا کرتے تھے۔آپ نے گلوکاری چھوڑ کر مزاح نگاری کیوں شروع کردی۔اگر آپ گانے ہی گاتے رہتے تو اردو مزاح نگاری پر احسان عظیم ہوتا اور ہاں گلبرگہ کالج کے ہاسٹل میں ڈراموں کی ریہرسل کے دوران آپ اور آپ کے کچھ احباب پڑوسی کے گھر سے بھٹک کر آجانے والی مرغیوں کو اکثر پکڑ کر کھا جاتے تھے۔راتوں کو بھی آپ اکثر ہاسٹل سے بھاگ جاتے تھے اور اسٹیشن

بازار کی ہوٹلوں میں دیر گئے تک ریڈیو سیلون سے گانے سنا کرتے تھے۔ وہ بھی کیا دن تھے۔ اگر مجھے اس محفل میں آپ کا تعارف کرانے کے لئے کہا جائے تو یہ بڑا دلچسپ تعارف ہوگا"۔ ہم نے بیٹھے بیٹھے ان کے آگے ہاتھ جوڑے کہ بھیا نوجوانی میں پڑوسی کی مرغیوں کو کھا جانے اور ریڈیو سیلون سے گانے سننے کی بات سے ہماری آج کی مزاح نگاری کا کیا تعلق ہے۔ ہم یہاں مزاح نگار کی حیثیت سے آئے ہیں۔ مرغی پکڑنے والے کی حیثیت سے نہیں۔ وقت جو گذر گیا وہ گذر گیا۔ اب ماضی کی بجھی ہوئی راکھ کو کُریدنے کا کیا فائدہ۔ وہ تو اچھا ہوا کہ صاحب صدر بھی شریف آدمی ہی نکلے اور ہمارے ماضی کو راز ہی رہنے دیا۔

ایک اور محفل کے سامعین میں ہمیں ایک ایسے صاحب نظر آ گئے جن کی شکل جانی پہچانی لگتی تھی۔ ڈائس پر بیٹھے بیٹھے ہم نے ان کے موجودہ حلیہ کی لوڈ شیڈنگ Load Shedding کی تو اس میں سے ہمارے وہ پرانے دوست نکل آئے جو لگ بھگ ۴۵ برس پہلے آرٹس کالج میں ہمارے ہم جماعت تھے اور ہم سے محض اس لئے کھنچے کھنچے اور خفا خفا سے رہتے تھے کہ ہم بھی اس طالبہ کے حُسن کے اسیر تھے جس کے یہ بھی تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی نہ جانے کیوں اپنے اندر ہمارے تعلق سے رقابت کی آگ کو جلا لیتے تھے اور بڑی دیر تک بھڑکتے رہتے تھے۔ اسی رقابت کے جذبہ کے تحت انھوں نے کالج کے الیکشن میں ہمیں ووٹ نہیں دیا تھا جس کی وجہ سے ہم بھاری اکثریت سے منتخب ہو گئے تھے۔ کوئی موقع ایسا نہیں گنواتے تھے جس میں وہ ہمیں نیچا نہ دکھا سکیں۔ اور دلچسپ بات یہ تھی کہ جس شخصیت کی خاطر ہم دونوں میں رقابت کا سلسلہ جاری رہتا تھا خود اُسے پتہ نہیں تھا کہ ہم دونوں اُس کے حُسنِ جہاں سوز کے اسیر ہیں۔ ایسے بے لوث عشق اور ایسی بے لوث رقابت کی مثالیں کہاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ تین میں نہ تیرہ میں والی ایک ایسی عجیب وغریب رقابت تھی جو بلا وجہ اور بے سبب ہم دونوں کے درمیان جاری تھی۔ ہم نے محفل میں جب اپنے اس پُرانے بے لوث رقیب کو پہچان لیا تو نہ جانے کیوں ہمارے موجودہ تھکے ماندے اور از کار رفتہ جذبات میں پھر سے اتھل پتھل ہونے لگی۔ اس پر ہم نے اپنے پاگل دل کو سمجھایا کہ میاں جس کی خاطر تم رقابت کی آگ میں جلا کرتے تھے وہ بیچاری تو کب کی اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔ اس کا بے مثال حُسن اب مٹی مٹی ہو چکا ہے۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔ محفل کے بعد ہمیں یہ دوست ملے ضرور لیکن حسب معمول کھنچے کھنچے سے رہے۔ اس حرکت سے

ہم نے اندازہ لگایا کہ برسوں سے امریکہ میں رہنے کی وجہ سے شاید موصوف کو اب تک اس حُسنِ کرشمہ ساز کے لالہ وگل میں تبدیل ہو جانے کی اطلاع نہیں ملی ہے۔ دوسری طرف ہم بھی اُنھیں اس سانحے کی اطلاع دے کر دُکھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے سوچا کہ موصوف کو کیوں اس گمنام جذبۂ رقابت سے محروم کریں جسے وہ بلا وجہ برسوں سے پال پوس کر بڑا اور خود کو چھوٹا کرتے آئے ہیں۔

غرض امریکہ میں ہمیں ایسے کئی دوست ملے جو ہمارے ماضی بعید کے چشم دید گواہ رہے ہیں۔ شکاگو میں ہمیں ایک اور دوست ملے جن سے ہر اتوار کو حیدرآباد کے ملک پیٹ ریس کورس پر پابندی سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ انھیں اب تک اُن گھوڑوں کے نام زبانی یاد ہیں جن پر بازی لگا کر وہ بڑے اہتمام سے ریس ہارتے جاتے تھے۔ انھوں نے ہی ہمیں برسوں پرانی اُس ریس کی یاد دلائی جس میں ہم دونوں نے مل کر ایک گھوڑے پر مشترکہ بازی لگائی تھی۔ نتیجہ میں ریس کورس سے باہر آنے کے بعد ہم دونوں کے پاس گھر واپس جانے کے کرایہ کے پیسے تک نہیں تھے۔ ہم نے پوچھا ''کیا اب بھی ریس کھیلتے ہو؟'' بولے ''یار! کیسی ریس۔ کہاں کی ریس۔ یہاں کی مصروف زندگی کی دوڑ میں خود اس طرح شامل ہو گیا ہوں کہ پچھلے تیس برسوں میں کسی گھوڑے کی شکل نہیں دیکھی۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ گھوڑے کی دُم سیدھی ہوتی ہے یا ٹیڑھی''۔

ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ ہمارے ماضی بعید کو جاننے والے بہت سارے دوست امریکہ میں آباد ہیں اور ہمارا ماضی بھی اب امریکہ کے ماضی کا حصہ بنتا جارہا ہے۔ مانا کہ ہمارے یہ دوست خود اپنے ماضی کو بھلانے کی خاطر امریکہ میں آباد ہو گئے ہیں لیکن ہماری دست بستہ گذارش ہے کہ وہ کم از کم ہمارے ماضی کو ضرور یاد رکھیں کیونکہ اس کے جاننے والے اب وطن عزیز میں بھی معدوم ہو چکے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہی تو ہمارا اصلی ماضی ہے۔

(''سیاست''۱۰ر ستمبر ۲۰۰۰ء)

☆☆

کچھ یادیں امریکہ کی

مئی کے پہلے ہفتہ میں ہم امریکہ میں موٹر سازی کے سب سے بڑے شہر ڈیٹرائٹ میں تھے۔موسم بہار کی آمد آمد تھی۔امریکہ کے موسم بہار کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ آپ کو واضح طور پر دکھائی بھی دیتا ہے۔ہمارے ملک کے موسم بہار کی طرح نہیں کہ اس کے چلے جانے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ موسم بہار نہ صرف آیا تھا بلکہ جا بھی چکا ہے۔امریکی موسم بہار اطراف واکناف کے ماحول پر ہی نہیں چھا جاتا بلکہ آدمی کی ذات میں بھی اُتر جاتا ہے۔ڈیٹرائٹ میں ہم اپنے بھائی ڈاکٹر خورشید حسین کے گھر مقیم تھے۔خورشید حسین سائینٹسٹ Scientist رہ چکے ہیں اور اب وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد اپنا سارا وقت ڈیٹرائیٹ کے اسلامک سنٹر کے کاموں میں صرف کرتے ہیں۔پانچ وقت کی نمازیں تو پڑھتے ہی ہیں (وہ بھی لمبی لمبی رکعتوں کے ساتھ) اس کے بعد جو وقت بچتا ہے اسے بھی اسلامک سنٹر کے کاموں میں لگا دیتے ہیں۔اگرچہ ہم ان کے گھر میں مقیم تھے مگر وہ خود زیادہ تر 'اللہ کے گھر' میں رہتے تھے۔چنانچہ ان سے ملنے کی خاطر ہمیں اسلامک سنٹر ہی جانا پڑتا تھا جہاں وہ کاموں میں کچھ اتنا مصروف رہتے تھے کہ کبھی کبھی تو ہمیں انھیں بتانا پڑتا تھا کہ ہم اُن کے بھائی ہیں اور اُن سے ملنے کے لئے ہندوستان سے آئے ہیں۔ایک بار ہم اسلامک سنٹر پہنچے تو انھوں نے بے خیالی میں ہمیں وہ شخص سمجھ لیا جو اسلام قبول کرنے کے ارادے سے اُن کے پاس آنے والا تھا۔ہم اتفاق سے وہاں پہنچے تو خورشید حسین نے ہمیں کلمہ پڑھوانے کی کوشش کی۔بالآخر ہمیں بتانا پڑا کہ ہم پہلے ہی سے کلمہ گو ہیں اور اوپر سے آپ کے بھائی بھی ہیں۔اپنی بے خیالی پر نادم

تو ہوئے لیکن اپنی خفت مٹانے کی خاطر بولے ''تم جیسے مسلمانوں کو اگر دوبارہ مسلمان بنا دیا جائے تو کیا قباحت ہے''۔ اسلامک سنٹر کے سب سے کارکرد عہدیدار ہونے کی وجہ سے اسلامک سنٹر کی چابیاں بھی ان ہی کے پاس رہتی ہیں۔ ایک رات ہم اپنے کمرہ کی کھڑکی سے ڈیٹرائٹ پر اُترنے والی بہار کے حسین منظر کو دیکھنے لگے تو بس دیکھتے ہی رہ گئے اور دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں۔ رات کے کوئی دو بجے ہونگے کہ اچانک سیکوریٹی ایجنسی کا فون آیا ''اسلامک سنٹر کی عمارت سے سگنل آ رہے ہیں۔ جا کر تو دیکھئے کہ وہاں کیا گڑبڑ ہو رہی ہے''۔ اس اطلاع کو پا کر ہمیں فطری طور پر تشویش بھی ہوئی۔ نہ جانے کیوں ہمارے ذہن میں اچانک بابری مسجد کا خیال آ گیا۔ سوچا کہ کیا امریکہ میں بھی............! خیر امریکہ میں سیکوریٹی کا عام طور پر یہ انتظام ہوتا ہے کہ اگر کسی عمارت میں کوئی موجود نہ ہو تو وہاں کچھ ایسے آلات نصب کئے جاتے ہیں کہ کسی کے عمارت کے اندر غیر مجاز طور پر داخل ہونے کی صورت میں سیکوریٹی کے دفتر میں سگنل آنے لگتے ہیں اور سیکوریٹی والے متعلقہ اصحاب کو اس خطرہ کی اطلاع دیدیتے ہیں۔ ہم سوچنے لگے کہ اسلامک سنٹر کی مسجد میں بھلا اتنی رات کو کون داخل ہوا ہوگا (بعض لوگ تو دن میں بھی نہیں جاتے) یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کوئی صاحب وہاں اتنی رات کو چوری چھپے نماز پڑھنے کے ارادے سے داخل ہوئے ہوں۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔ خورشید حسین دن بھر کی عبادتوں اور اسلامک سنٹر کے کاموں کی وجہ سے تھک ہار کر گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ ہم نے جا کر انھیں جگایا اور اطلاع دی کہ سیکوریٹی والوں کی طرف سے فون آیا ہے کہ اسلامک سنٹر سے سگنل آ رہے ہیں۔ تم جا کر دیکھو تو سہی کہ کہیں کوئی چوری چھپے وہاں نماز تو نہیں پڑھ رہا ہے۔ وہ گہری نیند میں تھے۔ کروٹ بدلتے ہوئے بولے 'اسلامک سنٹر' اللہ کا گھر ہے۔ وہ اپنے گھر کی آپ حفاظت کرے گا۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ پھر سو گئے اور ہم اپنے کمرہ میں واپس چلے گئے۔ اگر چہ خورشید حسین کا جواب نہایت معقول تھا لیکن پھر بھی ہمارے دل میں کئی طرح کے خدشات پیدا ہوتے رہے۔ ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہیں گذرا تھا کہ پھر سیکوریٹی والوں کا فون آیا ''حضرت اب تو عمارت کے اندر سے کچھ زیادہ ہی سگنل آنے لگے ہیں۔ ذرا جا کر تو دیکھئے''۔ اس اطلاع کو پا کر ہمارا جوشِ ایمانی بھڑک اٹھا۔ اب کی بار ہم نے خورشید حسین کو زبردستی جگایا کہ ایک گھنٹہ پہلے بھی تمہیں بتا چکا ہوں کہ اسلامک سنٹر کے بارے میں سیکوریٹی والوں کے فون آتے جا رہے ہیں۔ اور تم ہو کہ سوتے چلے جا رہے ہو۔

مسلمانوں میں بیداری کی لہر آخر کب جاگے گی۔ ہمارے سخت لہجہ پر وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنی فرلانگ بھر لمبی گاڑی نکالی اور رات کے کپڑوں میں ہی اسلامک سنٹر کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئے تو ہم نے پوچھا'' کیا اسلامک سنٹر میں چور داخل ہو گئے تھے؟'' بے نیازی سے بولے'' کیسا چور اور کہاں کا چور۔ کل رات اسلامک سنٹر کے کمیونٹی ہال میں 'بسم اللہ خوانی' کی ایک تقریب منعقد ہوئی تھی جس میں غبارے (Baloons) بھی لٹکا دیئے گئے تھے۔ تقریب کے بعد منتظمین ان غباروں کو ہال میں یونہی چھوڑ کر چلے گئے۔ بعد میں یہ غبارے ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہال میں ادھر اُدھر اڑنے لگے اور سیکوریٹی والوں کے پاس ان کی نقل و حرکت کے سگنل آنے لگے۔ اب میں ان غباروں کو پھوڑ کر آ رہا ہوں تو سگنل آنے بند ہو گئے''۔ یہ کہہ کر خورشید حسین تو اپنی خوابگاہ میں چلے گئے اور ہمیں اچانک آج کے مسلمانوں اور غباروں کے درمیان ایک عجیب سی مماثلت نظر آ گئی۔ ہماری حالت بھی جذبات سے بھرے ہوئے غباروں جیسی ہے۔ جذبات کی رو میں بڑی آن بان اور شان کے ساتھ اِدھر اُدھر اُڑتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن جہاں کسی نے ہلکے سے سوئی چبھو دی وہیں سکڑ کر زمین پر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

امریکہ کی ایک دوسری یاد ہمارے پرانے کرم فرما ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی سے نہ ملنے کے واقعہ سے متعلق ہے۔ اگرچہ امریکہ میں ہمارے قیام کے دوران میں ہر جگہ سے اُن کے فون آتے رہے۔ وہ منی سوٹا میں سکونت پذیر ہیں اور ہم امریکہ میں جہاں بھی گئے ہمارے اور منی سوٹا کے درمیان کم از کم ڈیڑھ دو ہزار کیلو میٹر کا فاصلہ ضرور برقرار رہا۔ جون کے تیسرے ہفتہ میں پتہ چلا کہ وہ کسی تقریب کے سلسلہ میں واشنگٹن آ رہے ہیں۔ اتفاق سے ان دنوں ہمارا بھی واشنگٹن جانے کا پروگرام بن گیا۔ ہم نے سوچا کہ اب ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی سے ملنے کا ایک سنہرا موقعہ ہاتھ آیا ہے۔ دل خوشی سے اُچھلنے لگا۔ واشنگٹن بھی عجیب شہر ہے۔ ڈسٹرکٹ آف کولمبیا والا واشنگٹن جو امریکہ کا اصل صدر مقام ہے چھوٹے سے علاقہ پر پھیلا ہوا ہے لیکن یہ چاروں طرف سے میری لینڈ اور ورجینیا کی ریاستوں سے گھرا ہوا ہے۔ واشنگٹن ڈی سی میں کام کرنے والے زیادہ تر لوگ میری لینڈ اور ورجینیا میں ہی رہتے ہیں۔ ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی نے بتایا تھا کہ وہ ورجینیا میں اپنے داماد کے گھر مقیم رہیں گے۔ اور ہم میری لینڈ میں مقیم تھے جن کے بیچ بڑی مشکل سے چالیس پچاس کیلو میٹر کا فاصلہ تھا۔ اُس دن ہمارے پرانے دوست احمد اللہ قادری نے (جو کسی زمانہ میں

عثمانیہ یونیورسٹی کے حلقوں میں اپنی شرارتوں کی وجہ سے بڑے اُستاد کے نام سے جانے جاتے تھے) ہماری خاطر چھٹی لے رکھی تھی ۔ ان سے طے تھا کہ وہ صبح صبح ہمارے پاس آجائیں گے اور ہم دونوں وہاں سے ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کے ہاں جائیں گے ۔ ڈاکٹر صدیقی نے کہہ رکھا تھا کہ ہم اُن کے پتے کے آس پاس پہنچ کر کہیں سے فون کردیں تو وہ بھی شاہراہ پر آجائیں گے اور ہمارے منتظر رہیں گے ۔ ہم ٹھیک وقت پر نکلے ۔ اُن کے بتائے ہوئے پتے کے آس پاس پہنچ کر فون کیا تو پتہ چلا کہ ڈاکٹر صدیقی کا فون خراب ہوگیا ہے ۔ امریکہ میں فون کبھی خراب نہیں ہوتے لیکن اسے ہماری بدقسمتی نہ کہیں تو اور کیا کہیں ۔ احمد اللہ قادری نے ہر گیس اسٹیشن پر جاکر سولومن ڈرائیو Solomon Drive اور کنگ ڈیوڈ ایونیو کے محل وقوع کے بارے میں جاننے کی کوشش کی لیکن ہر جگہ مایوسی ہوئی ۔ کئی مرتبہ فون کیا لیکن ہر بار یہی معلوم ہوا کہ فون اب بھی خراب ہے ۔ غرض ڈھائی گھنٹوں تک ان کا پتہ تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے ۔ دوسری طرف ہمارے خضرِ راہ احمد اللہ قادری کے بارے میں بھی ہمیں یہ اندازہ ہوگیا کہ موصوف برسوں سے امریکہ میں رہنے کے باوجود اب بھی حیدرآباد ہی میں رہتے ہیں ۔ تھک ہار کے احمد اللہ قادری کے گھر گئے ۔ بہت ساری باتیں ہوئیں ۔ ان کا کلام ہی نہیں مجموعہ کلام بھی سنا ۔ شکیلہ بانو بھوپالی کے بارے میں ان کی ایک نظم بھی سنی جسے انھوں نے پینتیس برس پہلے شکیلہ بانو بھوپالی کا کوئی پروگرام دیکھنے کے بعد لکھا تھا ۔ آج بھی وہ یہ نظم پڑھتے ہیں تو ان کی آنکھیں چمک اُٹھتی ہیں ۔ ان سب باتوں کے باوجود ہمارے دل میں یہ خلش سی رہ گئی کہ ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی سے اتنا قریب پہنچنے کے بعد بھی ان سے ہماری ملاقات نہ ہوسکی ۔ امریکہ نے بس اسی ایک معاملہ میں ہمیں مایوس کیا ۔ ان کے فون کی خرابی کے پسِ منظر میں ہمیں یہ ماننے میں اب بھی تامل ہوتا ہے کہ امریکہ ایک ترقی یافتہ ملک ہے ۔ اگر ترقی یافتہ ملک ہے تو اُس دن ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کا فون کیوں خراب ہوگیا تھا ۔ سولہ برس کے بعد اُن سے ملنے کا ہمیں کتنا اشتیاق تھا اس کا حال ہم کیسے بیان کریں ۔ ہم شام کو میری لینڈ واپس ہوئے تو اُن کا فون آیا ۔ بہت کوفت میں مبتلا تھے ۔ کہنے لگے امریکہ میں فون عموماً خراب نہیں ہوتے لیکن آج نہ جانے کیا ہوگیا ۔ ہونا کیا تھا اُس دن ہماری قسمت خراب ہوگئی تھی ۔ ہزاروں میل دور جاکر بھی اپنے ایک کرم فرما سے ملاقات کے نہ ہونے کی یہ خلش ہمیں ہمیشہ یاد رہے گی ۔

☆☆

(''سیاست'' ۔ ۱۲۲ اکتوبر ۲۰۰۰ء)

مجتبیٰ حسین کی چالیس سالہ مزاح نگاری کا باغ و بہار انتخاب

مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں (دو جلدوں میں)

مرتب : حسن چشتی (شکاگو)

جلد اوّل

(مضامین، سفرناموں اور کالموں کا انتخاب)

صفحات: 350 قیمت : -/250 روپے

جلد دوم

(شخصی خاکوں کا انتخاب)

صفحات : 350 قیمت : -/250 روپے

مجتبیٰ حسین کے سفرنامے

مرتب : حسن چشتی (شکاگو)

صفحات : 364 قیمت : -/250 روپے

ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 3108 وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں دہلی ۔6

امریکہ میں ملنے کا پتہ: HASAN CHISHTI, 7033, N. Kedzie # 112,
Chicago, Illinois-60645 (U.S.A)

"مجتبیٰ حسین WIT کے مردِ میدان یعنی بذلہ سنجی اور ذکاوت کا پیکر ہیں۔ میرے نزدیک WIT مزاح کا مؤثر آلہ ہے اور اس کی مثالیں مجتبیٰ حسین کے ہاں جا بجا ملتی ہیں۔"

(آل احمد سرور)

"مجتبیٰ حسین اصل میں قہقہوں اور مسکراہٹوں کے درویش ہیں اور درویش ہوتا ہی وہ شخص ہے جو اپنی پوری متاع، فراخ دلانہ دوسروں کے حوالے کر دیتا ہے اور لُٹا دیتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے ہمیں قہقہے دیئے ہیں، مسکراہٹیں دی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ زندگی کی خوبصورتی اور بدصورتی سے بھی روشناس کرایا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مجتبیٰ حسین ہندوستان میں حیدر آباد دکن کے باسی ہیں اور پاکستان میں لوگوں کے دلوں میں رہتے ہیں۔"

(میرزا ادیب)
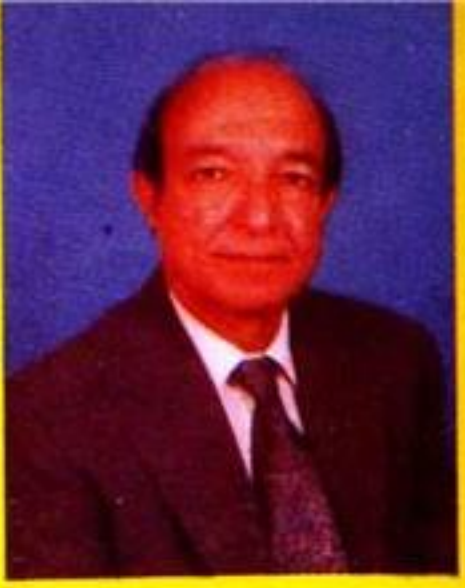
حسن چشتی

۱۵ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ سے گریجویشن کرنے کے بعد خود جامعہ عثمانیہ کے انتظامیہ سے وابستہ ہوئے جہاں ۲۸ سال تک خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۷۹ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ بعدازاں وہ سعودی عرب منتقل ہوئے جہاں سات برس تک مختلف خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۸۶ء میں امریکہ منتقل ہوگئے۔ بچپن ہی سے اُردو شعروادب سے انہیں خاصی دلچسپی رہی ہے۔ اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے کئی اخباروں اور رسالوں میں کام کیا۔ حیدرآباد دکن میں کئی ادبی، سماجی اور فلاحی اداروں سے وابستہ رہے۔ سعودی عرب میں بزمِ اُردو اور حیدرآباد دکن ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ اُن دونوں انجمنوں کے چھ برس تک صدر بھی رہے۔ شکاگو میں بھی وہ کئی انجمنوں سے وابستہ ہیں۔ ایک عرصہ تک لاس اینجلس سے شائع ہونے والے کثیرالاشاعت ہفتہ وار "پاکستان لنک" کے، جو انگریزی اور اُردو زبانوں میں شائع ہوا کرتا تھا، شکاگو میں بیوریو چیف رہے۔ وہ کئی عالمی مشاعروں میں شرکت کرچکے ہیں۔

۱۹۸۸ء میں انہوں نے دہلی میں منعقدہ عالمی مشاعرہ میں امریکہ کی نمائندگی کی تھی اور اس موقع پر انہیں "اسرارالحق مجاز عالمی ایوارڈ" پیش کیا گیا۔

۱۹۹۶ء میں انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ شکاگو نے اُنہیں نمائندۂ دکن کے اعزاز سے نوازا۔ ۱۹۹۶ء میں شہر شکاگو کی جانب سے اُنہیں سماجی خدمات کا سرکاری طور پر اعترافی ایوارڈ اور ۱۹۹۷ء میں ایلڈرس کاؤنسل آف انڈیا کی جانب سے "آرکی ٹیکٹ آف اُردو ایوارڈ" عطا کیا گیا۔ ۱۹۹۹ء میں شکاگو کی ایک نیم سرکاری سماجی تنظیم نے اُنہیں دو سال کے لئے اپنا ڈائرکٹر منتخب کیا۔ امریکن اُردو رائٹرس سوسائٹی، لاس اینجلس نے ۲۰۰۱ء میں اُنہیں LIFE-TIME ACHIEVEMENT AWARD سے نوازا۔ اس کے علاوہ اُن کی ادبی اور سماجی خدمات کے اعتراف کے طور پر کئی تنظیموں نے اُنہیں مختلف اعزازات سے سرفراز کیا ہے۔ امریکہ میں اُردو زبان وادب کے فروغ کے لئے اُن کی کوششوں کو ساری اُردو دُنیا میں بنظرِ تحسین دیکھا جاتا ہے۔

تالیفات:

☆ مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں (دو جلدوں میں)

☆ مجتبیٰ حسین کے سفرنامے

☆ ''ایسا لطیف مزاح اور ایسی شُستہ زبان اُردو میں آج شاذ ہی کسی کو نصیب ہو''

(شمس الرحمٰن فاروقی)

☆ ''مجتبیٰ حسین بلا شبہ ہمارے عہد کے بڑے طنز و مزاح نگار ہیں اور ہمارا عہد اُن کی تحریروں میں ایک منفرد انداز سے جلوہ گر ہے۔''

(مشفق خواجہ)

☆ ''مجتبیٰ حسین کے سفر ناموں کو پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے آپ پر ہنسنے کا زبردست حوصلہ رکھتے ہیں''

(خوشونت سنگھ)

☆ ''پچھلی نسلوں نے ہمارے لیے طنز و مزاح کا جو ورثہ چھوڑا تھا مجتبیٰ حسین نے اُس کو اور اُس کی خصوصیات کو نہ صرف محفوظ رکھا ہے بلکہ اُس کو زمین سے گہرائی تک اور عام آدمی کے زندہ مسئلوں سے دور تک جوڑ کر زیادہ وسیع اور بامعنیٰ بنا دیا ہے۔''

(نثار احمد فاروقی)

☆ ''مجتبیٰ حسین نے اس صدی کے آشوب کو ملائم کرنے اور قابلِ برداشت بنانے میں عہد آفریں حصّہ لیا ہے۔''

(ضمیر جعفری)

☆ ''مجتبیٰ حسین کو واقعہ نگاری اور مرقع کشی میں کمال حاصل ہے۔ اُن کا مشاہدہ جزیات بین ہے اور اس وصف کو کام میں لا کر وہ کسی واقعہ کے مضحک پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں۔ کسی واقعہ کو محسوس بنا کر پیش کرنا اور اس کردار کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دینا مجتبیٰ حسین کے فن کا خاص وصف ہے۔''

(مغنی تبسّم)

☆ ''مجتبیٰ حسین بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں لیکن وہ طنز سے بھی بے حد خوبصورت کام لیتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین طنز بھی کر رہے ہوں تو وہ تعصب یا بغض و عناد سے عاری ہوتا ہے۔ ان کے فن کا نمایاں عنصر انسانی ہمدردی ہے۔ مزاحیہ ادب کو مزاحیہ ہونے سے پہلے ادب ہونا چاہیئے۔ ہمارے اکثر مزاح نگار اس فرق کو فراموش کر جاتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی تحریریں اپنے اُسلوب، طریقۂ اظہار اور زبان و بیان کی جمال آفرینی کے باعث ادب کے بلند درجہ پر فائز ہیں۔''

(مظہر امام)

☆ ''اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ ہندوستان کے مزاحیہ ادب کی بھرپور نمائندگی کون سا شہر کرتا ہے تو بلا جھجک حیدرآباد کا نام لوں گا اور اگر یہ دریافت کیا جائے کہ حیدرآباد کی نمائندگی کون کرتا ہے تو میں بے دریغ ایک ہی نام لے سکتا ہوں اور وہ ہے مجتبیٰ حسین۔ جو خصوصیت اُنہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ اُن کی حیدرآبادیت ہے۔''

(وحید اختر)